اور انکی علمی خدمات

از

ڈاکٹر محمد صہیب

مدیر

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مرقاۃ العلوم مئو

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

اور انکی علمی خدمات

از

ڈاکٹر محمد صہیب

مدیر

مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ مرقاۃ العلوم . منو

نام کتاب : مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اور ان کی علمی خدمات

ترتیب : ڈاکٹر محمد حبیب

صفحات : ۵۲۴

سن اشاعت : ۱۴۲۸ھ م ۲۰۰۷ء

طبع اول : گیارہ سو

ناشر : المجمع العلمی - مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

قیمت :

باہتمام : مولانا رشید احمد الاعظمی

ملنے کا پتہ

مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ

مرقاۃ العلوم - پوسٹ بکس نمبر (۱)

مئوناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱ (یوپی - انڈیا)

طباعت: شیروانی آرٹ پرنٹرز، دہلی

فہرست مضامین

باب سوم

باب چہارم
متفرقات

باب پنجم
مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں

عرض ناشر

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

اما بعد! میرے لیے نہایت مسرت وانبساط کا وقت ہے کہ حضرت والد مرحوم محدث کبیر ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی قدس سرہ کے حالات زندگی اور علمی کارناموں پر مشتمل یہ کتاب معرض اشاعت میں آرہی ہے، میں خداوند قدوس کے لطف وکرم اور اس کے فضل واحسان پر خلوص قلب کے ساتھ سجدۂ شکر بجا لاتا ہوں کہ اس ذات بے نیاز نے ایک مختصر سی مدت میں حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وواقعات پر یہ دوسری اہم دستاویزی کتاب شائع کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

آج سے تقریباً چھ سال قبل میرے خوردزادہ عزیزم ڈاکٹر مسعود احمد سلمہ اللہ نے "حیات ابوالمآثر" کے نام سے حضرت علیہ الرحمۃ کے واقعات زندگی پر سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب مرتب کی تھی، اس کتاب کو علمی اور عوامی دونوں حلقوں میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ ایک قلیل مدت میں اس کے نسخے خاصی تعداد میں قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گئے، اور اب اس کا پہلا ایڈیشن ختم کے قریب ہے، ادھر یہ ناچیز اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کے متعلق غور کر رہا تھا، کہ حضرت والد صاحب کی حیات پر یہ دوسری کتاب تیار ہوگئی، اس لیے مجھے خیال اور فکر ہوئی کہ یہ کتاب بھی مطبوعہ صورت میں اہل علم ونظر کے ہاتھوں تک پہنچ جائے، تاکہ اہل ذوق

حضرات کو اس دور کے ایک عظیم اور بلند رتبہ انسان کی سوانح حیات دلنشین انداز اور نئے اسلوب کے ساتھ دیکھنے اور پڑھنے کا موقع میسر ہو سکے۔

"حیات ابو المآثر" میں اس کے مرتب و مصنف نے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کو ان کی تمام جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی تھی، جو صاحب کتاب کو دستیاب ہو سکی تھیں، لیکن انھوں نے علمی کارناموں پر تفصیلی گفتگو سے احتراز کر کے ان کی طرف صرف اشارے پر اکتفا کیا تھا، پیش نظر کتاب میں اس کے مصنف نے زندگی کے عام حالات پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈال کر حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں اور ان کی تصنیفی و تحقیقی خدمات پر زیادہ توجہ صرف کی ہے، اور ان کی تصنیفات و تحقیقات اور دیگر علمی خدمات کا بہت سلیقے سے تعارف کرا کے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں کو موثر انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

یہ کتاب برادر عزیز ڈاکٹر محمد صہیب سلمہ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس پر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے مقتدر اور صاحب علم و بصیرت استاذ جناب مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خان صاحب کی زیر نگرانی تیار کر کے ادب عربی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے، میں اپنی اور ادارے کی طرف سے عزیز موصوف ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرکے، ان کے لیے روشن مستقبل اور علمی و دینی ترقی کے لیے دعا و تمنا کرتا ہوں۔ اور جس محنت، لگن اور دلچسپی کے ساتھ انھوں نے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس کو دیکھ کر میں امید کرتا ہوں کہ وہ علم و تحقیق کی دنیا میں ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ ترقی کریں گے، آمین!

رشید احمد اعظمی

خادم مرقاۃ العلوم، مئو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی

الحمد لأهله والصلوة على أهلها

کبھی کسی کتاب میں عربی زبان کا یک جملہ پڑھا تھا کہ من صار بالعلم حیاً لم یمت ابداً "جو شخص علم کی وجہ سے زندہ ہو جائے وہ کبھی مرتا نہیں ہے، علم کی دولت حاصل ہونے کے بعد آدمی زندہ جاوید ہو جاتا ہے، "آغوش قبر میں پہنچ کر بھی اس کے اوپر موت نہیں طاری ہوتی، عالم ناسوت سے اس کا رشتہ اگرچہ منقطع ہو جاتا ہے، لیکن دنیا اس کو اور اس کی خدمات و کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کرتی، عالم کے اس عالم فانی سے چلے جانے کے بعد بھی لوگوں کے قلب و دماغ پر اس کے علم و فضل کا سکہ جما رہتا ہے، تاریخ و تراجم سے دلچسپی رکھنے والے اور تذکرہ نویسی کا شوق اور مشغلہ رکھنے والے اہل علم و تصنیف اس کی زندگی کے گوشوں اور پہلوؤں اور حیات مبارک کے مقدس اور پاکیزہ لمحات کو قید تحریر میں لاکر بعد میں آنے والوں کے لئے منارۂ نور تعمیر کرتے ہیں، تاکہ اس کی روشنی میں بعد کی نسلیں اپنی زندگی کا سفر طے کریں۔ اگر نگاہ حقیقت شناس سے دیکھا جائے تو اس بساطِ ارضی پر اشرف المخلوقات کی کتنی بڑی تعداد معرض وجود میں آتی ہے، اور اپنی مدت کار پوری کر کے سفر آخرت پر روانہ ہو جاتی ہے، لیکن تاریخ کا قلم ان ہی افراد کی زندگیوں کو محفوظ رکھتا ہے، جنھوں نے علم

وفن کی کوئی خدمت کی ہوتی ہے، یا انسانیت کی فلاح واصلاح کے لئے کوئی بڑا
کارنامہ انجام دیا ہوتا ہے۔

علم حدیث کے سرخیل، تاریخ وتذکرہ کے امام، فقہ وتفسیر کے پیشوا، ادب
ولغت کے نابغہ، میدان تحقیق کے شہسوار، بحر معرفت کے غواص اور شہرۂ آفاق
زمانہ ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمیؒ ان ہی یکتائے روزگار افراد میں
ہیں، جو اپنی کوہ پیکر علمی شخصیت اور علم وفن کی عظیم الشان اور ناقابل فراموش خدمات
کی وجہ سے رہتی دنیا تک یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔ علوم اسلامیہ کا کوئی ایسا شعبہ
نہیں ہے، جس پر ان کی نگاہ نہ رہی ہو، یا وہ ان کی جولان گاہ نہ رہا ہو اور اس میں
ان کے کمال ومہارت کا جوہر نہ کھلا ہو۔

علامہ اعظمیؒ کی ذات گرامی اس دور کے مسلمانوں کے لئے قدرت کا بیش
قیمت عطیہ تھی، جن کے لئے علوم اسلامیہ ودینیہ کے دروازے وا کردیئے گئے تھے، اس
کے اوپر ان کے خالق نے اسلامی احکام وتعلیمات کی شرح وتفسیر کے رموز کھول
دیئے تھے، اس دور میں ان کے ذریعہ نہ صرف عامۃ المسلمین بلکہ اہل علم کی ہدایت
ورہنمائی کا فریضہ انجام دلایا گیا ہے، مشکل سے مشکل بحثیں اور دقیق سے دقیق
مسائل کی، اپنے ناخن گرہ کشا سے عقدہ کشائی کرنا ان کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی، جن
مسائل ومشکلات میں بڑے بڑے دانشوروں اور ماہرین فن کا دل ودماغ الجھ کر رہ جاتا
تھا، علامہ اعظمیؒ اپنی خداداد صلاحیت، نور علم، اور فراست ایمانی سے بیک جنبش قلم ان کو
سمجھانے کی قدرت رکھتے تھے، ان کی تصنیفات وتالیفات کے مطالعہ سے اس کا
اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ کیسے کیسے معرکۃ الآراء مسائل کو کس خوبی اور عمدگی کے
ساتھ انھوں نے حوالہ قلم کرکے امت کے سامنے راہ عمل کو آسان اور واضح کیا ہے۔

علامہ اعظمیؒ کی پرورش خالص دینی ماحول میں ہوئی تھی، وہ پیدائشی علمی

میں وہ پروان چڑھے تھے، لیکن علم کی جس رفعت و بلندی تک وہ پہنچے تھے، اس میں زیادہ حصہ ان کی ذاتی کوششوں، شبانہ روز محنتوں اور طلب علم کے لئے آبلہ پائیوں اور صحرانوردیوں کا تھا، دنیا اور متاع دنیا نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن وہ اس سے اعراض کرتے رہے، جاہ و منصب نے ان کے قدموں کو روکنا چاہا لیکن وہ اس سے گریزاں رہے اور اس کی طرف نظر التفات کرنا بھی اپنی شان استغناء کے منافی سمجھی۔

دنیا نے سبز باغ دکھائے بہت مگر
وہ اپنی راہ پر ہی سدا گامزن رہا

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اعظمی جیسی باکمال ہستی اس صفحۂ ہستی پر کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے، ایسی شخصیت جس نے یک و تنہا وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں، جن کو ایک اکیڈمی بھی اپنے وسائل و ذرائع کے باوجود بمشکل انجام دے سکتی ہو، جس نے اپنی خطابات سے عوام و خواص کے دلوں پر سحر طاری کیا ہو، اپنی تصنیفات و تالیفات سے بڑے بڑے اہل علم کے قلوب کو متاثر کیا ہو، اور اپنے تحقیقی جوہر پاروں سے میدان بحث و تحقیق کے شہسواروں کی نگاہوں کو خیرہ کیا ہو۔

ایسی شخصیت کی حیات و خدمات کو بحث و تحقیق یا تصنیف و تالیف کا موضوع بنانا کوئی معمولی اور سہل کام نہیں ہے۔ اس کے علمی کارناموں سے تفصیلی تعارف کے لئے ایک ضخیم جلد اور خاص وقت درکار ہے، مردست برادر گرامی جناب محمد صہیب صاحب نے حضرت علامہ اعظمی کے علمی کارناموں کو اپنے ریسرچ کا عنوان بنا کر اس پر جو مقالہ تیار کیا ہے، وہ بہت قابل قدر اور لائق ستائش ہے، انھوں نے اپنے اس مقالے میں علامہ اعظمیؒ کی علمی خدمات کا جو تعارف پیش کیا ہے، وہ اختصار کے باوجود ہمہ جہت حیثیت کا حامل ہے، صہیب صاحب مقالہ لکھنے سے پہلے ہی سے

راقم الحروف کے مسلسل رابطے میں رہے ہیں۔ وہ دھن کے پکے اور لگن کے سچے ہیں، علامہ اعظمی کی زندگی کے بیشتر گوشوں اور بہت سے علمی و تحقیقی کارناموں پر، ہم سے تبادلۂ خیال اور گفتگو کرتے رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑی ہی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ انھوں نے اس مقالے کو تیار کیا ہے۔ تین سال کے قیمتی لمحات اس کی ترتیب میں صرف کیے ہیں، بلکہ ان کی محنت اور کدوکاوش پر بارہا میں نے رشک کیا ہے، خدا سے دعا ہے کہ ان کی محنت کو شرف قبول عطا فرمائے اور اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نافع بنائے۔ آمین!

مسعود احمد اعظمی

۲۴ ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ

۱۶/جنوری ۲۰۰۷ء

مقدمہ

پروفیسر شمس تبریز خان
شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين وعلى آله وصحبه وعلى من اتبعهم الى يوم الدين

بلاد عربیہ کے بعد اسلام، علوم اسلامیہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت سے ہندوستان کا جو دیرینہ، گہرا اور ہمہ گیر تعلق رہا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے، جس کی شروعات حضرت آدم کے ورود ہند سے ہوتی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف سے اس تعلق کی تجدید ہوتی ہے کہ مجھے مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہوتی ہے، اور وہ متعدد احادیث اور آثار بھی اس تعلق کو مضبوط بناتے ہیں جنہیں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ) نے سبحۃ المرجان کے شروع میں درج کیا ہے۔

ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد گویا وطن ثانی میں اقامت کی طرح تھی جہاں کی مہمان نوازیوں اور دلداریوں نے وطن اول کو بھی بڑی حد تک فراموش کرا دیا، اسلام کے شجر طیب نے اس زرخیز زمین میں بہت جلد اپنی جڑیں جما لیں اور برگ و بار لانے لگا اور یہ ملک اسلامی تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت اور علوم و فنون کا

ذائقہ محسوس ہی کیا ہو اور یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کی کوئی ایسی شاخ نہیں ہے جو

بوسیدہ و نارسیدہ غنچہ و گل سے محروم رہ گئی ہو۔

بہار آئے اور اس طرح سے بہار آئے   کہ گل تو گل ہی ہیں خار بھی مہک اٹھے

ویسے تو علوم اسلامیہ کی ہر شاخ میں ہندوستانی علماء نے اپنی ذہانت و فطانت، دانائی و ہوشیاری اور جدت و عبقریت کے نمونے پیش کیے ہیں، خصوصاً حدیث و فقہ اور تفسیر و کلام کے میدانوں میں بڑے کارنامے انجام دیے ہیں لیکن حدیث نبوی سے ان کا تعلق عشق کی حد تک پہنچ گیا ہے اور انھوں نے شروع سے آج تک حدیث نبوی سے اپنے قلبی و ذہنی، طبعی و جذباتی تعلق کے جس طرح مظاہرے کیے ہیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی وجہ سے حدیث شریف کی خدمت کے انھیں ایسے مواقع ملے جو عالم اسلام میں کسی اور کو نہیں ملے اور انھیں اس سلسلے میں اولیت و فضیلت کی سعادت حاصل ہوئی، مثلاً حضرت ربیع بن صبیح تبع تابعی ہیں وہ سندھی الاصل تھے، بصرہ میں قیام تھا، انھوں نے حسن بصری، ابن سیرینؒ اور ثابت بنانی وغیرہ جیسے اکابر سے روایت کی ہے اور ان سے وکیعؒ اور ابوداؤد طیالسی وغیرہ نے روایت کی ہے، ان کے اساتذہ میں مجاہدؒ، یزید رقاشیؒ، حمید الطویل اور ان کے تلامذہ میں ابن مبارک اور سفیان ثوری کے نام بھی آتے ہیں ان کا شمار حدیث کے اولین مصنفین میں بھی ہے انھوں نے ۱۶۰ھ میں بھاڑ بھوت (گجرات) خلیفہ مہدی کی فرستادہ فوج کے ساتھ شرکت کی اور وہیں ایک بیماری میں انتقال کیا۔

یہی اولیت دوسرے ہندوستانی الاصل محدث ابومعشر نجیح بن عبدالرحمن السندی (م ۱۷۰ھ) کو حاصل ہے جو تابعی بھی ہیں اور سیر و مغازی کے اولین مصنفین میں بھی ہیں ان کے اساتذہ میں سعید بن المسیبؒ، محمد بن کعب القرظی، حضرت محمد ابن المنکدرؒ، ہشام بن عروہؒ اور موسیٰ بن عقبہ جیسے شیوخ تھے، اور تلامذہ میں سفیان

ثوری، عبدالرزاق صاحب المصنف، وکیع بن الجراح، لیث بن سعد اور قتادہ جیسے مشاہیر تھے۔

عہد سلطنت میں حدیث شریف کی نمایاں خدمت کی سعادت علامہ رضی الدین حسن بن محمد الصغانی (م ٦٥٠ھ) کو بھی حاصل ہوئی جو لاہور سے جا کر بغداد میں مقیم ہو گئے تھے، ان کی لغت العباب الزاخر اور ابن سیدہ کی المحکم کو جمع کرکے مجدالدین فیروز آبادی نے مشہور عربی لغت قاموس تیار کی تھی۔

انھیں صحیح بخاری کے موجودہ متن کی تحقیق و تدوین کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور اپنے رسالہ الموضوعات میں تحقیق روایت اور درایت کے عملی نمونے بھی پیش کیے اور صحیح احادیث کی ترویج و اشاعت کے لیے "مشارق الانوار" کے نام سے صحیحین کا انتخاب عوامل نحویہ کی ترتیب کے مطابق کیا اور یہ مجموعہ احادیث ایسا مقبول و مروج ہوا جس کی بہت کم مثال ملتی ہے، ان کے شاگردوں میں عرب کے ساتھ افریقہ اور اندلس کے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں اور اس کے سیکڑوں حاشیے اور شرحیں لکھی گئیں اور ہندوستان میں تو دو صدیوں تک حدیث کے نصاب درس میں شامل رہی ہے۔

علامہ سیوطی نے جمع الجوامع میں صحاح ستہ اور چند اور حدیثی مجموعوں کو جمع کرکے احادیث صحیحہ کا ایک دائرۃ المعارف مرتب کر دیا تھا، شیخ علی متقی برہان پوری (م ٩٧٥ھ) نے اسے نئی ترتیب دے کر اس سے استفادہ کو آسان بنا دیا جو کنز العمال في سنن الاقوال والافعال کے نام سے حدیث کے حلقوں میں مقبول ہوا، اس کی اہمیت کے اعتراف میں علامہ شوکانی نے بجا طور پر یہ کہا تھا کہ

للسيوطي منة على العالمين وللمتقي منة عليه، (سیوطی کا احسان دنیا پر ہے اور علی متقی کا احسان خود ان پر ہے)

اسی طرح ان کے شاگرد شیخ محمد طاہر پٹنی (م ٩٨٦ھ) اپنی کتابوں المغني

فی ضبط الرجال، اور تذکرۃ الموضوعات سے بے مشہور ہیں لیکن ان کا
کارنامہ حدیث و قرآن مجید کی مشہور و مقبول لغت مجمع بحار الانوار ہے جو ابن
الاثیر کی النھایہ سے زیادہ جامع ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) حدیث
کی عظیم درسی و تحریری خدمات کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، ہندوستان میں
صحیحین اور مشکوٰۃ کے درس کے رواج میں ان کا بڑا ہاتھ ہے، الاکمال کے علاوہ
شرح سفر السعادۃ اور لمعات و اشعۃ اللمعات حدیث کی بہترین شرحیں ہیں۔
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) نے حجۃ اللہ البالغۃ کے ذریعے حدیث
کے اسرار و حکم کے بیان اور اس کے فہم و درایت کا ایک نیا باب کھولا جس نے پورے
عالم اسلام کو متاثر کیا ہے اسی کے ساتھ مسوی و مصفی کے ذریعے فقہی مذاہب میں تطبیق
کا اچھا نمونہ بھی پیش کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے نامور تلمیذ علامہ سید محمد مرتضی زبیدی بلگرامی (م ۱۲۰۵ھ)
نے قاہرہ میں اپنا حلقۂ درس قائم کر کے علامہ صغانی و شیخ علی متقی کی طرح ایک بار پھر
ہندوستانی علماء و محدثین کے تئیں زوال عزاز کو دوبالا کر دیا، ان کی عقود الجواھر
المنیفہ، اتحاف السادۃ المتقین اور تاج العروس کی افادیت کا سکہ آج
بھی قائم ہے۔

حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) اور حضرت مولانا رشید احمد
گنگوہی (م ۱۳۲۵ھ) اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (م ۱۳۳۹ھ) نے تصنیف سے
زیادہ تدریس اور تعلیم و تربیت اور مردم سازی پر توجہ کی اور دارالعلوم دیوبند کی شکل میں
فقہ و حدیث کا ایک عالمی مرکز قائم کر دیا، جس نے علوم اسلامیہ کے ایسے ماہرین پیدا
کیے، جن کی وجہ سے عالم اسلام میں ہندوستان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔
چنانچہ دارالعلوم کے ممتاز محدثین میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) کی فیض

لباری شرح صحیح بخاری اور العرف الشذی شرح سنن ترمذی، مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم شرح صحیح مسلم، مولانا ظفر احمد عثمانی کی اعلاء السنن، مولانا یوسف بنوری کی معارف السنن، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح، مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی بذل المجہود، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی لامع الدراری اور اوجز المسالک، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے درسی افادات 'معارف مدنیہ' مرتبہ مولانا سید حامد حسن صاحب امروہی اور حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کے درسی افادات 'ایضاح البخاری' مرتبہ مولانا ریاست علی بجنوری اور علامہ انور شاہ کشمیری کے درسی افادات 'انوار الباری' مرتبہ مولانا احمد رضا بجنوری حدیث کے حلقوں میں بڑی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہیں۔

فقیہ وقت و محدث عصر حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی (م ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۲ء) علماء و محدثین ہند کے اسی چودہ سو برسوں کے سلسلۃ الذہب کی مضبوط و قیمتی کڑی تھے، جنھوں نے علمائے راسخین و فضلائے محققین کے علم و فضل اور تحقیق و تدقیق کی شاندار دیرینہ روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے آگے بڑھایا اور حدیث و سنت کے مدفون و مجہول ذخائر کو حیات نو بخشی اور اس کے فیض سے خود بھی بقائے دوام کے مستحق ہو گئے۔

مولانا اعظمی کی تحقیقات و درسیات کی افادیت کے گوناگوں پہلو ہیں ان کا سب سے بڑا فائدہ تو فقہ و شریعت کے لیے سنت و سیرت کی تائید حاصل کرنا ہے، اور مختلف نزاعی مسائل میں سیرت و سنت نبویہ کی تحقیق و دریافت ہے، اس کے علاوہ حدیث کے ان قدیم صحیفوں سے مسلک حنفی کی تائید و توثیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی اشاعت مستشرقین کے اس اعتراض کا جواب بھی ہے کہ حدیث کے مجموعے بہت بعد میں مرتب ہوئے، ان کا طرز تحقیق و تدوین شرق و مغرب کے محققین کے لیے

تلاش حقیقت وحق پسندی، خلوص و بے غرضی، اور انتہائی محنت ومحویت ومقصدیت
عشق کا بے مثال اور قابل تقلید اسوہ ونمونہ ہے۔

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہ رواں است مرا

مولانا الاعظمیؒ کی علمی فتوحات میں "رکعات تراویح" کو بہت اہمیت حاصل ہے، جو اس موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ان متدرکات وتصحیحات کی بہت اہمیت تسلیم کی گئی اور عالم عربی کے محققین نے اپنی غلطیاں تسلیم کیں اور حضرت مولاناؒ کے اعتراضات وتنبیہات کو صحیح قرار دیا ہے۔ متدرکات میں مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی، تاج العروس للزبیدی، مولانا عبد الحی لکھنوی کی الرفع والتکمیل اور الاجوبۃ الفاضلۃ بتحقیق الشیخ عبد الفتاح ابو غدہ، احمد محمد شاکر (م ۱۳۷۷ھ) کی تحقیق مسند احمد، اور الالبانی شذوذہ واخطاءہ سے متعلق ان کے متدرکات علمی تنقید وتحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

الاعلام المرفوعہ اور ردّ المنام عن وجہ تحقیق الکلام کے ذریعہ طرق ثلاثہ اور قرأت خلف الامام کے حنفی مسلک کو احادیث نبویہ سے بخوبی مدلل کیا ہے۔ مولانا الاعظمیؒ کی رجال وتاریخ، فقہ وحدیث، لغت وادب عربی میں مہارت، بصیرت اور دقت نظر کا ثبوت ان کی تحقیق وتدوین اور تحشیہ وتعلیق کے ذریعہ شائع شدہ گراں قدر کتابیں ہیں جن کو انھوں نے ایک طرح سے نئی زندگی بخشی اور علمی دنیا میں ان کا حق تعارف کرایا۔ ایسی کتابوں میں جن کا نام لیا جاتا ہے، الحاوی، الثقات لابن شاہین (م ۳۸۵ھ) مسند الحمیدی (م ۲۱۹ھ) السنن لسعید بن منصور الخراسانی (م ۲۲۷ھ) مجمع بحار الانوار للفتنی (م ۹۸۶ھ)

المصنف لعبدالرزاق (م۲۱۱ھ) المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ لابن حجر (م۸۵۲ھ) کشف الاستار عن زوائد البزار للہیثمی (م۸۰۷ھ) مصنف ابی بکر بن ابی شیبۃ (م۲۳۵ھ)

ان کتابوں کے علاوہ مولانا اعظمی نے شیعہ، اہل بدعت اور اہل حدیث کے مسلک وموقف پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے جو حقیقت پسندی، غیرجانبداری اور علمی طرز تنقید وتحقیق کا مثالی نمونہ ہیں اور رسالہ "المآثر" مئو میں دوبارہ شائع ہو رہے ہیں۔

حضرت مولانا اعظمی کے علمی وتحقیقی مقام ومرتبہ کا عرب وعجم میں جس طرح اعتراف کیا گیا وہ ان کے لیے بھی باعث شرف وسعادت ہے اور جماعت دیوبند کے لیے بھی، حضرت مولانا کی علمی خدمات وفتوحات ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ہیں اور ہم سب کے لیے درس عبرت وبصیرت اور ذوق تقلید سود مند نمونہ ہیں۔

حضرت مولانا اعظمی کی ناقابل فراموش اور گراں قدر علمی وتحقیقی خدمات کا یہ تقاضا تھا کہ ان کا تفصیلی وتحقیقی جائزہ لیا جائے ان کے موضوعات کی اہمیت اجاگر کی جائے اور ان کے غیر جانبدارانہ اور معروضی اسلوب نقد وتحقیق کے محاسن کی نشاندہی کی جائے اور ان کی تمام کتابوں اور مضامین کے تذکرے کے ساتھ ان پر حقیقت پسندانہ اور بصیرت افروز تبصرہ بھی کیا جائے۔

اس سلسلے میں عزیزی ڈاکٹر محمد صہیب الہ آبادی سلمہ ہم سب کے شکریے اور قدردانی کے پوری طرح مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی حد تک حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی حیات وخدمات پر علمی وتحقیقی تبصرے کا حق ادا کر دیا اور مولانا کی علمی فتوحات وتحقیقات کا اس طرح تحلیل وتجزیہ کیا جس سے ان کی قدروقیمت اور افادیت اجاگر ہوگئی، مولانا کی ہر کتاب ومضمون پر تبصرہ ان کے مقالے کی خصوصیت ہے جس

میں انھوں نے بڑے اعتدال وتوازن، حقیقت پسندی اور علمی طرز استدلال سے کام لیا ہے۔ اپنے موضوع سے انھوں نے بڑی محنت اور سنجیدگی وشائستگی کے ساتھ انصاف کیا ہے، ان کے طرز بیان میں بھی ایجاز واختصار، بے تکلفی وبرجستگی اور سادگی کے ساتھ شگفتگی موجود ہے۔

اپنی کتاب کی تیاری کے سلسلے میں وہ بار بار حضرت مولانا کے ادارہ ''مرقاۃ العلوم'' مئو گئے اور صاحبزادۂ محترم جناب مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ اور جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب مدیر مجلّہ ''المآثر'' کے تعاون وسرپرستی میں اپنی تحقیق مکمل کی، اس طرح کتاب کو مولانا کے جانشینوں کا استناد واعتماد بھی حاصل ہے چنانچہ وہ اس کی اشاعت کا اہتمام بھی کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ عزیز محترم مولانا ڈاکٹر محمد صہیب سلمہ کو دین وعلم کی خدمت کی مزید توفیق عطا کرے اور ترقیات سے نوازے اور کتاب کو مقبولیت بخشے۔

شمس تبریز خاں

۵/جمادی آخرہ ۱۴۲۷ھ

۲/جولائی ۲۰۰۶ء

پیش لفظ

حضرت مولانا سعید الرحمن صاحب اعظمی ندوی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

بیسویں صدی عیسوی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کے ایک گمنام گوشے میں علم حدیث اور علوم اسلامیہ کے بحر ذخار کی شناوری کرنے کے لیے اللہ تعالی نے غیب سے ایک تاریخی شخصیت کو پیدا کیا، اس گمنام گوشے کو جو علم کے ساتھ صنعت وتجارت میں بھی بلند مقام رکھتا تھا، اس ملک کی مشرقی سمت میں قصبہ مئو کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، اسی تاریخی قصبہ میں علم حدیث کا ایک روشن چراغ نمودار ہوا اور جلد ہی وہ ایک آفتاب عالم تاب کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ علامۃ العصر محدث دوراں اور علوم اسلامیہ میں یکتائے روزگار حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (نور اللہ مرقدہ) کی شخصیت ہے، محدث جلیل نہ صرف حدیث وتفسیر میں ایک بلند مقام رکھتے تھے، بلکہ فقہ اسلامی اور علم الرجال میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے، اگرچہ انھوں نے اپنے وطن میں رہ کر ایک طرح سے گمنامی کی زندگی کو پسند کیا لیکن اس آفتاب کی روشنی سے نہ صرف ہندوستان کے علمی حلقے اور حدیث وفقہ کے مراکز فیض یاب ہوئے، بلکہ بیرون ملک میں آپ کی علمی بصیرت وتبحر اور عظمت شان کی روشنی بھی پہونچی، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ کی تحقیق

نظر اور گہداشت مسرت اور التفقہ فی الدین سے سارا عالم واقف ہو۔ مصرف علامہ اعظمی
کی تقریباً ۳۰ شخصیات نے آپ سے اجازت فی الحدیث کی سند حاصل کی۔ ان میں
شیخ عبد الفتاح ابوغدہ، بلاد شام کے محدث کبیر، اور جامع ازہر کے شیخ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود
شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کی علمی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی کہ دارالعلوم دیوبند
جیسے عظیم علمی مرکز کے ذمہ دار حضرات نے حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے
دیوبند کے شعبۂ افتاء کی صدارت اور پھر منصب شیخ الحدیث قبول کرنے پر اصرار فرمایا،
ان بزرگوں میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) اور
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم پیش پیش تھے اسی
مقصد کے تحت انھوں نے مئو کا سفر کیا اور محدث اعظمی سے ملاقات کی لیکن علامہ
اعظمی نے اپنی علمی اور تحقیقی انہماک کی وجہ سے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت
ظاہر فرمائی۔

علامہ اعظمی کی علمی اور تحقیقی خدمات اہل علم ونظر سے مخفی نہیں ہیں اور تاریخ
کے صفحات پر نقش دوام بن کر ثبت ہیں، یہی وجہ تھی ہند و بیرون ہند کے سب علمی
حلقوں اور متعدد تحقیقی اداروں سے ان کے نہایت مربوط اور مستحکم تعلقات تھے،
وہ علمی مسائل اور نقطہائے نظر میں اہل حدیث علماء سے شدید اختلاف کے باوجود ان
کے علمی مقام کا اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں کرتے تھے، انھوں نے شیخ الحدیث
علامہ عبدالرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی، جلیل القدر عالم مولانا ثناء اللہ
امرتسری اور اپنے معاصر عالم و محقق شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب مرعاۃ
المفاتیح اور دیگر علماء ومحدثین کی علمی اور دینی خدمات کو سراہنے اور ان کا اعتراف کرنے
میں کبھی کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور قائدین سے ان کے گہرے تعلقات تھے،

ان میں سرفہرست مولانا اشرف علی تھانوی کی ذات عالی صفات ہے، علامہ اعظمی کا ان سے مسترشدانہ تعلق تھا، لیکن حضرت تھانویؒ مختلف دینی و شرعی معاملات میں ان سے خط وکتابت کرتے رہتے تھے، اسی طرح بہت سے علمی مراکز اور ادارے ان کی سرپرستی فرماتے تھے، اور یہ ادارے اس پر بجا طور پر فخر کرتے تھے، امت مسلمہ کی اصلاح کے ساتھ تبلیغ ودعوت کو ساتھ لے کر چلنے کی راہ میں ہر ممکن کوشش کرتے تھے، علمائے کرام ان سے جملہ معاملات میں مشورے کرتے تھے، اور جب بھی کسی مسئلہ کا سامنا ہوتا تو لوگ آپ سے رجوع کرتے اور اس کا صحیح جواب حاصل کرتے تھے۔

علامہ اعظمی ایک عظیم محدث ہونے کے ساتھ ایک بے مثال علمی بصیرت اور تفقہ فی الدین کی دولت سے مالا مال تھے، اور کسی لمحہ بھی وہ اتباع سنت اور خشیت اللہ کی فکر سے جدا نہیں ہوتے، اس موقع پر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شیخ ازہر نے ان سے علمی استفادہ کی غرض سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور جامع ازہر میں کچھ وقت گذارنے کی درخواست کی، لیکن علامہ اعظمی نے بصد شکریہ معذرت کردی، اور آخر کار انھوں نے آپ سے حدیث کی سند حاصل کرکے آپ کو ایک جلیل القدر استاد تسلیم کیا۔

علامہ اعظمی کے علمی اور محدثانہ کارناموں کی تفصیل راقم الحروف نے بزبان عربی ایک رسالہ کی شکل میں ترتیب دیا ہے اس پر ایک عرصہ گذر گیا ہے مگر ابھی تک وہ زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا، ممکن ہے مستقبل قریب میں وہ شام کے کسی دار النشر سے طبع ہو جائے اس رسالہ میں علامہ اعظمی کے علمی اور محدثانہ مقام کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی ادبی بلندی اور عربی شاعری میں ایک طبع زاد شاعر کی حیثیت سے ان کے شعری نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

پیش نظر کتاب لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے

لیے جناب محمد صہیب صاحب ریسرچ اسکالر نے ڈاکٹر شمس تبریز صاحب پرافیسر شعبۂ عربی کی نگرانی میں لکھی ہے اور علامہ اعظمی کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔

اس سے قبل علامہ کے نواسے جناب ڈاکٹر مسعود صاحب نے علامہ کی سوانح حیات پر ایک گرانقدر کتاب "حیات ابوالمآثر" کے نام سے تالیف کرکے شائع کیا ہے اور وہ مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں اس کتاب کے مؤلف کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر مزید تحقیقی انداز میں کچھ لکھنے کی کوشش کریں گے تاکہ ہندوستان کے سوانحی کتب خانہ میں اس کے ذریعہ کوئی اچھا اور وقیع اضافہ ہوسکے۔ واللہ الموفق للصواب.

راقم الحروف

سعید الرحمن الاعظمی، مدیر مجلہ البعث الاسلامی

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰ر شعبان ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

عصر حاضر میں علمی تحقیق کی اختصاصی ڈگری (پی۔ ایچ۔ ڈی) کے لئے کسی خاص موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کا نہایت مفید طریقہ رائج ہے، اس کے لیے بعض اوقات اہم علمی شخصیت کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اگر مقالہ نگار علمی دیانت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عرق ریزی سے کام لے تو متعلقہ شخصیت پر نہایت مفصل، جامع اور مواد سے بھرپور ایک کتاب وجود میں آجاتی ہے جو اس شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور دوسروں کے لیے ایک مفید دستاویز کا کام دیتی ہے

اس وقت ایک ایسی ہی کتاب پیش نظر ہے جو محترم مولانا محمد حبیب صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نوراللہ مرقدہ کی حیات وخدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ حضرت محدث کبیر کا نام، اقلیم علم وفن کے تاجداروں میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے، وہ درحقیقت علماء کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کا امتیاز علوم وفنون کی جامعیت ہوتی ہے، لیکن ان کا اختصاصی میدان علم حدیث اور اسماء رجال تھا، اور وہ ہندوستان میں خدمت حدیث کی تابناک روایت کی ایک روشن کڑی تھے

ہندوستان میں صہبائے حدیث کے میخواروں اور خدمت گزاروں کی باہمی روایت شیخ علی متقیؒ، شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ، اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے ہوتی ہوئی مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ذریعہ نہایت جامعیت کے ساتھ آگے بڑھی اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے اولاد و احفاد اور سلسلۂ تلامذہ کے واسطے سے علماء دیوبند اس کے حامل و امین قرار پائے، جنھوں نے اس امانت کو قریہ قریہ پہنچا گھر گھر کو اس کے نور سے منور کردیا، خاص طور پر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ حضرات کے ذریعہ حدیث نبوی کی وہ خدمت ہوئی کہ قرون ماضیہ کی یاد تازہ ہوگئی اور شاعر کو کہنا پڑا۔

ساقیٔ دہلی نے مستوں سے بائے دیوبند	جب رکھی بنیاد میخانہ طہور یادگار
دور دورہ ساغر صہبائے حبیب کا ہوا	جرعہ نوشانِ زلالِ مے قطار اندر قطار
قاسم و محمود و انور نے لنڈھائے خم کے خم	اپنی وسعت کے مطابق پی گیا ہر بادہ خوار

ان کی خدمات کے آثار و مظاہر کو دیکھ کر مصر کے صاحب طرز عالم اور مفسر مصر علامہ سید رشید رضا مرحوم علماء ہند کی بلند پایہ خدمت حدیث کے اعتراف پر مجبور ہوئے اور ان کا قلم اس اعتراف حقیقت پر مجبور ہوا کہ اگر ان قرون اخیرہ میں علماء ہند نے فنون حدیث کی خدمت کا بیڑہ نہ اٹھایا ہوتا تو یہ علوم زوال کا شکار ہو جاتے۔

اس وقت عمومی طور پر علماء دیوبند کی خدمت حدیث کا جائزہ لینا مقصود نہیں بلکہ مختصر طور پر یہ دکھانا تھا کہ حضرت محدث اعظمی اس روشن تاریخ کے تسلسل کا ایک زریں کردار تھے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں علم و فن کے آسمان پر جو نامور آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور ان کے غروب کے بعد بھی اہل علم ان سے زندہ جاوید

افکار سے استفادہ کرتے ہیں ان شخصیات میں حضرت مولانا کا نام نہایت نمایاں ہے۔
بیسویں صدی میں عالم اسلام بالخصوص ہندوستان میں علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ زاہد
کوثری اور شیخ احمد محمد شاکر وغیرہ کے بعد علوم حدیث کے تابناک افق پر جو ستارے
نہایت آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوئے ان میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، شیخ الحدیث
مولانا محمد زکریا کاندھلوی وغیرہ کے ساتھ ایک نہایت نمایاں نام محدث کبیر حضرت
مولانا حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس
دور کے نامور خدام حدیث کی کوئی فہرست بھی مولانا کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا کا علم حدیث سے لگاؤ فطری تھا، ان کا ذوق خالص محدثانہ
ومحققانہ تھا، انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری سے
استفادہ کیا تھا، پھر جب آپ کو والد کی علالت کے سبب دیوبند سے جانا پڑا تو اپنے
وطن میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی اور مشہور محدث حضرت مولانا
کریم بخش سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی تکمیل کی تھی فراغت کے بعد تا حیات
وتدریس کے ذریعہ مسلسل خدمت حدیث میں مصروف رہے۔

علمی دنیا بالخصوص عالم عرب میں ان کی شہرت کا نقطہ عروج ان کے وہ
استدراکات تھے جو انہوں نے مصر کے مشہور و معروف محقق شیخ احمد محمد شاکر کی تعلیقات
علی مسند احمد پر کیے تھے، اور ان کو شیخ کے پاس بھیج دیا تھا شیخ نے ان کو اپنی کتاب میں
شامل کرتے ہوئے مولانا اعظمی کے تبحر علمی اور دقت نظر کا دل کھول کر اعتراف کیا اور ان کا
شکریہ ادا کیا، یہ چیز بجائے خود شیخ کی علمی دیانت اور وسعت قلبی کے ساتھ ساتھ مولانا
اعظمی کے استدراکات کی صحت اور علمی وقعت کی بین دلیل تھی۔

اس کے بعد حضرت محدث اعظمی نے اس فن کی خدمت کے لیے کئی نئی
وادیوں کو منتخب کیا اور نہایت کامیابی کے ساتھ ان سے عہدہ برآ ہوئے، ان میں سے

بعض نمونوں کا نام حسب ذیل ہیں

(۱) مسند حمیدی۔ تحقیق و تعلیق مسند حدیث کی اس قسم کو کہا جاتا ہے جس میں صحابی کی ترتیب سے روایات کو جمع کیا جاتا ہے، ہر صحابی کی تمام روایات خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق ہوں ایک جگہ جمع کردی جاتی ہیں، مسند کے نام سے بہت سے محدثین نے کتابیں لکھی ہیں جن میں امام حمیدیؒ کا نام بھی نہایت ممتاز ہے، وہ محدث امام بخاریؒ کے کبار اساتذہ میں سے ہیں، ان کی مسند غیر مطبوعہ شکل میں چلی آرہی تھی، حضرت محدث اعظمیؒ نے اس کے مختلف نسخوں سے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور پھر تعلیقات کے علاوہ ایک جامع مقدمہ لکھا، یہ کتاب مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

(۲) کتاب الزہد والرقائق یہ دوسری صدی ہجری کے نامور عالم محدث مجاہد حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کی تصنیف ہے جس میں تذکیر وموعظت کی احادیث جمع کی گئی ہیں، یہ بھی غیر مطبوعہ شکل میں خال خال ہی کتب خانوں میں موجود تھی، محدث کبیر نے اس کے چند مخطوطہ نسخوں کی مدد سے صحیح نسخہ تیار کیا، اس کی احادیث کی تخریج کی، مشکل الفاظ کی توضیح کی، اور فہرست سازی کے علاوہ ایک مقدمہ تحریر فرمایا، یہ کتاب مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں سے شائع ہوئی۔

(۳) مصنف عبدالرزاق یہ عظیم کتاب دوسری صدی ہجری کے مشہور امام حدیث، عبدالرزاق بن ہمام صنعانیؒ کی تصنیف ہے جس کی کثیر روایات ثلاثی ہیں، اکیس ہزار احادیث کا یہ عظیم مجموعہ بھی تشنۂ طباعت چلا آرہا تھا، حضرت اعظمیؒ نے اس پر دس سال محنت کی، نسخہ کی تصحیح کی، احادیث کی تخریج اور تحقیق وتعلیق سے اس کو مزین کیا، یہ کتاب گیارہ جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۴) مصنف ابن ابی شیبہ یہ کتاب بھی حدیث کی بہت اہم کتب میں سے ہے، اس کے مصنف، امام بخاری کے استاذ اور مشہور محدث ہیں، اس بے مثال کتاب

میں حذف کے مسودات بھی ملتے ہیں، یہ کتاب پہلے بھی چھپ چکی تھی، لیکن اس کے شایانِ شان تحقیقی کام نہیں ہوا تھا، حضرت مولانا نے اہلِ علم کے اصرار پر اس عظیم کتاب کی تصحیح اور تحقیق و تعلیق کا کارنامہ انجام دیا۔

یہ مولانا کے بے شمار علمی کاموں سے چند اہم خدمات کا اجمالی تذکرہ تھا، ورنہ آپ کی علمی فتوحات کی فہرست اس سے کہیں زیادہ طویل ہے جن کی تفصیلات آپ زیرِ نظر کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ ان عظیم علمی کارناموں کی بدولت آپ کا نام حدیث نبوی کے عالی مرتبت خدام میں جلی حروف سے لکھا جا چکا ہے۔

پھر یہ کہ آپ کی خدمات صرف علمِ حدیث تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ دیگر بہت سے علوم و فنون بھی ان کی خدمت کے دائرے میں آتے ہیں، تفسیر، فقہ، تاریخ و تذکرہ، مناظرہ وغیرہ میں ان کی باقاعدہ تصانیف کی ایک وسیع تعداد ہے، اسی کے ساتھ وہ زبان و ادب کے بھی شہسوار ہیں اور اردو فارسی عربی پر ان کو یکساں قدرت ہے، اور ان تینوں زبانوں میں نظم و نثر میں ان کے نقوش زندہ و تابندہ ہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت کس قدر علوم و فنون کی جامع ہے۔

اس علمی جامعیت خصوصاً حدیث میں اس درجہ وسعتِ نظر کے ساتھ ان کی جو خصوصیت نظر کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ شخصیت اور اکابر و اسلاف کے مسلک پر ان کا ثبات و استحکام ہے، حدیث پاک سے شغل رکھنے والے حضرات میں بعض اوقات جو غیر ضروری توسع پیدا ہو جاتا ہے اس سے حضرت مولانا کی ذات بری تھی، وہ اکابر دیوبند کی طرح تھے کہ انہیں کسی مسئلے میں اشکال پیدا نہیں ہوا یہ ان کی بالغ نظری کی علامت ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ نے ان کو دینی تفقہ اور گہری بصیرت کے بلند پایہ وصف سے حظ وافر عطا کیا تھا۔

ان علمی خصوصیات کے علاوہ ان کی عظیم شخصیت اور بھی بے شمار اوصاف

کمال سے متصف تھی، تصوف و سلوک میں ان کا مقام بہت بلند تھا، صداقت راسخ ان
کا خاص جوہر تھا، جس کی بنیاد پر وہ معاملات میں صحیح فیصلہ بآسانی تک پہنچ جاتے تھے
علمی تنقید اور اس میں دیانت پر کاربند رہنے کے عادی تھے، بہت خوش مزاج
تھے، مزاج میں اہل کمال کی طرح رعونت تھی، بلکہ تمام اوصاف کمال کے ساتھ ساتھ
تواضع اور اکابر کا احترام حد درجہ پایا جاتا تھا، ان کی ذات علم و عمل کی جامع تھی، اور
بلاشبہ ان کا شمار ان اہل کمال میں تھا جن کی مثالیں کم پیدا ہوتی ہیں۔ جو "در کفے جام
شریعت در کفے سندان عشق" کی صفت سے متصف ہوتے ہیں، جن کی شخصیت نہ تو
علم و فن کے کسی ایک شعبہ تک محدود ہوتی ہے اور نہ صرف علم یا صرف عبادت ان کی
پہچان قرار دیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کی ذات علوم و فنون اور اخلاق و کردار دونوں میں
مقام بلند پر فائز ہوتی ہیں۔

ایسی جامع شخصیات کے احوال و سوانح کا سامنے آنا ان کے حق کی ادائیگی بھی
ہے اور بعد والوں کے لیے رہنمائی بھی، اس لیے حضرت مولانا قدس سرہ پر مختلف اہل قلم
نے خامہ فرسائی کی ہے، جن میں اب تک سب سے نمایاں مقام ان کے نواسے مولانا
ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی کی کتاب "حیات ابوالمآثر" کا ہے، دوسرا بڑا مفصل تحقیقی
کام جناب مولانا محمد حبیب صاحب آبادی کے قلم سے سامنے آرہا ہے۔

اس کتاب کو انہوں نے پانچ ابواب پر مرتب کیا ہے۔

باب اول میں بیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی و ثقافتی حالات کا
جائزہ لیا گیا ہے، جس کے تحت مختلف سیاسی تحریکات کے علاوہ علمی تحریکات، دیوبند
علی گڑھ اور ندوہ جیسے اداروں کا پس منظر، اور مختلف فکری رجحانات پر اختصار کے ساتھ
روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب کا مقصد دراصل اس دور کو قارئین کے سامنے واضح کرنا
ہے جس میں حضرت محدث اعظمی نے آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی۔

دوسرے باب کا عنوان ہے سوانح حیات، اس میں ولادت سے وفات تک
کے حالات کا مختصر بیان ہے، اس میں ولادت، نام و نسب، تعلیم و تربیت، تدریسی
سرگرمیاں، بیعت و سلوک، سیاسی و سماجی سرگرمیاں اور وفات سب کا بیان آگیا ہے۔

تیسرا باب مختلف علوم و فنون سے متعلق خدمات کے موضوع پر ہے، یہ باب
اس کتاب کا خلاصہ اور سب سے مفصل باب ہے جو محدث اعظمی کی اصل شخصیت کا
تعارف کراتا ہے۔

سب سے پہلے تفسیر قرآن سے متعلق ان کی مختصر تحریروں کا تذکرہ اور
مفصل جائزہ ہے۔

اس کے بعد حدیث کے عنوان کے تحت مولانا کی خدمات کی تفصیل ہے،
اس عنوان کے تحت جن عظیم کتابوں کی تحقیق، تعلیق اور تصحیح وغیرہ کا جائزہ پیش کیا
گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں

(۱)الحاوي لرجال الطحاوي (۲)نصب الألمعي في مباحث من تخريج أحاديث الهداية للزيلعي (۳)كتاب الثقات لابن شاهين (۴)الترغيب والترهيب (۵)رسالة الأوائل (۶)مسند حميدي (۷)كتاب الزهد والرقائق (۸)سنن سعيد بن منصور (۹)مجمع بحار الأنوار (۱۰)مصنف عبدالرزاق (۱۱)المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية (۱۲)فتح المغيث بشرح ألفية الحديث (۱۳)تلخيص خواتم جامع الأصول (۱۴)كشف الأستار عن زوائد البزار على الكتب الستة (۱۵)مصنف بن أبي شيبة (۱۶)حياة الصحابة

اس کے بعد استدراکات کا عنوان ہے جس میں سب سے پہلے شیخ احمد محمد
شاکر کی تحقیقات مسند احمد پر مولانا کے استدراکات کی تفصیل ہے، اس کے بعد شیخ

ناصر الدین البانی پر مولانا کے استدراکات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو الالبانی شذوذہ واخطاؤہ کے نام سے طبع ہو چکے ہیں، پھر رفع والتکمیل جو مولانا عبد الحی لکھنوی کی تصنیف ہے اور اس پر شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی تعلیقات ہیں اس پر مولانا کے استدراکات کی تفصیل بیان کی گئی ہے پھر مشہور غیر مقلد عالم مولانا عبد الرحمن مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی پر مولانا کے استدراکات کا تذکرہ ہے۔

ان تحقیقات وتعلیقات کے بعد اسماء رجال میں مولانا کے مقام بلند کا تذکرہ اور اس کے شواہد پیش کیے گئے ہیں پھر حدیث کی حجیت وصداقت پر مولانا کی محققانہ تالیف نصرۃ الحدیث کا تذکرہ ہے، اس کے علاوہ پانچ چھ مزید کتب کا ذکر ہے جن پر مولانا کی تعلیق ہے، آخر میں محدث اعظمیؒ سے حدیث کی اجازت حاصل کرنے والے مشہور علماء کی فہرست ہے جس میں اس دور کے تقریباً سبھی بڑے بڑے عرب علماء نظر آتے ہیں۔ اور اسی پر حدیث کا عنوان مکمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد فقہ کا عنوان ہے جس میں مولانا اعظمی کی فقہی تالیفات کا جائزہ ہے اس میں الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ، الازہار المربوعہ فی رد آثار المتبوعہ، رکعات تراویح، رہبر حجاج، وغیرہ تقریباً سات آٹھ تالیفات کا مفصل تذکرہ اور بیس پچیس فقہی مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

فقہ کے بعد مناظرہ کے عنوان کے تحت رد شیعیت، رد غیر مقلدیت، رد بریلویت وغیرہ کے تحت دس بارہ تالیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اس کے بعد تاریخ وتذکرہ کا عنوان ہے جس میں پانچ چھ تالیفات کا تعارف اور پندرہ سولہ مضامین کی فہرست دی گئی ہے، اس باب کا آخری عنوان ادب ہے جس کے تحت عربی اور اردو نظم ونثر پر محدث اعظمیؒ کی قدرت، اور اس میدان میں ان کی مہارت کا تذکرہ، ان کی اردو عربی نثر کے نمونے، اسی طرح عربی نظم اور اردو میں

غرض لغت اور تاریخ گوئی وغیرہ سے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس عنوان سے محدث اعظمی کی حیات اور صلاحیت کا ایک پہلو سامنے آتا ہے، جو غالباً اسی کتاب کی خصوصیت ہے۔

چوتھا باب متفرقات کے عنوان سے ہے جس میں مولانا کی چند نادر کتابوں کے تعارف کے علاوہ تقریباً ساٹھ مضامین کی ایک فہرست دی گئی ہے۔

باب پنجم میں مولانا رحمہ اللہ کے متعلق اہل علم و نظر کی آراء پیش کی گئی ہیں جن سے مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے مقام بلند کو متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔

آخر میں اختتامیہ کے عنوان کے تحت حضرت مولانا اعظمی کی حیات و خدمات پر ایک اجمالی تبصرہ ہے جو بیک نظر مولانا کی شخصیت کو سامنے لے آتا ہے۔

سب سے آخر میں کتابیات کا عنوان ہے جس کے تحت مؤلف نے ان مراجع کی فہرست دی ہے جن سے انہوں نے اپنے اس مفصل تحقیقی مقالہ میں استفادہ کیا ہے، اس فہرست میں ۲۷ عربی و اردو کتب، چار انگریزی و ہندی کتابیں اور ۳۲ رسائل و مجلات شامل ہیں، یہ فہرست بجائے خود مؤلف کی عرق ریزی و جانفشانی کی بہترین گواہ ہے۔

مجموعی اعتبار سے کتاب اپنے موضوع پر نہایت کامیاب ہے جس کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ جناب مولوی محمد صہیب صاحب نے اپنے مآخذ سے براہ راست اور بھرپور استفادہ کیا ہے اور اس طرح وہ تحقیقی مقالہ کی حیثیت سے اس کام کی آبرو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

دعا ہے کہ باری تعالیٰ اس محنت کو قبول عام عطا کرے اور اس کو محدث اعظمی کی شخصیت اور خدمات سے استفادہ کا ذریعہ بنائے آمین۔

ریاست علی بجنوری غفرلہ

خادم تدریس، دارالعلوم دیوبند

حرفے چند

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی
ریڈر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بس دلکش است قصۂ خوباں ورزاں میاں
تو یوسفی و قصۂ تو احسن القصص

فخر الاماثل حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نور اللہ مرقدہ (متوفی ۱۰ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ، ۱۹ر مارچ ۱۹۹۲ء) عہد حاضر کے کبار علماء میں سے تھے، عرب وعجم کے اساطین علم نے ان کے فضل وکمال اور تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی جلالت علمی کی وجہ سے ارباب علم کے درمیان محبوبیت کی شان رکھتے تھے۔

ناچیز اپنی سعادت تصور کرتا ہے کہ کم سنی ہی میں اسے اپنے والد مرحوم کے ہمراہ حضرت کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ پھر کسی نہ کسی تقریب سے حضرت کی خدمت میں حاضری کے مواقع نصیب ہوتے رہے۔ جامعہ مظہر العلوم، بنارس میں ختم بخاری کے موقع پر ایک سے زائد مرتبہ حضرت کے درس حدیث میں شرکت کی توفیق بھی نصیب ہوئی، اس طرح بتدریج حضرت کی محبت وعقیدت دل میں راسخ ہو

کی مجالس میں کس وقت اور اس فراوانی سے مقصود ہے، آپ حضرت تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عبد الشکور، مولانا سید سلیمان ندوی اور علامہ انور شاہ کشمیری جیسے اکابر کے محبوب و معتمد رہے ہیں۔

وہ اہل علم حضرات جنھیں محدث جلیل کی صحبت میں رہنے اور ان سے مستفید ہونے کے مواقع نصیب رہے ہیں، اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ معقولات و منقولات دونوں پر حاوی تھے اور علوم مشرقیہ متداولہ کے تمام شعبوں اور گوشوں پر ان کی غائر نظر تھی، بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ مذکورہ فنون میں سے کسی فن کا منتہی بھی علم کے اس بحر ذخار کے سامنے خود کو مبتدی تصور کرتا تھا۔ (ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء) تاہم آپ کا میدان خصوصی حدیث، فقہ و ادب تھا، مولانا نعمت اللہ اعظمی مدظلہ العالی (استاذ حدیث، دارالعلوم دیوبند) نے علم حدیث میں انھیں ذہبی و ابن حجر سے تشبیہ دی ہے، ناچیز عرض کرتا ہے کہ حدیث و فقہ کی جامعیت کے لحاظ سے وہ ابن جریر طبری اور امام طحاوی کے مشابہ تھے، عربی زبان و ادب پر بھی انھیں قدرت تامہ حاصل تھی، لیکن اپنے اسلاف کی طرح انھوں نے مقصود بالذات بنانے کے بجائے علوم دینیہ کا خادم بنایا تھا۔

محدث جلیل کا ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ وہ نہایت وسیع المطالعہ تھے، مختلف علوم و فنون کی امہات کتب کے علاوہ نوادر مخطوطات سے بھی ان کی واقفیت بے پناہ تھی، ہند و بیرون ہند کے معروف کتب خانوں کے علاوہ مختلف علمی خانوادوں کے ذاتی ذخیروں کی بھی خبر رکھتے تھے، مطبوعات کی طرح اہم مخطوطات کا مطالعہ بھی باستیعاب کرتے تھے۔

وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ قدرت نے اس نابغہ روزگار محدث کو متقدمین کا سا حافظہ ارزانی فرمایا تھا کہ جس فن کی جو تحریر ایک بار نگاہ سے گذر جاتی نقش

کا عجز ہو جاتی تھی، قریب رہنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ متعلقین یا دور و اطراف سے آتے، اپنی مشکلات و معلومات پیش کرتے، محدث جلیل کسی توقف یا مراجعت کتب کے بغیر فی البدیہہ جواب شافی سے نوازتے، مصنفین اور کتابوں کے نام ہی نہیں ان کے سنین وفات، سنین اشاعت اور مطابع کے نام بھی بلا مبالغہ ہزارہا کی تعداد میں انھیں محفوظ تھے، ناچیز نے ایک بار عرض کیا کہ خیر الدین الزرکلی نے 'الأعلام' میں شمس الدین ابیوردی 'باء' کے کسرہ کے ساتھ ضبط کیا ہے، فرمایا ''غلط ہے، صحیح 'ابیوردی' فتحہ کے ساتھ ہے''۔ 'علوم دینیہ اور مطبع نول کشور' کے عنوان سے اپنی ایک تحریر برغرض اصلاح خدمت والا میں پیش کی۔ دیکھنے کے بعد فرمایا مضمون ٹھیک ہے البتہ بعض مصنفین کے سنین وفات صحیح نہیں ہیں۔

علم ایسا راسخ، مرتب اور منقح تھا کہ جس مسئلے میں ایک بار جو رائے قائم فرما لیتے وہ ایسی صائب اور درست ہوتی کہ اختلاف کرنے والا مہینوں نہیں، برسوں بھٹک بھٹکا کر بالآخر وہیں پہنچتا۔

عنفوان شباب میں درس و تدریس کے پہلو بہ پہلو باطل اور گمراہ فرقوں کے تحریفات و ہفوات اور شکوک و شبہات کے رد و ابطال کی طرف توجہ زیادہ رہی اور یہ وقت کی ایک اہم ضرورت بھی تھی، کیوں کہ یہ دور ابو حیان توحیدی (متوفی تقریباً ۴۰۰ھ) کی تعبیر کے مطابق 'نبح کل کلب من کل زاویة، وزأر کل أسد من کل أجمة، وصبح کل ثعلب من کل تلعة'' (ہر گلی سے ہر کتا بھونکا اور ہر جھاڑی سے ہر شیر دہاڑا اور ہر ٹیلے سے ہر لومڑی نے آواز لگائی) کا تھا، کہیں منکرین قرآن تھے، کہیں منکرین سنت تھے، کہیں منکرین صحابہ تھے اور کہیں منکرین فقہا تھے، وغیرہ۔ محدث جلیل نے تحریراً و تقریراً اپنی مناظروں اور کتب و رسائل کے ذریعے ان تمام فتنوں کے سد باب میں حصہ لیا اور علم و عمل کے میدان میں تابندہ نقوش یادگار

چھوڑ گئے، پھر جب آپ نے صحاح ستہ کے چاروں سنن، مسانید،
مصنفات اور حدیث کے دیگر نادر مخطوطات کو خاص تحقیقات و تعلیقات کے ساتھ
مزین فرما کر پہلی بار زیورِ اشاعت سے معروف کیا تو آپ کی شہرت تمام عالمِ عرب
تک بلکہ مشرق سے مغرب تک ہر طرف پھیل گئی اور علماءِ عصر کے درمیان آپ کا
تفوق واضح اور روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا

فإنك شمس والملوك كواكب　　إذا طلعت لم يبد منهن كوكب
(نابغہ الذبیانی)

محدث جلیل کے علمی آثار میں ان کے استدراکات و تعلیقات بھی ایک
خاص شان کے حامل ہیں، اصل یہ ہے کہ بہ قدرِ توفیق مطالعہ کتب تو سبھی کرتے ہیں،
لیکن معمولی استعداد رکھنے والے قاری کو مصنف کی غلطیوں اور تسامحات کا ادراک بھی نہیں
ہوتا، اس کے برخلاف عالمِ متبحر کی نگاہِ باریک بیں مخفی وجلی ہر قسم کی غلطیوں کا ادراک کر
لیتی ہے، محدث جلیل کا یہی معاملہ تھا، وسعتِ مطالعہ، نگاہِ ثاقب اور علمی استحضار کی وجہ
سے زیرِ مطالعہ تحریر کی خامیاں آپ پر نمایاں ہو جاتی تھیں، ایسی صورت میں کبھی تو
اصل کتاب یا مضمون پر ہی اپنے استدراکات ثبت فرما دیتے اور اگر ضرورت متقاضی
ہوتی تو مستقل کتاب یا مضمون کی شکل دے دیتے، متفرق مضامین و مقالات سے قطع
نظر شیخ احمد محمد شاکر، محمود محمد شاکر، ناصر الدین البانی، صاحب تحفۃ الاحوذی پر آپ
کے استدراکات غیر معمولی اہمیت کے حامل اور آپ کے تبحرِ علمی کے آئینہ دار ہیں۔

محدث جلیل کو تصنیف و تالیف کا ذوق عہدِ طالب علمی ہی سے تھا، چنانچہ اس
دور کی بعض تحریریں اب بھی محفوظ ہیں، پھر یہ شوق ترقی کرتا گیا اور آپ نے مدت العمر
تحریر و تسوید سے شغل رکھا، حسنِ ترتیب، زورِ بیان اور قوتِ استدلال آپ کی
نگارشات کے بنیادی اوصاف ہیں، اسی طرح مخاطب خواہ کوئی ہو اور موضوع چاہے

مناظرانہ ہی کیوں نہ ہو، آپ کی کوئی تحریر علمی متانت سے عاری نہیں ہوتی، یہ عجیب بات ہے کہ آپ کی ابتدائی قلمی کاوشیں بھی پختگی ورزانت میں بعد کی تحریروں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

محدث جلیل نے اپنی عربی تصنیف وتعلیقات سے قطع نظر علمی افادات وافاضات کے لیے عام طور پر اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا ہے، اس طرح اس زبان کی ثروت میں اضافہ ہو، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درس وتدریس سے وابستہ علمائے کرام عام طور پر اردو زبان وادب سے اشتغال نہیں رکھتے، اس لیے نامانوس عربی مرکبات ومفردات کی کثرت کی وجہ سے ان کی اردو تحریروں میں بسا اوقات ناہمواری اور ثقالت کا احساس ہوتا ہے، لیکن محدث جلیل کی اردو تحریریں بھی، ان کا موضوع کیسا ہی خشک کیوں نہ ہو، سلاست، شگفتگی کی حامل اور سانچے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، بات یہ ہے کہ آپ نے اردو ادبیات کا بھی مطالعہ کیا تھا شعروسخن کا ذوق رکھتے تھے، اردو کے مشہور انشاء پردازوں اور ان کے اسالیب سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے صاف ستھری اور شگفتہ نثر لکھتے تھے، ایک بار سید احمد دہلوی کی "فرہنگ آصفیہ" کا ذکر آیا تو فرمایا "نوراللغات اس کے مقابلے میں زیادہ بہتر لغت ہے۔"

محدث جلیل کی وفات کے بعد آپ کی حیات وشخصیت اور علمی خدمات کے تعارف کے لیے سہ ماہی "ترجمان الاسلام" بنارس نے "مولانا حبیب الرحمن اعظمی نمبر" شائع کیا، اس کے بعد آپ کے نبیرۂ گرامی قدر ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی نے پہلے عربی پھر اردو میں آپ کی سوانح حیات مرتب کی، اردو سوانح حیات "حیات ابوالمآثر" کے نام سے ۲۰۰۰ء میں مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ، مئو سے شائع ہو چکی ہے۔ اس

میں فاضل نوجوان نے بڑی جولانی دکھائی اور یہاں کا تعارف نگاری کے ساتھ حیات ابوالمآثر کے طرز پر اردو ادبیات میں پیدا ہوا ہے۔

اب ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ محدث جلیل کی علمی خدمات کا کسی جامع اور مفصل انداز میں تعارف کرایا جائے، قسام ازل نے یہ سعادت بھی ایک نوجوان فاضل ڈاکٹر محمد صہیب قاسمی الہ آبادی کے لیے مقدر فرمائی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف نے ”مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور ان کی علمی خدمات“ کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا، جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی ہے۔

راقم نے یہ مقالہ شروع سے آخر تک پڑھا ہے، اس کا تیسرا اور چوتھا باب محدث جلیل کی علمی خدمات کا بڑی حد تک احاطہ کرتا ہے، مقالہ نگار نے تفسیر، حدیث، فقہ، مناظرہ، تاریخ و تذکرہ، اور ادب کے ذیلی عنوانات قائم کر کے ہر موضوع سے متعلق محدث جلیل کی تمام تحریروں کا تعارف کرایا ہے، اس ضمن میں انھوں نے رسائل اور کتابوں ہی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ موضوع زیر بحث سے متعلق مضامین، مقالات اور دوسروں کی کتابوں پر تحریر کردہ مقدمات وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھا ہے، پھر آخر میں متفرقات کے تحت ان کتابوں سے متعلق گفتگو کی ہے، جو مذکورہ عنوانات کے تحت نہیں آتیں، مثلاً ”احسن الادب [illegible]“ اور ”سرالمحبت“ وغیرہ، اس طرح علمی خدمات کے اس تجزیہ و تعارف میں جامعیت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

مقالہ نگار کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں اس کام کے دوران محدث جلیل کے خلف رشید مولانا رشید احمد اعظمی کی سرپرستی اور نبیرۂ گرامی قدر ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی کی رفاقت حاصل رہی، اس طرح انھیں اپنے موضوع سے متعلق تمام ضروری مآخذ تک رسائی کے مواقع نصیب ہوئے، ساتھ ہی قدم بہ قدم زبانی رہنمائی بھی ملتی رہی، جہاں

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موضوع زیر بحث سے متعلق ان کے بیانات کو اعتبار کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ انھوں نے محدث جلیل کی تمام دستیاب تحریریں خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا غیر مطبوعہ دیکھی اور بیشتر پڑھی ہیں۔

اس مقالے کی ایک اچھی صفت یہ بھی ہے کہ مقالہ نگار نے افراط وتفریط سے دامن بچاتے ہوئے اس میں ہر جگہ اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ اس کی زبان غیر آرائشی، اسلوب سادہ اور پیش کش متناسب ہے۔ اسی طرح تمہید، تعارف اور مثالوں وغیرہ کے سلسلے میں غیر ضروری تطویل سے احتراز کیا گیا ہے، اگر کسی مختلف فیہ مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے تو اس میں مخالف نقطۂ نظر کو بھی ہمدردی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اس کا مرجوح ہونا ظاہر کیا گیا ہے، مثلاً جامع معمر اور جامع عبدالرزاق کی بحث وغیرہ۔

ممالک عربیہ کے برخلاف ہندوستان کے عصری جامعات میں ادبیات کے شعبوں میں تحقیق کا معیار بہ تدریج زوال پذیر ہے۔ طلبہ عموماً محنت سے جی چراتے ہیں، اس لیے اچھے اور معیاری مقالے شاذ ونادر ہی منظر عام پر آتے ہیں، ڈاکٹر محمد صہیب نے تین سال تک شبانہ روز محنت کی ہے، پیش نظر مقالہ اسی کا ثمرہ ہے۔ امید ہے کہ اشاعت کے بعد علمی حلقوں میں اسے شرف قبول حاصل ہوگا۔ شکر اللہ مساعیہ۔

- ظفر احمد صدیقی

علی گڑھ ۱۷ جولائی ۲۰۰۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین، وعلی آلہ وصحبہ الطیبین الطاہرین، وعلی من اتبعھم الی یوم الدین۔

ہندوستان کی سرزمین کو یہ افتخار حاصل ہے کہ اس نے ایک ایک یگانۂ روزگار شخصیتوں کو جنم دیا جنہوں نے اپنی علمی کاوشوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور اور روشن کیا۔ اس خاک کے خزف ریزے بھی درناب کی طرح روشن ہوئے اور ایسے ایسے تابناک اور درخشندہ علمی ستارے جگمگائے کہ جن کی ضیاء علم نے نہ صرف یہ کہ تاریخ کے صفحات کو روشن کیا بلکہ علم وتحقیق کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔

یہ ہمارے ملک کا شرف و اعزاز ہے کہ اگر فارسی زبان میں امیر خسرو سے لے کر مرزا غالب تک جید شعراء وادباء کے کارنامے نظر آتے ہیں، تو عربی میں بھی ایسے نابغہ روزگار گزرے ہیں کہ جن کی علمی فتوحات نے عرب کو بھی ان کا معترف ومداح بنادیا۔

اگرچہ عربی ایک دینی ومذہبی زبان سمجھی جاتی ہے، اور عام طور سے یہ خیال ہے کہ اس زبان میں کسی غیر عرب کا شرف وامتیاز حاصل کرنا مشکل ہے، لیکن اللہ تعالی جس کو بھی خدمت دین کی توفیق کرامت کرے، وہ اپنے معجزنما قلم سے ایسے کارنامے

انجام دیتا ہے کہ جس کی عظمت و بلندی پر صحرائے عرب کے حدی خوانوں کو بھی رشک
آتا ہے۔

ایسی ہی شخصیتوں میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی شخصیت ہے۔
اتر پردیش میں نسبتاً ایک غیر معروف علاقہ میں پیدا ہونے والے ایک فرد نے اپنے
علمی کارناموں سے بین الاقوامی وقار عطا کیا۔ مولانا اعظمی نے مئو میں بیٹھ کر
اپنے رشحات قلم سے دین اسلام کو متوجہ کیا، انہوں نے کسی اختلاف کی پروا نہ کی،
اور جو کچھ حق سمجھا اور صحیح جانا، اس کے اظہار میں کبھی نہ ہچکچائے اور نہ کبھی ان کے قلم کو
لغزش ہوئی۔ اس کا قلم تمام عمر حق و صداقت کی آواز بلند کرتا رہا۔

مولانا اعظمی کو موضوع تحقیق بنانے کی دشواریوں کا اندازہ اس سے لگایا
جا سکتا ہے کہ ان کی علمی جلالت ہشت پہل ہے۔ مفسر، محدث، فقیہ، مورخ، محقق،
ادیب، مناظر اور مدرس اور پھر ایک ایسی شخصیت! مجھ جیسا بے بضاعت اس میدان
میں قدم رکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا، اگر مجھے ایسے رہنما کا دامن نہ ملتا، جس کی نگاہ
علوم کے ان تمام شعبوں پر ہے۔

ہندوستان کی اہم ترین تصنیفات میں شمس بازغہ کی بڑی اہمیت ہے، سیدنا
ابراہیم علیہ السلام کو بھی "شمس بازغہ" سے معرفت الٰہی حاصل ہوئی اور اس کی حسات
میں نظروں پر ہمارے اسرار و رموز آشکار ہوئے۔ مجھ جیسے کم علم کو بھی ایک شمس ملا جس کو
دنیا مولانا شمس تبریز خاں کے نام سے جانتی ہے۔ ان کی وجہ سے ساری دشواریاں
آسان ہوئیں، انہوں نے حق رہنمائی ادا کیا، اور اگر کہیں اس مقالہ میں میرا قلم
ڈگمگایا ہوگا تو وہ میری عدم استعداد کا نتیجہ ہوگا۔ انہوں نے انتہائی حقیقت پسندانہ
رویہ اختیار کرتے ہوئے تنقید و تادیب کے فرائض کی انجام دہی بھی کی، اگر ان کی توجہ
و عنایت شامل حال نہ ہوتی تو اس مقالہ کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا بے حد مشکل تھا۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے

باب اول میں ۱۹۰۱ء سے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، علمی، ثقافتی
حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جن میں مولانا نے آنکھیں کھولیں۔ یہ ایک ناقابل
حقیقت ہے کہ سیاست کا ثقافت اور تعلیم سے گہرا رشتہ ہے اور سب ایک دوسرے پر اثر
انداز ہوتے ہیں۔ کسی شخصیت کی حیات کے مختلف گوشوں اور اس کے علمی کارناموں پر
روشنی ڈالنے کے لئے اس کے عہد اور ماحول سے متعارف ہونا ضروری ہے، چنانچہ
اس باب میں ہندوستان کے چودھویں صدی کے سیاسی و ثقافتی حالات کو اختصار کے
ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا اعظمی کی سوانح حیات قلم بند کی گئی ہے۔ چونکہ اس
مقالہ میں مولانا کی علمی خدمات سے بحث کرنا مقصود ہے، اس لئے حیات کے شخصی
گوشوں کو مختصر ہی پیش کیا گیا ہے۔ البتہ حیات سے متعلق ان تمام گوشوں کا احاطہ تحریر
میں لانے کی پوری کوشش کی گئی ہے، جن سے کسی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

تیسرا باب علوم و فنون سے متعلق مولانا کی خدمات اور تحقیقی کارناموں کا
ہے۔ اس باب میں ہر فن سے متعلق مولانا کی خدمات کو علیحدہ علیحدہ فصل میں پیش کیا
گیا ہے۔ اس کے عناوین یہ ہیں: تفسیر، حدیث، فقہ، مناظرہ، تاریخ اور ادب۔

چوتھا باب "متفرقات" کا ہے۔ اس باب میں مولانا اعظمی کی مختلف علمی
کاوشوں کو یکجا پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب "مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں" ہے۔ اس باب میں ان
مشاہیر اہل علم کی آراء پیش کی گئی ہیں، جنھیں مولانا کی وجاہت علمی اور جلالت شان کا
اعتراف تھا۔

مولانا اعظمی کی علمی خدمات کو مقالے کا موضوع بنانا نہایت مشکل اور دشوار

اور صد درجہ حساس ذمہ داری پیدا کرنے والا امر تھا، لیکن راقم الحروف نے اس سے باوجود اس بار کو اٹھایا جسے صاحبانِ علم و بصیرت نے مقدس پتھر سمجھ کر چوما اور چھوڑ دیا۔ استاذ محترم کی مسلسل حوصلہ افزائیاں مشعل راہ تھیں، حسن اتفاق سے ایسے صاحبانِ علم کی صحبت بھی نصیب ہوئی کہ جن کے تعاون نے اس مقالہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

میں اپنے تمام احباب کا شکر گزار ہوں، جن کا سلسلہ لکھنؤ، دہلی، اعظم گڑھ و مئو تک پھیلا ہوا ہے۔ انگریزی میں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی قابل قدر ہیں جو کنارے پر کھڑے ہو کر تیراک کا دل بڑھاتے ہیں، میں ان سب کا ممنون ہوں۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ مجھے خاندان سے باہر بھی ایسے بزرگ ملے جنھوں نے مسلک کے اختلاف کے باوجود میرے طالبعلمانہ شوق کے مدنظر میری مدد کی۔ اس مدد میں دامے درمے کی بجائے قدمے اور نسخے کے ساتھ کتابیں بھی شامل تھیں۔

میں اپنے والد محترم جناب احمد علی صاحب مدظلہٗ کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اپنے بڑے بھائی جناب محمد شعیب صاحب (مقیم اسکندریہ مصر) کا ذکر کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں، جو کچھ بھی میں لکھ سکا اس کا ایک ایک لفظ ان کی شفقتوں اور محبتوں سے گرانبار ہے۔

میں اس مقالہ کے سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ صاحبزادہ محدث اعظمیؒ کی سرپرستانہ رہنمائی کا بصمیم قلب ممنون ہوں۔ مقالے کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی جس خلوص کا جناب والا نے مظاہرہ کیا ہے، اس کا میرے قلب پر بہت اثر ہے اور شکریہ کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔ بس یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر ان کے سایۂ عاطفت کو مدت دراز تک باقی رکھے۔

"المآثر" کے نائب مدیر برادر محترم جناب ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی اور

جناب مولانا انور رشید الاعظمی (مدیر مسئول المآثر) کا بے حد متشکر ہوں، انہوں نے اپنے خزانۂ علم وخلوص کے سارے دروازے میرے لئے کھول دیئے اور مجھے اجازت دے دی کہ میں حل وگہر چن کر اس مقالہ کو مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے شایانِ شان بنا سکوں۔ بالخصوص ڈاکٹر مسعود احمد صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ قدم بہ قدم ان کے قیمتی مشوروں نے راہ تحقیق کو ایسا روشن کر دیا کہ منزل مقصود تک رسائی میرے لئے آسان ہو گئی۔ ناسپاسی ہوگی اگر مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی (مدیر المآثر وسرپرست مجلہ ضیاء الاسلام) کا ذکر نہ کیا جائے۔ انہوں نے مقالے سے متعلق اہم ترین مواد فراہم کئے۔ اس کے لئے میں ان کا شکرگزار رہوں۔

آخر میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ اگر اس مقالہ میں تسامحات ہو گئے ہیں، تو وہ تقاضے بشریت ہیں اور تحقیق میں کوئی حرف آخر نہیں ہوتا۔ علوم کے صفا ومروہ کے درمیان جتنی سعی ممکن تھی، وہ میں نے کی، پھر بھی قبولیت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور صاحبانِ نظر اگر اسے یہ شرف عطا کریں گے تو باعث صد افتخار ہوگا۔

السعي مني والإتمام من الله

محمد صہیب

باب اول

ہندوستان بیسویں صدی کے اوائل میں

- سیاسی حالات
- علمی و ثقافتی حالات

باب اوّل

ہندوستان بیسویں صدی کے اوائل میں

تاریخ شاہانِ اولوالعزم کی مہم آزمائیوں کا نام نہیں ہے، اور نہ وقت کو کسی حتمی خطِ امتیاز سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دراصل تاریخ اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے جن کی روشنی میں تاریخ کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔ 'وقت' یا 'تصورِ زمان' لاکھ بے حقیقت سہی سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ہونے کے باوصف یہ اول بھی فنا رکھتا ہے، آخر بھی فنا رکھتا ہے۔ واقعات وجود میں آتے ہیں اور وقت کے دریا کی طوفانی لہروں میں ابھرتے ہیں اور غرق ہو جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح واقعات سے وقت کی شناخت ہوتی ہے، خود وقت کی شناخت اور پہچان اس انسان کے کارناموں کے ذریعہ سے ہوتی ہے جو "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" کا بجا طور پر مصداق ہے۔

خلافتِ الٰہیہ کا سر پر تاج رکھنے والے انسان کو واقعات کا خالق نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن واقعہ ساز تو بحق کہا جائیگا۔ وہ اپنے خونِ جگر سے واقعات کو اس طرح کی سرخی دیتا ہے کہ وہ کائنات کا جلی عنوان بن جاتے ہیں۔ یہی وہ انسان ہے جو وقت کی سیل کو روک لیتا ہے اور اپنے علم و فضل کے جلال و جمال سے نئے نئے جہانوں کو آباد کرتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء ایک ایسی ہی شخصیت کے سفرِ حیات کا نقطۂ آغاز ہے، جس نے علم کو

نظریات بڑی حد تک گہرے تعمق اور غور و فکر سے پڑھے جائیں تو یہ احساس دلاتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی نظریں جن عبارتوں میں چھپے ہوئے ماضی کو دیکھنے کی عادی تھیں اس سے کہیں زیادہ وہ مستقبل کے افق کو دیکھ رہی تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے باہمی تعاون کی اہمیت پر زور دیا اور یہ بتایا کہ مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دماغی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ جو راج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے، مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے وہ قوم کا دشمن ہے۔ اسکو ختم ہونا چاہئے۔ کام کے اوقات محدود کئے جائیں، تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، تاجروں کی غلط قسم کی مسابقت سے روح تعاون کو نقصان نہ پہنچنا چاہئے اور حکومت کو بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہئے۔ [1]

حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ میں شاہ صاحب نے جو بحث کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شاہ صاحب بنیادی حقوق یا Fundamental Rights کا وہ تصور رکھتے تھے جو دور حاضر میں بھی اس حد تک نہیں پہنچ سکا مثلاً روٹی، کپڑا، مکان، نکاح کرنے کی استطاعت، بچوں کی تعلیم و تربیت بلا لحاظ رنگ و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ذہن و تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے۔ یہ وہ خیالات ہیں جو ولی اللہی تحریک کے خدوخال اور نقوش کو روشن کرتے ہیں۔

اسی دوران بہت سے حوادث و واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ملک کی سیاسی جہتوں کو بدل دیا اور ہنگامہ خیز صورت پیدا کر دی، ایک طرف مرکزی ارباب حکومت کے درمیان ایرانی اور تورانی امراء میں اختلاف نے زور پکڑ لیا جسکے نتیجے میں

۱ے علامہ [illegible] ص ۷-۸ مولانا محمد میاں

خانہ جنگی شروع ہوئی تو دوسری طرف صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے۔ جنوبی ہند میں
مرہٹوں کی ایک مستقل طاقت بن گئی، دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت
قائم ہو گئی اور پھر اودھ کی وزارت بادشاہت سے بدل گئی۔

ان تمام حوادث و واقعات کے باوجود مغل بادشاہ ایک لمحہ بھی اس زخم کو نہیں
بھولا جو اسے بکسر کی جنگ میں پہونچا تھا، لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، ایک طرف انگریزوں
کا بڑھتا ہوا اقتدار تھا تو دوسری جانب ارباب حکومت کی سرد و گرم جنگ۔ اس سلسلہ
میں مولانا محمد میاں لکھتے ہیں کہ:

”مرہٹوں کے سیلاب کو دہلی تک پہونچانے والا نظام الملک آصف جاہ
اول تھا جبکہ بنگال و بہار میں ہندوستان کی حکومت ختم ہو کر انگریزی اقتدار
بڑھ رہا تھا۔“[1]

تاریخی حالات کے جبر کی بنیاد پر اب جو شیرازہ بندی ہوئی تو ایک طرف
انگریز تھے تو دوسری جانب انکے مخالفین جس میں روہیلہ، مرہٹہ، حیدر علی کے نام قابل
ذکر ہیں۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں جب دہلی پر قبضہ کیا تو اس طے شدہ پالیسی سے
کام لیا ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا“۔

ایسے حالات میں ولی اللہی تحریک آگے بڑھتی رہی اور اس کے ہمہ گیر نظریہ
کو عوامی تائید حاصل ہوتی رہی، البتہ اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو تاریخی طور پر
شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ درست نہیں ہے کہ شاہ صاحب مغلیہ سلطنت کی گرتی
ہوئی دیوار کو اٹھانا چاہتے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ م ۱۷۳۱ء شب
جمعہ کو مکہ مکرمہ میں شاہ صاحب نے ضمیر کی آواز سنی کہ

”ملک و ملت کی فلاح صرف اسی صورت میں ہے کہ دور حاضر کے تمام

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۵۵

> نظاموں کی دھجیاں بکھیر دی جائیں اور ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جائے۔"[1]

دوسری جانب حضرت سید احمد بریلوی اپنے رفقاء کے ہمراہ اصلاح معاشرہ اور ردِ بدعات کی خاطر پورے ملک کا دورہ کرتے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس اصلاحی دورہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

> "ہندوستان میں توحید، اتباع سنت اور جہاد کے سلسلہ میں سید احمد شہید (۱۲۴۶ھ) کے دوروں کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو پتہ چلے گا کہ ہزاروں لوگ شرک و بدعات جیسے گناہوں سے تائب ہوئے، شراب خانے سونے پڑ گئے اور مسجدیں تنگ پڑنے لگیں۔"[2]

ڈاکٹر عابد حسین نے سید صاحب کی تحریک کا سیاسی طور پر یوں جائزہ لیا ہے

> "اس جہاد کا رخ سردست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا۔ سید صاحب کا مقصد اصلی جس کے لئے انہوں نے پنجاب میں اور نواب کی مدد سے مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت قائم کی، یہ تھا کہ اسے صدر کیمپ بنا کر انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کریں اور انکو ہندوستان سے نکال کر دم لیں۔"[3]

انگریزوں نے سید صاحب کے ساتھ کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی بلکہ ان کی تحریک کی خاموش تائید کی، سید احمد شہید کی تحریک کے سلسلہ میں پروفیسر عزیز احمد انگریزوں کے نرم رویہ کو دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی ۲:۲۶
[2] ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ص ۲۰۲ مولانا ابوالحسن علی ندوی
[3] ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ص ۲۶-۲۷ ڈاکٹر عابد حسین

"سید احمد بریلوی کی تحریک کی تنظیم نے ابتدائی مراحل میں نہایت بے اعتنائی سے شاہ اسمٰعیل کے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالا اور انہوں نے مذہبی بنیادوں پر برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔"[1]

۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے جس نے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کیا۔ انگریز مورخ لکھتا ہے کہ "۱۸۵۷ء کا غدر ایک نئے طبقے کے لئے واضح موڑ بنا"۔[2] یہ تاریخی موڑ اس اعتبار سے یادگار ہے کہ بہادر شاہ اول پسر اورنگ زیب کے بعد ہندوستان نے مرکزیت کھو دی تھی اور انگریزوں کے قدم پورے ملک میں جمنے لگے تھے۔ اسی دوران ہندوستانیوں نے غاصبانہ انگریزی تسلط کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک عظیم مہم چلائی جو ۱۸۵۷ء کی "جنگ آزادی" کی شکل میں رونما ہوئی، اور نوے سال بعد ۱۹۴۷ء میں کامل طور پر اس طرح بار آور ہوئی کہ ۱۸۵۷ء میں جو طبقہ تحریک آزادی میں غالب تھا، وہ متعدد وجوہ سے مغلوب ہو چکا تھا۔

موضوع سے غیر متعلق ہونے کی بناء پر غدر کے تفصیلی حالات سے گریز کیا جاتا ہے، البتہ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اس نازک موقع پر مسلم علماء نے جہاد بالقلم اور جہاد بالسیف دونوں فرض ادا کئے۔ مشہور شخصیتیں جو اس موقع پر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئیں، ان میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی احمد اللہ شاہ، مفتی صدر الدین آزردہ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر مولانا نانوتوی نے باقاعدہ شاملی کے محاذ پر ایک مجاہد کی حیثیت سے فن شمشیر زنی کا مظاہرہ کیا۔

مولانا قاسم نانوتوی ۱۲۴۸ھ میں ضلع سہارنپور کے نانوتہ نامی مقام پر پیدا

۱۔ ہندو پاک میں اسلامی کلچر ص ۳۲۵ پروفیسر عزیز احمد ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی

A History Of India Vol.II P 167 -Percival Spear ۲

ہوئے، اور گیارہ سال کی عمر میں مولانا مملوک العلیؒ کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ وہاں
ابتدائی تعلیم وتربیت کے بعد حدیث شاہ عبدالغنی دہلویؒ سے پڑھی، اور بیعت وسلوک کا
رشتہ حاجی امداد اللہ مکیؒ سے رکھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کتب خانوں میں تصحیح کا
کام شروع کیا۔ اسی دوران بخاری شریف کے آخری کچھ پاروں پر حاشیہ بھی لکھا۔
مولانا نے عیسائیوں سے مناظرہ بھی کیا اور علمی وعقلی دلائل سے حریف کو شکست فاش
دی۔ اس سلسلہ میں 'میلہ خداشناسی' میں مسئلہ توحید پر ایک زبردست تقریر اور روڑکی کا
ایک لکچر جو 'قبلہ نما' کے نام سے مشہور ہوا، یہ تاریخی یادگار ہیں۔

مولانا نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شریک ہوئے اور کارہائے
نمایاں انجام دیئے۔ انگریزوں کے سامنے سپر انداز ہوتے ہوئے اس شمع کو روشن
رکھا جو آزادی کے لئے جلائی گئی تھی۔ شاملی کی شورش کے بعد ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی
جو صرف درسیات والا مدرسہ نہ تھی بلکہ مدرسہ فکر وتبلیغ بھی تھا۔ مدرسہ کے قیام کے سلسلے
میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا بیان ملاحظہ ہو

"۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز
قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۵۷ء کی ناکامی کی
تلافی کی جائے۔"[1]

مولانا نانوتویؒ کو وطن عزیز سے بے حد محبت اور فرنگیوں سے سخت نفرت تھی
انہوں نے "اپنے مریدوں کو سرکاری امداد قبول کرنے سے منع کیا۔"[2] لیکن انگریزی
زبان کی تعلیم کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ مولانا نانوتوی ۳ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ء کو دیوبند ہی
میں ۴۹ سال کی عمر میں بعارضہ ضیق النفس انتقال فرما گئے۔

---

۱ سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۲۶ مولانا مناظر احسن گیلانی
۲ انقلاب اٹھارہ سو ستاون ص ۱۰۳ مرتبہ پی سی جوشی

سرسید نے جو سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مولانا سے اختلاف رکھتے تھے،
مولانا کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ لکھا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید مولانا کے
ذاتی کمالات کے معترف تھے۔ اس نوٹ کی چند سطریں پیش خدمت ہیں

"لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق کے کوئی شخص ان کی مثل ان
تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے
اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا
کہ اس دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق کی مثل اور شخص کو بھی
خدا نے پیدا کیا ہے … ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں
شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ
کر تھا … درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص
تھے … ان کا وجود … نہایت عمدہ یادگار ہے۔"[1]

غدر کی تاریخ لکھنے والوں میں پنڈت سندر لال، خلیق احمد نظامی، خواجہ حسن
نظامی، براہ راست ماخذ کے طور پر منشی میر شکوہ آبادی، مرزا غالب دہلوی وغیرہ کے نام
لئے جا سکتے ہیں۔ بے شمار ڈائریوں، روزنامچوں، فرامین اور خود نوشت سوانح عمریوں
اور بعض شعری تخلیقات سے بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے، بالخصوص اب
تو غالب کی دستنبو کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ غرض کہ دو برس میں پورا ہندوستان
مجروح اور زخموں سے چور ہو اٹھا تو مسئلہ یہ تھا کہ اب نئی زندگی، حکومت چھن گئی تھی،
اقتدار ہاتھ سے نکل گیا تھا، اور ایک خوف و انتقام کی تلوار تھی جو لٹک رہی تھی۔

جیسے جیسے انگریز ہندوستانی عوام پر ظلم و زیادتی کرکے انہیں اپنے زیر اقتدار
رکھنے کی کوشش کرتے، ویسے ویسے ہندوستانیوں میں بغاوت اور قومیت کے جذبات

۱۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے ص ۲۲۸، ۲۳۴ مولانا اسیر ادروی

کی ترقی ہوتی رہی جسکے نتیجہ میں مختلف سیاسی پارٹیاں اور تنظیمیں وجود میں آئیں۔ ان
میں ایک نمایاں نام انڈین نیشنل کانگریس کا ہے، جو تنظیم مسٹر اے او ہیوم کی کوششوں سے
۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر
گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج میں ہوا جس کے صدر ڈبلیو سی بنرجی منتخب ہوئے[1]

۱۷ رشوال سنہ ۱۲۹۲ھ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو مقام [illegible] کوٹ میں مولانا ولایت
علی، مولانا عنایت علی، مولانا نور اللہ، میر مقصود علی جیسی برگزیدہ ہستیوں کی قیادت کا
آغاز ہوتا ہے۔ ان شخصیتوں سے وہ نصب العین کی وراثت ملی جن کی تعبیر تھی جو فرنگی سے
تعاون کے بجائے تصادم کا قائل تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے تصادم کی مختلف شکلیں
انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں رونما ہوئیں۔ جس کی ایک
کڑی مولانا محمود حسن دیوبندی کی قیادت میں اس خفیہ تحریک کا آغاز تھا جسے "ریشمی
رومال کی تحریک" کے نام سے شہرت ملی، یہ تحریک اس لئے شروع کی گئی تھی کہ
ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آئے اور خلافت مرکزیہ دیار
اسلامیہ کو تباہی سے بچا جائے گا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ترک فوجیں افغانستان
کے راستے ہندوستان پر حملہ کریں گے اور اندرون ملک مسلمان بغاوت کرکے
انگریزوں سے ملک آزاد کرا لیں گے[2]

تحریک ریشمی رومال کا باقاعدہ آغاز یوں ہوا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کابل

---

۱ بھارتیہ سوتنترتا آندولن کا اتہاس حصہ دوم ص ۲۹۳ تا [illegible]
The History of the Indian National Congress Volume 1
,1885-1935, p18 Dr Pattabh S ta Ramayya

۲ تحریک خلافت ص ۴۲ قاضی عدیل عباسی

۳ مضمون بعنوان "ریشمی رومال" [illegible] ماہنامہ [illegible] ص ۵۰

روانہ کئے گئے تاکہ ترکستان سے فوجی امداد حاصل کی جا سکے[1] اس کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے لئے روانہ ہو گئے۔ حجاز پہنچ کر انہوں نے گورنر غالب پاشا سے تین تحریریں حاصل کیں، پہلی تحریر مسلمانان ہند کے نام تھی۔[2] دوسری تحریر مدینہ کے گورنر کے نام تھی کہ وہ حضرت شیخ الہند کی انور پاشا سے ملاقات کرا دیں[3] اور تیسری تحریر انور پاشا کے نام تھی کہ وہ مولانا کے مطالبات پورے کریں۔[4] پہلی تحریر جو مسلمانان ہند کے نام تھی غالب نامہ سے معروف ہوئی۔

ترکی افغانستان معاہدہ کا مسودہ مضمون مولانا عبیداللہ سندھی اور نصراللہ خان سے ایک پیلے رنگ کے ریشمی رومال پر لکھوایا جو بیک نظر معمولی تھا۔[5] مولانا نے کابل سے ایک خط ریشمی رومال پر لکھ کر شیخ عبدالحق کے ہاتھ شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجا تھا کہ وہ اسے خود یا کسی معتمد علیہ کے ذریعہ حضرت شیخ الہند کو پہنچا دیں۔ لیکن یہ تحریر کسی طرح سے پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر کے پاس پہنچ گئی، جس سے مولانا عبیداللہ سندھی اور دوسرے کارکنوں کی تحریک کے بھید معلوم ہو گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کو بھی مکہ معظمہ میں گوناگوں حوادث سے گزرتے ہوئے گرفتاری و نظر بندی قبول کرنی پڑی۔

اس طرح وہ فضا، وہ ماحول اور وہ مناظر سامنے آ جاتا ہے جس میں شخصیتوں نے اپنی عظمت کی تاریخ اپنے خون دل سے لکھی اور ایک راستہ بتا گئے کہ ہم بلندی و عظمت انہیں کے نقش قدم پر چل کر حاصل ہو سکتی ہے۔ عالمی اور ملکی سطح پر مسلمان جس

---

1 تاریخ دیوبند ص ۲۲۶، ۲۲۷ سید محبوب رضوی
2، 3، 4 نقش حیات ۲۰۲، ۲۰۳ مولانا سید حسین احمد مدنی
5 مضمون "ریشمی رومال" کرنل کمار نیا دور جنوری ۷۹ء ص ۵۵

کشمکش کا شکار تھا جسے ہندو انقلاب کی طلوع سامراجیت پر رکھا جا سکتا ہے۔

مگر اس دور بلا خیز میں وہ وقت جو ریشمی رومال تحریک کے نتیجے میں پیش آئے وہاں پریشانیاں جھیل چکے اور قید فرنگ کے مزے چکھ چکے تھے وہ بدلتے ہوئے حالات سے، اور ملک کے سیاسی خلفشار سے، خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے جب پہلی جنگ عظیم اپنے اختتام تک پہنچی اور ترکوں کی شکست تقریباً یقینی ہو گئی تو مسلمانوں نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر خلافت تحریک شروع کی جس کا مقصد ترکی میں خلافت کو برقرار رکھنا تھا۔ حالانکہ مشہور مؤرخ جم میسیلوس کے خیال میں ''گاندھی جی اس طرح اپنی ستیہ گرہ کی بنیادوں کو مضبوط بنا رہے تھے''۔[1]

مسلمانوں میں خلافت تحریک کے سلسلہ میں سب سے اہم نام مولانا محمد علی جوہر کا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس، خلافت کانفرنس، جمعیۃ العلماء، اور مسلم لیگ کا اجلاس ساتھ ساتھ امرتسر میں منعقد ہوا۔[2] خلافت کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے ہوا کہ مولانا محمد علی کی قیادت میں ایک وفد خلافت کے سلسلہ میں اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے یورپ بھیجا جائے۔[3] چنانچہ فروری ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لندن روانہ ہوا۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد علی جوہر اور ارکان سید سبط حسین، مولانا سید سلیمان ندوی، سید ابوالقاسم اور سکریٹری جناب حسن محمد حیات منتخب ہوئے۔[4] اس وفد نے انگلستان پہنچ کر مسٹر فشر، سر ولیم ڈیوک، مسٹر جے فی شک برٹ اور مسٹر ہنس وغیرہ سے ملاقات کی اور اپنے مطالبات رکھے۔ لیکن افسوس کہ نتیجے میں مایوسی ہی ہاتھ لگی۔

---

1. Jim Masselos, Nationalism On The Indian Subcontinent, P 133
2. ہندوستانی مسلمان، ایم مجیب، ص [illegible]
3. ایضاً ص ۱۳۰
4. مولانا محمد علی کی یاد میں ص ۱، سید صباح الدین عبدالرحمن
5. ایضاً ص ۲

شیخ الہند مولانا محمود حسن متوفی ۱۹۲۰ء بھی خلافت تحریک سے منسلک ہوئے خلافت تحریک کے سلسلہ میں شیخ الہند کی افتتاحی تحریر سے انکی رائے کا علم ہوتا ہے جو جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس میں پڑھی گئی

"حق تعالیٰ شانہ نے کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپکے اس پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا، میں ان دونوں قوموں کے اتفاق واتحاد کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں"[۱]

یہ وہ خطوط ہیں جنکے سہارے ہندوستانی سیاست آگے بڑھتی رہی۔ آگے چل کر ہندوستانی تاریخ میں کتنے موڑ آئے؟ کتنے حوادث وواقعات رونما ہوئے اور انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے میں کتنی جدوجہد برداشت کرنی پڑی؟ یہ ایسے سیاسی نکات ہیں جو خود ایک عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ سیاست ہمارا موضوع نہیں اس لئے اس سے گریز کیا جاتا ہے۔

البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسی عوامل ثقافتی اور تعلیمی محاذ پر بھی اثر انداز ہوئے تھے۔ یا یہ بات یوں کہی جائے کہ ثقافتی اور تعلیمی حالات نے سیاست کو متاثر کیا تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے ختم ہونے سے پہلے تعلیمی محاذ پر جو روش اختیار کی گئی اور جو بعد میں مختلف رجحانات کی نمائندہ بنی، اسکی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان ہنگامی حالات میں دو شخصیتیں ایسی ابھریں جنھوں نے سیاسی اور تعلیمی دونوں محاذ پر کام کیا۔ دونوں کے مقاصد ایک تھے مگر طریقہ کار میں بعد المشرقین تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں

"دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم اور سر سید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ ایک ہی استاد کے شاگرد تھے لیکن ان دونوں قائدوں کی سیرت

۱۔ اسیر مالٹا ص ۵۹ سید محمد میاں

"وطبیعت میں عدم اشرافیت تھا۔ سر سید مسلمانوں کے طبقہ امراء واشراف کی بہترین روایات کے وارث تھے تو مولانا محمد قاسم طبقہ علماء ربانی کی بہترین صفات کے حامل تھے۔"[1]

عام طور پر یہ سمجھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ جناب سر سید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ساتھ مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے، جیسا کہ ابھی ڈاکٹر عابد حسین کی تحریر میں دیکھا گیا۔ "یہ روایت واقعات کی رو سے صحیح نہیں اور معتبر ثبوت کی محتاج ہے۔"[2]

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ / ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء بروز جمعرات دیوبند مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اس کے پہلے معلم ملا محمود تھے اور متعلم بھی محمود۔ گزشتہ صفحات میں اس مدرسے کے قیام کی وجہ تحریر کی جا چکی ہے، اور اس سلسلہ میں شیخ الہند کا بیان بھی درج کیا جا چکا ہے۔ مولانا نانوتوی نے اس مدرسہ کو اپنے خون جگر سے یوں سینچا کہ اس چھوٹے سے مدرسے نے دنیا کی ایک عظیم ترین دانشگاہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ دارالعلوم دیوبند ایک ایسا سرچشمہ علم و آگہی ثابت ہوا جس سے ساری دنیا کے لوگوں نے علمی و دینی پیاس بجھائی۔ مولانا نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کے قواعد و ضوابط کو ترتیب دیتے ہوئے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا کہ مادی مصلحتوں پر روحانی مصلحتوں کو ترجیح حاصل ہو۔ چنانچہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ دارالعلوم کی جب تک غیر مستقل آمدنی رہے گی اس وقت تک یہ توکل علی اللہ کے سہارے چلتا رہے گا اور جب اس کی آمدنی مستقل ہوئی تو پھر اندیشہ ہے کہ امداد غیبی موقوف ہو جائے۔[3]

---

[1] ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں ص ۴۸

[2] ترجمان دارالعلوم ج ۱۰ شمارہ ۵ ص ۲۱

[3] سوانح قاسمی ۲-۲۲۲

جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو ہندوستان میں تین علمی مراکز تھے۔ دہلی جہاں حدیث و تفسیر پر زیادہ توجہ تھی۔ دوسرا اہم مرکز لکھنؤ تھا جہاں کے علماء پر فقہ اور اصول فقہ کا رنگ غالب تھا۔ اور تیسرا مرکز خیرآباد تھا جہاں منطق و فلسفہ پر زیادہ زور تھا۔ دارالعلوم نے ان تینوں مراکز کے موضوعات کو شامل کر کے ایک جامع نصاب مرتب کیا اور انہیں تینوں کی بنیاد پر علوم دینیہ، حدیث، قرآن، فقہ و تصوف اور حکمت و کلام کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی خدمت انجام دی۔

چونکہ دارالعلوم دیوبند فقہ و حدیث کے مرکز کی طرح قائم رہا اور ان پر انہیں دونوں علوم کا گہرا اثر رہا اسی لئے وہاں کے فضلاء نے ہر دور میں ان مضامین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس جانفشانی و جانسوزی سے اس میدان میں کام کیا کہ فقہ و حدیث کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی۔ ان فضلاء میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا یوسف بنوریؒ وغیرہ ممتاز رہے ہیں۔ دارالعلوم کے بارے میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں

"دین کو مضبوطی سے پکڑے رہنا، حنفی مسلک پر پختگی سے کاربند رہنا، اسلاف کی روایت و اقدار کی حفاظت، اور سنت کا دفاع دارالعلوم کا شعار ہے۔"[1]

اسی طرح اعلاء کلمۃ اللہ، حفاظت دین، اور اشاعت علم کا ایک عظیم مرکز مظاہر علوم سہارنپور ہے۔ اس مدرسہ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کا سنگ بنیاد یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ، ۹ نومبر ۱۸۶۶ء بروز جمعہ رکھا

---

[1] المسلمون فی الہند ص ۱۰۵ مولانا ابوالحسن علی ندوی

گیا۔ اس کے بانیوں میں فقیہ العصر حضرت مولانا محمد سعادت علی سہارنپوری، محدث کبیر حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہم تھے۔ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند کا نظامِ تعلیم اور منہج تقریباً ایک ہی ہے اس مدرسے نے حدیث، فقہ اور علوم وفنون کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

سیاسی تفریق کی وجہ سے سرسید نے پہلے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالہ کے اجراء کے ساتھ ہی سرسید جب ولایت سے واپس آئے تو مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کے قیام میں مصروف ہوگئے، چنانچہ انہوں نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" علی گڑھ میں قائم کیا، جسکا افتتاح سر ولیم میور نے کیا۔ اس کالج نے ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔

سرسید کی "تحریک علی گڑھ" کا مقصد مسلمانانِ ہند کو مایوسی وقنوطیت سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کی اشاعت تھی، تاکہ مسلمان جو اقتصادی اعتبار سے بہت کمزور تھے، تعلیم کے ذریعہ ملازمتیں حاصل کرکے اپنی اقتصادی پوزیشن مضبوط کریں، اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ زندگی کی مسابقتی دوڑ میں آگے بڑھیں۔ اس یونیورسٹی نے پسماندگی کی طرف تیزی سے جھکنے والے مسلم معاشرہ کو کافی حد تک سنبھالا اور اسے حیات نو عطا کی۔ مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے فضلاء نے مسلمانوں کی زندگی کے رخ، اور ملک کی سیاست میں موثر کردار ادا کیا۔ اور اسی یونیورسٹی سے ہندو قومی تحریک کے بالمقابل مسلم قومی تحریک کا آغاز ہوتا ہے[1]

ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں ایک اہم ادارہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" دہلی ہے، جس کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے چند دوسرے بزرگوں کی رفاقت میں ڈالی تھی[2]

۱۔ المسلمون فی الہند ص ۱۱۱

۲۔ موج کوثر ص ۱۴۵ شیخ اکرام

اس یونیورسٹی کی تاسیس اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ شیخ [illegible] یونیورسٹی سر سید کے خواب کی تعبیر ہے۔[۱] اس یونیورسٹی نے ایک اشتراکی [illegible] کے ارباب قلم میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، پروفیسر [illegible] وغیرہ بہت معروف ہوئے۔ تہذیب و ثقافت اور علم و ادب میں اس کا خاص مقام ہے۔

ہندوستان کی ایک اہم تعلیمی تحریک اور ایک عظیم درسگاہ ''ندوۃ العلماء'' کا قیام ۱۸۹۴ء میں عمل میں آیا۔ اس کے مقاصد درج ذیل تھے

۱- علوم اسلامیہ کے نصاب درس میں دور رس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

۲- ایسے علماء پیدا کرنا جو کتاب و سنت کے وسیع و عمیق علم کے ساتھ جدید خیالات سے بخوبی واقف اور زمانہ کے نبض شناس ہوں۔

۳- اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دینا۔

۴- اسلامی تعلیمات کی اشاعت بالخصوص برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔[۲]

ندوہ کے محرک مولوی عبد الغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تشکیل مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری نے کی۔ عربی زبان و ادب کی خدمت اس جامعہ کا امتیازی وصف ہے۔ ندوہ کی تحریک کو ترقی دینے والوں میں علامہ شبلی نعمانی بہت نمایاں رہے۔ اور اس کے قابل فخر اساتذہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا نام روشن ستارہ کی طرح جگمگاتا رہے گا۔ اسی طرح مولانا عبد السلام ندوی، مولانا عبد الباری ندوی، سید نجیب اشرف قابل فخر فرزندوں میں ہیں۔ معاصر دور میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کو

---

۱ موج کوثر ص ۱۵۳

۲ تاریخ ندوۃ العلماء ص ۵۶ مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی

کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام درسگاہوں اور دانشگاہوں کے پس منظر میں ایک علمی، دینی، فکری، اور ثقافتی تحریک تھی۔ مسلم علی گڑھ کے پیچھے سرسید کی تحریک کارفرما تھی۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور میں ولی اللہی تحریک کا سلسلہ 'قاسمیت' سے بڑھ کر 'مدنیت' تک پھیلا ہوا تھا۔ ندوہ کے قیام میں اصلاح نصاب کی فکر نمایاں تھی۔ علامہ شبلی کی سرپرستی اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی کی علمی و دینی خدمات نے اسکا نام روشن کیا اور اسے مرتبہ اور وقار بخشا۔

لیکن جیسے جیسے علمی، ثقافتی اور اصلاحی تحریکات بڑھ رہی تھیں اور انہیں مقبولیت عام حاصل ہو رہی تھی، ویسے ویسے نئے نئے فتنے بھی وجود میں آ رہے تھے۔ اپنوں میں ہی طرح طرح کے اختلافی مسائل پیدا ہو رہے تھے اور اختلافات اس حد تک پہنچ گئے کہ نئے مسلک وجود میں آ گئے۔ ان مسالک میں ایک اہم نام "غیر مقلدیت" کا تھا۔

سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی نے بدعات و خرافات کی روک تھام کی خاطر اور شیعیت کے خلاف ملک گیر جو مہم چلائی تھی، اسے جگہ جگہ ترقی مل رہی تھی اور مسلمانوں پر اس کے بے حد اہم اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ ضرورت یہ تھی کہ اسے آگے بڑھایا جاتا لیکن خانوادۂ ولی اللہی کے ہی ایک فیض یافتہ میاں نذیر حسین نے ایک نئے مسلک کی تبلیغ شروع کی۔ ہندوستان میں میاں نذیر حسین کو ہی غیر مقلدیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس تحریک نے میاں نذیر حسین اور نواب صدیق حسن خان کے دور میں سر پکڑا یہاں تک کہ ان دونوں کے شاگردوں کا مشغلہ ہی بدعات و خرافات کو روکنے کے بجائے رد حنفیت ہو گیا۔ حدیث و فقہ میں عدم تقلید کا رجحان پیدا

ہوا اور انہوں نے احناف کو چیلنج کرنا شروع کیا۔

دیوبند کا مسلک وہی رہا جو حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز کا تھا کہ حدیث کے بعد فقہ و اجتہاد کی اہمیت کے پیش نظر فقیہ امت حضرت امام ابوحنیفہ کو امام تسلیم کیا جائے۔[1] چنانچہ اہلحدیث حضرات کے جواب میں شیخ الہند، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شوق نیموی، علامہ عثمانی، مولانا ظفر احمد تھانوی نے حنفیت کی تائیدی حدیثوں کی اشاعت کی۔ علامہ عثمانی کی تصنیف "فتح الملہم" حنفی نقطۂ نظر سے صحیح مسلم شریف کی مکمل شرح ہے۔[2] اور پھر حدیث کے پورے ذخیرے خصوصاً غیر مطبوعہ حصے کی تحقیق کا خیال ہوا، جسے ہندوستان سے باہر علامہ زاہد الکوثری اور شیخ ابو غدہ نے، اور ہندوستان میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا شوق نیموی، علامہ انور شاہ کشمیری اور مولانا ظفر احمد تھانوی اور پھر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے عملی شکل دی۔

اتر پردیش کا ایک ضلع جو صرف اپنے نام ہی میں اعظم نہیں، اپنے کاموں کے ذریعہ بھی عظیم ہے۔ اس سرزمین سے ایسے غواص معانی تھے جن کے لئے ہر بحر پر آشوب پایاب تھا۔ ایک دور تو وہ گاؤں بندول کا شبلی نعمانی اپنے قلم کی توانائی سے یہ بتا چکا تھا کہ علم دین اور لکھنؤ کی میراث و جاگیر نہیں۔ کوئی خطہ ہو، کوئی گوشہ ہو، جس طرح شعاع آفتاب سے ذروں میں چمک پیدا ہوتی ہے اسی طرح معمولی جگہوں پر بھی اہل دانش و بینش وجود میں آسکتے ہیں۔

ایسے سیاسی اور علمی ماحول و فضا میں اسی سرزمین سے ۱۹۰۱ء میں ایک اور بندۂ خدا وجود میں آیا جو آگے چل کر اپنی صدی کی علمی جلالت کی علامت بن گیا۔

---

[1] مسلک علماء دیوبند ص ۷ قاری محمد طیب

[2] تاریخ دیوبند ص ۵۰۲-۵۰۳ محبوب رضوی

راقم الحروف کی نظر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مئوناتھ بھنجن اب اعظم گڈھ سے الگ ایک باختیار ضلع ہوگیا ہے، وہ کمشنری ہو جائے، وہ اتر پردیش کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز بن جائے، لیکن اہل علم کی نظر میں اصلی پہچان صرف یہی ہے کہ علامہ شبلی کے بعد یہاں ایک اور اسلامی اسکالر اور محقق پیدا ہوا تھا، جس نے حدیث نبوی کے نایاب خزانوں کو وقف عام کردیا اور علم وتحقیق کا معیار بلند کردیا۔

آئندہ صفحات میں پہلے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ انکی علمی شخصیت کے خدوخال زیادہ نمایاں ہوسکیں، پھر اس کے بعد ان کی علمی تحقیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم

سوانح حیات

باب دوم

سوانح حیات

ولادت اور نام ونسب

مولانا حبیب الرحمن بن صابر بن عنایت اللہ بن خوشی بن مشرقی اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک معروف اور قدیم قصبہ مئوناتھ بھنجن[1] میں ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے[2]۔ راقم سطور کو تاریخ پیدائش اور مہینہ کی تعیین دستیاب نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے مولانا کی سوانح میں تخمینہ اور یادداشت کی بنیاد پر ولادت کا مہینہ جمادی الآخری لکھا ہے۔ غالباً انہیں بھی تاریخ اور مہینہ کے بارے میں کوئی متیقن یا معتبر بات کا پتہ نہ چل سکا۔ شیخ عبداللہ عراقی نے تاریخی نام 'اختر حسن' رکھا[3]۔ کنیت 'ابوالمآثر' تھی اور امام اعظم ابوحنیفہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے خود کو 'اعظمی' لکھتے تھے۔

تحریری شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ خاندان مئو کے قریب "دولی"

---

[1] اعظم گڑھ اور چریاکوٹ کے بیچ میں واقع ہے۔ یہ قصبہ شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں کی جاگیر میں تھا، اسی لیے اس کا شاہی نام جہاں آباد تھا۔ یہ نام شاہی فرامین میں موجود ہے۔ (حیات شبلی ص ۵۷ سید سلیمان ندوی)

[2] حیات ابوالمآثر ص ۸۲ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

[3] ایضاً

نام کے ایک قصبہ میں آباد تھا، بعد میں مئو منتقل ہوا۔ مولانا خود تحریر فرماتے ہیں کہ

"خوشحال جد پدر مسن زادہ ای انتقال مکان کردہ بموضع مئو در محلہ پٹھان ٹولہ اقامت کرد۔"[1]

اس طرح یہ خاندان مئو میں ہی آباد ہو گیا۔

مولانا اعظمی کی نشوونما ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں دولت وثروت کا دور دور تک پتہ نہ تھا، مادی وسائل تک رسائی نہ تھی دنیوی عیش تو کیا، ضروریات زندگی بھی بڑی مشکلوں سے پوری ہو پاتی تھیں۔ مگر اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان میں دینداری، زہد وتقوی جیسی عظیم دولت ودیعت کی تھی۔ مولانا کے والد ماجد مولانا محمد صابر صاحب نہایت عابد، زاہد اور دیندار شخص تھے۔ قرآن مجید سے خاص شغف تھا، کثرت سے تلاوت فرماتے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے۔ مولانا حبیب الرحمن قاسمی مولانا صابر صاحب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

"تقریباً ۳۶ سال تک اپنے محلے کی مسجد میں بڑی عمر والوں کو فارسی اور دینیات کی تعلیم دیتے رہے، اس طویل مدت میں ایک کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔"[2]

تعلیم وتربیت

مولانا اعظمی نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اسکی فضا علم ودین سے معمور تھی ظاہر ہے ایسے ماحول میں تعلیم وتربیت پر خاص توجہ ہونا ہی تھا ایک

[1] حیات ابوالمآثر ص ۷۶
[2] ضمیمہ تذکرہ علماء اعظم گڑھ ملاحظہ ہو مولانا حبیب الرحمن قاسمی

لازمی تھی، چنانچہ والد محترم نے ان کا خاص نظم کیا اور قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں۔ تجوید کا ایک منظوم رسالہ مولانا عبدالحق جیلی حقی کے پاس پڑھا اور اسے زبانی یاد کرلیا۔ مولانا عبدالرحمن مئوی کے پاس فارسی کی دیگر کتابیں پڑھیں۔ مولوی عبدالعزیز مئوی اور ایک دوسرے مولانا محمد صابر صاحب (ساکن محلہ بلدی پورہ مئو) سے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

گھریلو اور ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا ابوالحسن عراقی کی خدمت میں پہونچے اور صرف ونحو کی مختلف کتابیں آپ سے پڑھیں، یہیں رہکر صرف ونحو میں خصوصی درجہ کی صلاحیت پیدا کی۔ مزید حصول علم کی خاطر مولانا عبدالغفار صاحب مئوی جو اس دور میں علم وفن کے سرچشمہ سمجھے جاتے تھے، کی خدمت میں مدرسہ انجمن اسلامیہ گورکھپور میں حاضر ہوئے۔ مولانا اعظمی اس سلسلہ میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ

> ۱۹۱۲ء میں   میں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کے ساتھ گورکھپور چلا گیا اور اپنے مناسب حال درس نظامی کی کتابوں میں شامل ہوگیا۔[1]

۱۹۱۷ء میں جب مولانا عبدالغفار صاحب بنارس منتقل ہوئے تو مولانا اعظمی بھی مدرسہ مظہر العلوم بنارس جا پہونچے اور اکتساب فیض میں مصروف ہوگئے۔ مولانا نے مولانا عبدالغفار صاحب سے ادب، بلاغت، فقہ اور حدیث میں مشکوۃ شریف اور ترمذی نصف اول تک پڑھی۔ مظہر العلوم بنارس میں قیام کے دوران اس زمانے کے سخت ترین امتحان جو الہ آباد بورڈ کی طرف سے منعقد ہوتے تھے "ملا" ۱۹۱۸ء اور "ملا فاضل" مارچ ۱۹۱۹ء میں شریک ہوئے اور دونوں امتحانوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

---

[1] تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۹ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

مولانا اعظمی دارالعلوم دیوبند میں

مزید علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کے لئے مولانا نے دیوبند کا رخ کیا، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"شوال ۱۳۳۷ھ غالباً جولائی ۱۹۱۹ء میں میں دارالعلوم میں پہلی بار داخل ہوا۔"[1]

مگر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ دیوبند میں فصلی بیماری پھیل گئی۔ بیماری نے اس قدر زور پکڑا کہ پورا شہر اس کی زد میں آگیا۔ خود مولانا بھی اس کے شکار ہوئے اور دوران سال ہی دیوبند سے واپس ہونا پڑا۔ جیسا کہ مدارس کے طلبہ میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ دیوبند پہونچ کر براہ راست وہاں کے علمی وروحانی چشموں سے سیراب ہوں، اسی طرح کی خواہش اور شوق مولانا اعظمی میں دوبارہ دیوبند جانے کا داعیہ پیدا کر رہا تھا، آخر کار ایک بار پھر رخت سفر باندھا اور ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اس مرتبہ امتحان داخلہ میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور دارالعلوم میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔

لیکن مقدر کچھ اور ہی تھا۔ اس سال بھی بخار آگیا دوسری طرف تحریک "ترک موالات" کا بھی پورے ملک میں زور تھا چنانچہ اس سال بھی آپ کو وطن لوٹ آنا پڑا۔ مولانا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان حالات سے والد صاحب بہت متوحش اور پریشان تھے، چاہتے تھے کہ واپس ہو جاؤں، اسی اثناء میں مجھے اس سال بھی بخار آگیا والد صاحب نے اطلاع پاتے ہی لکھ بھیجا کہ تم مہتمم صاحب سے رخصت لے کر مکان چلے آؤ چنانچہ صفر یا ربیع الاول ۱۳۴۰ھ میں میں چلا آیا۔"[2]

---

[1] تذکرہ نعمانی ص ۱۰ [2] ایضاً ص ۴۴

دورۂ حدیث | دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر اپنے ہی قصبہ کے قدیم مدرسہ دارالعلوم مئو میں دورۂ حدیث شریف میں داخلہ لیا۔ اس وقت دارالعلوم میں حضرت شیخ الہند کے مایہ ناز شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلی شیخ الحدیث وصدر مدرس کے عہدہ پر فائز تھے۔ آپ نے دورۂ حدیث کی تکمیل مولانا سنبھلی ہی کے پاس کی اور ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں سند فراغ حاصل کی۔

اسناد حدیث | دینی واسلامی علوم وفنون میں سند کی اہمیت کے پیش نظر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اعظمی کی سندوں کو ذکر کر دیا جائے کہ کس طرح سے ان تک علم حدیث پہونچا۔ مولانا صحیح بخاری کی سند خود یوں بیان فرماتے ہیں کہ،

> "صحیح بخاری میں نے حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی سے انہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے، انہوں نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے، انہوں نے مولانا عبدالغنی مجددی سے، انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب سے، شاہ محمد اسحٰق صاحب نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے والد شاہ ولی اللہ صاحب[1] سے پڑھی پائی۔"[2]

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو صحاح اور دیگر کتب حدیث کی اجازت آپ کے مشفق استاد محترم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب سے بھی حاصل تھی۔ وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مولانا اعظمی اس سند کا ذکر

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم بن حسن کردی مدنی سے اجازت حاصل ہے، تفصیل کے لئے حضرت شاہ صاحب کی "ارشاد الی مہمات الاسناد"، حضرت شاہ عبدالعزیز کی العجالۃ النافعہ اور شیخ محسن ترہتی کی الیانع الجنی ملاحظہ ہو

[2] المآثر ج ۳ ص ۱۴۱

اجازت یوں کرتے ہیں

"وقد اجازني الشيخ المذكور مولانا عبد الغفار مشافهة بجميع ما يصح له روايته عن شيوخه مولانا رشيد احمد الكنكوهي ومولانا اشرف علي التهانوي ومولانا عبد الحق وغيرهم رحمهم الله عن كتب الصحاح والجوامع والسنن والمسانيد والمسلسلات وغيرها من مجاميع الحديث والأوراد والأذكار وغيرها "[1]

(مجھ کو مولانا عبد الغفار صاحب نے جن کو مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا عبد الحق وغیرہ سے اجازت حاصل تھی، کتب صحاح، جوامع، سنن، مسانید، مسلسلات وغیرہ کے ساتھ حدیث اور اوراد واذکار کے دیگر مجموعوں کی زبانی اجازت دی۔)

مذکورہ بالا سندوں کے علاوہ مولانا الاعظمی کی ایک اور سند ہے۔ آپ کو مولانا عبد الرحمن صاحب بھوپالی کے واسطہ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے۔ مولانا عبد الرحمن بھوپالی مولانا عبد القیوم صاحب کے شاگرد تھے اور مولانا عبد القیوم صاحب حضرت شاہ محمد اسحق صاحب دہلوی کے شاگرد ہیں اور حضرت شاہ صاحب کی سند مشہور ہے۔ چنانچہ یہ سند مذکورہ دونوں سندوں سے عالی ہوئی۔

اساتذہ

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کو جن اساتذہ اور اہل علم سے استفادہ کا موقع ملا وہ نادرۂ روزگار شخصیات تھیں۔ ہر ایک علم وفن کا امام اور مرجع خلائق تھا۔ جی چاہتا ہے

---

[1] رسالۃ الاوائل مرتبہ شیخ محمد سعید بن سنبل مکی

کہ علوم وفنون کی بساط پر تابندہ نقوش چھوڑنے والی ان شخصیت کا ذرا اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ضرور ہو، تاکہ بخوبی یہ اندازہ ہو سکے کہ مولانا کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت کیسے ماحول اور کن لوگوں کے ہاتھوں ہوئی، چنانچہ ان اساتذہ کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالغفار عراقی مئوی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت مئو میں ہوئی، حصول علم کے لئے آپ کا پہلا سفر "نوانگر" ضلع بلیا کا ہوا۔ مزید علم کی پیاس بجھانے کے لئے غازیپور، مرزاپور اور لکھنؤ کا سفر کیا۔ آپ کے مشہور اساتذہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض اللہ مئوی، شیخ عبدالحق الہ آبادی، مولانا امام الدین پنجابی تھے۔ علم حدیث حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن تھوڑے ہی دن گزرے ہوں گے کہ حضرت فرنگی محلی کا انتقال ہوگیا، اس لئے اس سعادت سے محروم رہ گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ ہی میں رہ کر آپ نے حکیم باقر حسین سے علم طب سیکھا اور اس میں مہارت پیدا کی۔ پھر ۱۳۰۵ھ میں گنگوہ کا سفر کیا، وہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے صحاح ستہ پڑھی اور اجازت حدیث حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ نے سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا۔ ایک زمانہ تک مرج گنج (بنگال) میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد آپ کو مدرسہ "انوار العلوم" نوانگر ضلع بلیا میں تدریسی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ۱۳۲۲ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور شیخ عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی سے اجازت حدیث حاصل کی۔[1] مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بھی آپ مدرس رہے۔

آپ کی مشہور تصنیف میں غرائب البیان فی مناقب النعمان، مسلک ہدایہ فی الحج والعمرہ، اہم المحققین فی تعدیل ائمۃ المتبوعین، حبیب الاتقیاء فی

---

[1] نزہۃ الخواطر ۸ ص ۲۷۹ مولانا سید عبدالحی الحسنی

مسائل الاضاحی در کشف المکنون وغیرہ ہیں۔ مولانا الاعظمی نے آپ سے سب سے زیادہ کسب فیض کیا۔

مولانا کریم بخش سنبھلی | شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے شاگرد تھے۔ ۱۳۱۷ھ میں شیخ الہند سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس اور دینی درسگاہوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں صدارت تدریس کی ذمہ داری سونپی گئی جسکو آپنے بخوبی نبھایا، اسکے بعد دارالعلوم مئو میں بحیثیت صدر مدرس وشیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ آپ ایک جید استعداد عالم تھے۔ آپ کے مایہ ناز شاگردوں میں مولانا سید فخر الدین احمد (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا عبد اللطیف نعمانی، مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ تھے ۱۳۶۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

علامہ انور شاہ کشمیری | شوال ۱۲۹۲ھ میں صوبہ کشمیر کے دودھوان نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ میں دیوبند کا سفر ہوا اور ۱۳۱۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے سند فراغ حاصل کی۔ پھر آپ مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ ایک مدت تک وہاں قیام رہا۔ ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوئے، پھر جب ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہند سفر حج پر جانے لگے تو آپ کو اپنا جانشین منتخب کیا اور دارالعلوم کی صدر مدرسی کی ذمہ داری سونپی جس کو علامہ کشمیری نے بحسن وخوبی نبھایا۔

۱۳۴۶ھ میں بعض اختلافات کے سبب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے، تشنگان علم نے اس موقع کو نعمت غیر مترقبہ جانا اور اس سرچشمۂ علم وفن سے خوب خوب مستفیض ہوئے، اور بالآخر ۱۳۵۲ھ کو یہ آفتاب علم دیوبند میں غروب ہو گیا۔

علامہ کشمیری کو علم حدیث سے والہانہ وابستگی تھی۔ حدیث اور متعلقات حدیث میں انکا پایہ بہت بلند تھا۔ قوت حافظہ اور ذہانت شہرۂ آفاق تھی، علوم وفنون پر

اس قدر مضبوط گرفت تھی کہ عقلیں حیران رہ جاتیں، انہیں تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا کہ ان جیسے (علامہ کشمیری) کا امت اسلامیہ میں وجود ہی اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ایک سچا اور برحق مذہب ہے۔[1]

علامہ کشمیری کی تالیفات وتصنیفات اور درسی افادات کثیر تعداد میں ہیں جن میں مشکلات القرآن، عقیدۃ الاسلام، العرف الشذی، اور فیض الباری کو کافی شہرت حاصل ہوئی، مولانا الاعظمی نے علامہ کشمیری سے ترمذی، جلد اول کتاب الحج تک پڑھی۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء کو بجنور میں پیدا ہوئے، ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ فراغت کے بعد علامہ عثمانی نے ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۴۵ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم دی، ۱۳۴۶ھ میں ڈابھیل تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۵۲ھ میں علامہ انور شاہ کشمیری کی وفات کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے شیخ الحدیث منتخب ہوئے[2] اور پھر ۱۳۶۶ھ میں پاکستان ہجرت کر گئے۔

آپ کے عظیم کارناموں میں شیخ الہند کے ترجمہ قرآن پر 'حواشی' اور مسلم شریف کی حنفی نقطۂ نظر سے شرح 'فتح الملہم' ہیں۔ دنیائے اسلام میں ان دونوں کاموں کی زبردست پذیرائی ہوئی، ۱۳۶۹ھ میں انتقال فرما گئے۔ مولانا الاعظمی نے آپ سے 'مسلم شریف' از اول تا کتاب الزکوۃ پڑھی۔

مفتی عزیز الرحمن عثمانی ۱۲۷۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، آپ زبردست صلاحیتوں کے مالک تھے جب دارالعلوم میں آپ کا تقرر ہوا تو فتویٰ نویسی کی بھی ذمہ داری سونپی گئی، ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مقرر ہوئے، دوران قیام دارالعلوم آپ کے فتاویٰ کی تعداد

---

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۱۰ علامہ انور شاہ کشمیری تحفۃ العنبر ص ۲۱۳ مولانا محمد یوسف بنوری
[2] تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل ص ۲۹۷ مولانا افضل رحمن

یک لاکھ اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ ہے[1] مولانا سید محمد میاں لکھتے ہیں

"آپ کے بعد دارالعلوم دیوبند کو آپ جیسا مفتی اب تک میسر نہیں ہوا، اور مستقبل قریب میں کوئی توقع بھی نہیں۔"[2]

۱۳۴۷ھ میں وفات ہوئی، مولانا اعظمی نے مفتی صاحب سے جامع کے کچھ اسباق پڑھے۔

مولانا اصغر حسین دیوبندی | ۱۲۹۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے، ۱۳۳۳ھ کی دارالعلوم کی روداد میں انکی نسبت لکھا ہے

"مولوی صاحب کو علوم دینیہ حدیث، تفسیر، فقہ، فرائض اور تاریخ وغیرہ میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت و استعداد حاصل ہے، آپ صاحب تصانیف بھی ہیں آپ ایک صاحب ورع و تقویٰ عالم باعمل اور سلف کا نمونہ اور ان کے صحیح خلف ہیں۔"[3]

۱۳۶۴ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اردو عربی میں فقہ، فرائض اور تاریخ وغیرہ کے موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۳۵ کتابیں مولانا کی یادگار ہیں مولانا اعظمی نے آپ سے سنن ابوداؤد کتاب الصلوۃ تک پڑھی۔

مولانا حکیم محمد حسن دیوبندی | حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی تھے، انکی نسبت ۱۳۳۳ھ کی روداد دارالعلوم میں درج ہے

"دارالعلوم کو ایک ایسے عالم کی ضرورت تھی جو علوم دینیہ کے علاوہ طب کی تعلیم بھی دے سکے اور حسب ضرورت طلبہ کی مدارات بھی کر سکے۔"

---

[1] تذکرۂ اکابر ص ۹۳ مولانا حافظ محمد دین قاسمی

[2] علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ۱.۲۲۹ سید محمد میاں

[3] تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲/ ۹۰ محبوب رضوی

ضرورت کے تحت ۱۳۰۲ھ میں انکا تقرر ہوا اور اس وقت سے برابر ہر قسم کی درسی کتب کے درس میں مشغول ہیں، اور اسی کے ساتھ تعلیم طب اور مطب کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔"[1]

۱۳۳۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

مولانا رسول خاں ہزاروی ۱۲۸۸ھ میں ولادت ہوئی ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، مدرسہ دارالسلام میرٹھ میں آپ صدر مدرس رہے، تقریباً ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۵۳ھ تک دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۵۳ھ میں اورینٹل کالج لاہور میں شعبۂ عربی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور یہیں سے ریٹائر ہوئے، ۱۳۹۱ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ مولانا اعظمی نے بیضاوی شریف کا کچھ حصہ آپ سے پڑھا۔

مولانا ابوالحسن مئوی ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے، مولانا عبدالغفار صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، مولانا عبدالغفار صاحب ہی کی خدمت میں رہ کر علوم وفنون حاصل کیا۔ صحاح ستہ حضرت گنگوہی سے پڑھ کر اجازت حدیث یا سند فراغ سے سرفراز ہوئے، مولانا کو فتویٰ نویسی اور علم الفرائض میں ملکہ تامہ حاصل تھا، رد بدعات میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، اس فن میں آپ کی تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں، جن میں القرائض، الجواب المحمود قابل ذکر ہیں[2] ۶۵ برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، مولانا اعظمی نے آپ ہی سے صرف ونحو کی تعلیم حاصل کی۔

مولانا محمد صابر مئوی ۱۲۸۶ھ میں ولادت ہوئی، تکمیل علوم کے بعد دارالعلوم مئو میں مدرس مقرر ہوئے، بعد ازاں مظہر العلوم بنارس میں آپ نے تدریسی ذمہ داریاں

---

1. تاریخ دارالعلوم دیوبند ۲؍۳۹
2. تذکرہ علماء اعظم گڈھ ص ۲۸ مولانا حبیب الرحمن قاسمی

سنبھالیں، مولانا نے آسان فارسی قواعد پر مشتمل ایک کتاب تصنیف فرمائی جسکا نام "نظام الفوائد" رکھا، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، ۱۹۳۹ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

تعلیمی و تدریسی سرگرمیاں

دیوبند سے واپسی پر مظہر العلوم بنارس میں ۱۳۳۸ھ م ۱۹۲۰ء سے ۱۳۳۹ھ تک کی مدت تدریس کو اگر چھوڑ دیا جائے تو مولانا اعظمی کی تدریسی مہم کا باقاعدہ آغاز ۱۳۴۰ھ سے ہوتا ہے۔ ۱۳۴۰ھ میں جب دارالعلوم مئو سے فارغ ہوئے تو یہیں پر درجۂ علیا کے مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا، مولانا نے یہاں دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھائیں، تقریباً تین سال تک دارالعلوم مئو میں درس دیتے رہے۔ ۱۳۴۳ھ میں صدر مدرس کی حیثیت سے مظہر العلوم بنارس کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۷ھ تک مظہر العلوم میں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز رہے اور ۱۳۴۷ھ میں آپ نے یہاں سے استعفٰی دے دیا[1]

بنارس سے واپسی پر استاذ محترم مولانا ابوالحسن مئوی کی خواہش پر مفتاح العلوم مئو میں تشریف لائے[2] مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی مفتاح العلوم میں

---

[1] مظہر العلوم کے ناظم مدرسہ "حی علی الصلوۃ" پر کھڑے ہونے کے فتویٰ پر مولانا سے دستخط کرانا چاہتے تھے، اس کے بدعت ہونے کی وجہ سے مولانا نے دستخط سے انکار کر دیا اور مدرسہ سے استعفٰی دے دیا۔ (حیات ص ۱۵۲)

[2] مدرسہ مفتاح العلوم قدیم شاہی مسجد میں قائم ہوا تھا، جامع مسجد شہزادی جہاں آرا بنت شاہ جہاں نے تعمیر کرائی تھی۔ (حیات شبلی ص ۵۷) لیکن بعد میں اس شاہی مسجد کو شہید کر کے اسکی جگہ ایک وسیع و عریض مسجد تعمیر کی گئی۔

اپنی تقرری کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں

"جب میں بنارس چھوڑ کر مئو آیا تو مولانا ابوالحسن صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے باصرار تمام مدرسہ مفتاح العلوم میں بٹھا دیا۔"[1]

مولانا کا تقرر شیخ الحدیث وصدر مدرس کے عہدہ پر ہوا تھا۔ مفتاح العلوم سے عرصۂ دراز تک وابستہ رہے، تقریباً بائیس سال تک اس مدرسہ کو اپنی بیش بہا خدمات پیش کیں، مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں

"اس وقت (۱۳۴۷ھ) سے لے کر ۱۳۶۹ھ تک برابر مفتاح العلوم کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس رہے، اور بلا ناغہ ہر سال یہاں دوسری کتابوں کے ساتھ دورۂ حدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے رہے، عام طور پر آپ کے یہاں بخاری شریف مکمل اور ترمذی شریف مکمل ہوا کرتی تھی۔"[2]

مولانا ایوب صاحب کی نظامت سے سبکدوشی کے بعد مولانا الاعظمی مفتاح العلوم مئو کے ناظم منتخب کئے گئے۔ اس ذمہ داری کو بھی بحسن وخوبی چھ سال تک نبھایا۔ مولانا عبداللطیف نعمانی مفتاحی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے ۱۳۶۶ھ سے ۱۳۷۱ھ تک نظامت کا عہدہ بھی سنبھالا۔"[3]

اگرچہ ۱۳۶۹ھ میں بعض مصالح کی بناء پر مدرسہ کی تدریسی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، لیکن مفتاح العلوم کی بقا اور ترقی کے لئے مولانا نے جس

---

[1] تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۵۶

[2] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۴۴

[3] مفتاحی ڈائری ۱۳۹۷ھ بحوالہ حیات ابوالمآثر ص ۱۶۵

قدر جتنی کوششیں کیں اور جتنی صعوبتیں برداشت کیں ور فریفتگی کی حد تک آپ کو جو اس سے تعلق تھا، تاریخ کے وراق میں ایسے پیوست ہیں کہ انھیں کھرچ کر مٹایا نہیں جا سکتا۔ جب کبھی بھی مفتاح العلوم کو کسی طرح کی ضرورت محسوس ہوئی مولانا اعظمی نے خود کو اس ضرورت کو پورا کرنے کا سب سے زیادہ مستحق سمجھا، اس مدرسہ میں تصنیف وتالیف کا شعبہ مولانا کی ہی سرپرستی میں قائم ہو۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب مختلف وقات میں مختلف انداز سے مفتاح العلوم سے وابستہ رہے، حالانکہ بین الاقوامی مؤقر اداروں اور جامعات کی طرف سے مسلسل مولانا کو ونچے ونچے مشاہروں پر دعوت تدریس دی جاتی رہی لیکن چونکہ خود کو مفتاح العلوم کے لئے وقف کر رکھا تھا س لئے آپ کی طرف سے ہمیشہ انکار ہی رہا۔ مولانا عبداللطیف نعمانی کے جنوری ۱۹۷۳ء میں انتقال کر جانے کے بعد پھر مولانا اعظمی کو صدر مدرس اور ناظم کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ مولانا مفتاح العلوم سے ۱۹۷۵ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بعض اسباب کی بناء پر مکمل طور پر علیحدگی اختیار کرلی۔

المعہد العالی اور مرقاۃ العلوم کا قیام مفتاح العلوم سے جب علیحدہ ہوئے تو اپنے تحقیقی وتصنیفی کاموں میں پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ مشغول ہوگئے۔ لیکن مزاج چونکہ درس وتدریس کا تھا اور نئے فارغ التحصیل طلبہ کی صلاحیت واستعداد دیکھ کر کچھ تشویش بھی لاحق تھی، اس لئے مولانا نے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے مختلف علوم وفنون میں بحث وتحقیق کرانے کی غرض سے "المعہد العالی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا شیخ نذیر حسین کے نام مولانا کے ایک مکتوب میں "المعہد العالی" کے لائحۂ عمل یا نصب العین کی وضاحت ہوتی ہے، مولانا اعظمی تحریر فرماتے ہیں

"میں اس سال صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس تبرعاً دے رہا ہوں، ہمارے یہاں اس سال بارہ لڑکے دورۂ حدیث میں ہیں، ان میں چند لڑکے ایسے ہیں جن کو آئندہ سال "المعهد العالي للدراسات الاسلامية" میں داخل کر کے ان کی علمی تربیت کا ارادہ ہے، اور تربیت کے بعد انہیں سے مدرسہ میں معیاری تعلیم و تعلیم کے نظم و نسق کا کام لینے کی نیت ہے"۔[1]

لیکن یہ ادارہ تین چار سال سے زیادہ نہ چل سکا، چونکہ طلبہ حسب منشا معیار پر کھرے نہیں اترتے تھے اس لئے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ المعہد العالی کے ساتھ ایک مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی جس کا نام مرقاۃ العلوم رکھا۔ مولانا نے یہاں دورۂ حدیث تک کی تعلیم کا نظم کیا۔ دورے کی بعض کتابیں خود بھی پڑھاتے۔ الحمدللہ اس وقت یہ مدرسہ صوبائی نہیں بلکہ اتر پردیش کے مشہور علمی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس وقت اس مدرسہ کے ناظم مولانا اعظمی کے صاحبزادہ محترم جناب مولانا رشید احمد صاحب اعظمی مدظلہ ہیں۔

تلامذہ

چونکہ مولانا کا محبوب مشغلہ علم دین کی اشاعت اور درس و تدریس تھا، پوری زندگی ہی تعلیم و تدریس کے لئے وقف تھی، ظاہری بات ہے کہ اس دوران بے شمار طلبہ کو استفادہ اور کسب فیض کا موقع ملا ہوگا اور بہت سے علم کے شیدائیوں کو شرف تلمذ حاصل ہوا ہوگا جن کا شمار مشکل اور وقت طلب امر ہے۔ البتہ چند مشہور اور مخصوص حضرات جو آپ کے کیسۂ فیض سے مستفیض ہوئے ان کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں

[1] معارف ص ۳۷۷ نومبر ۱۹۹۲ء

(۱) مولانا عبدالجبار مئوی شیخ الحدیث مظہر العلوم بنارس

(۲) مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان

(۳) مولانا محمد حسین بہاری استاذ دارالعلوم دیوبند

(۴) مولانا محفوظ الرحمن نامی بانی مدرسہ نورالعلوم بہرائچ

(۵) مولانا عبدالستار معروفی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۶) مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء و مدیر تحریر البعث الاسلامی

(۷) مولانا محمد ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

(۸) مولانا ضیاء الحسن مئوی سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۹) مولانا عبدالرشید مئوی سابق صدر مفتاح العلوم مئو

بیعت وسلوک

تزکیۂ نفس کے لئے مولانا اعظمی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے۔ یہ مولانا اعظمی کی خصوصیت تھی کہ حضرت تھانویؒ نے انہیں دورطالبعلمی میں بیعت کیا تھا۔[۱] حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ اجل حضرت مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بھی مولانا کے دیرینہ تعلقات تھے، حضرت شاہ صاحبؒ ہی سے آپ کو اجازت وخلافت حاصل تھی۔[۲] شاہ صاحبؒ کے

---

[۱] اس موقع پر مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ نے خواجہ صاحب کے ذریعہ مولانا اعظمی سے مٹھائی کی فرمائش کی تھی، کیونکہ حضرت تھانویؒ نے خلاف معمول انہیں بیعت کیا تھا۔ (مقدمہ تذکرہ مصلح الامت حصہ اول)

[۲] حیات ص ۵۰۹، دارالعلوم اپریل ومئی ۱۹۹۲ء ص ۱۷۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا اعظمی مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے بیعت نہیں تھے، جیسے کہ بعض مصنفین لکھتے ہیں، بلکہ حضرت شاہ صاحب نے مولانا کو خلافت تفویض کی تھی۔ راقم سطور اس معاملے

علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ قاری مشیر الدین صاحب سے بھی مولانا کو اجازت وخلافت حاصل تھی۔[1]

سیاسی وسماجی سرگرمیاں

مولانا کا مزاج خالص علمی ودینی تھا۔ یکسوئی کے ساتھ خام سفالہ پوش مکان میں بحث وتحقیق میں ہمہ تن منہمک رہتے، مگر اسکا مطلب یہ نہ تھا کہ گردوپیش سے کبھی بھی غافل رہے ہوں، اور جب قوم وملت کو سیاسی وسماجی کسی بھی طرح کی ضرورت پیش آئی ہو، پیچھے رہے ہوں۔ سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مسلک سے قریب تھے۔[2]

مولانا محمد حنیف ملی مولانا اعظمی کے سیاسی نقطۂ نظر کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے سیاسی رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمن، رفیع احمد قدوائی نے جس طرح معاہداتی سیاست سے کنارہ کش ہوکر عملی سیاست کو دائرۂ کار بنایا یہی عملی مثال حضرت مولانا اعظمی نے بھی قائم فرمائی، دارالعلوم دیوبند کی جب تلاشی ہوئی اور یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ یہ سیاسی طور پر پاکستانیوں کی پناہ گاہ ہے اور یہاں پاکستانی ٹرانسمیٹر نصب ہے، تو مولانا اعظمیؒ نے بذات خود اسکی تردید کی اور حکومت کے ذمہ داروں کی توجہ اسکی طرف مبذول بھی فرمایا (کذا)۔''[3]

= میں جناب مولانا رشید احمد صاحب اعظمی کا شکر گزار ہے کہ ان کے توسط سے یہ بات معلوم ہوئی۔

[1] ترجمان الاسلام، ۱۰-۱۲ ص ۲۳۳، دارالعلوم اپریل ومئی ۱۹۹۲ء

[2] معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۱ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۳۴

[3] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۲-۲۲۳

اسمبلی کی رکنیت | ۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے بعد پہلا عام انتخاب ہندوستان میں ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اس دور میں کمیونزم کی لہر عام تھی، باشندگان ملک پر اس کے بڑے گہرے اثرات نمایاں تھے، مئو میں بھی کمیونسٹ پارٹی حاوی تھی، میدان میں نو (۹) امیدوار تھے، کانگریس کو بڑی مشکلوں کا سامنا تھا، اسے ایک مضبوط امیدوار کی تلاش تھی۔ امیدواری کے لئے پیش کی جانے والی درخواستوں پر کانگریس کی اعلیٰ کمان کو پورا اعتماد نہ تھا، آخرکار بساط سیاست پر شطرنجی چال چلنے والوں کی عقابی نگاہ مولانا پر پڑی جن کی شخصیت کی سحر انگیزی کو ماہرین سیاست نے بھانپ لیا تھا، چنانچہ لوگوں کے شدید اصرار اور وقت کے اہم تقاضوں کی بنا پر مولانا اسمبلی کی رکنیت کے لئے امیدوار بنائے گئے اور چھ ہزار ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ مولانا ایک مرتبہ بھی اپنے حلقۂ انتخاب میں کنویسنگ کے لئے نہیں گئے۔

ممبری کے دوران درس وافادہ | اسمبلی کی مدت رکنیت کے دوران مولانا اعظمی کا قیام زیادہ تر مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے قائم کردہ دارالمبلغین میں رہا، سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہونے کے بجائے درس وافادہ جاری رکھا، اسی دوران ندوے کے شیخ الحدیث محمد حلیم عطا کا انتقال ہوگیا، اب اس خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے سب کی نگاہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی رکن اسمبلی پر پڑی، مولانا علی میاں صاحب نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی اور مولانا اعظمی انکار نہ کرسکے۔ مولانا سعید الرحمن اعظمی مہتمم ندوۃ العلماء اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فما استطاع المحدث الأعظمي أن يرفض طلب سماحة
العلامة الندوي وأبدى استعداده لذلك خلال إقامته في
لكناؤ مما بعث السرور في النفوس أساتذة وطلابا، وبعد
تولى فضيلة الشيخ عمران الندوي رحمه الله عميد

دار العلوم يوسد ترتيب دروسه وإقامته في دار العلوم وبدأ العلامة الأعظمي يدرس صحيح البخاري في السنة النهائية للاختصاص في الشريعة الإسلامية [1]

(علامہ ندوی کی اس پیش کش پر محدث اعظمی سے انکار نہ ہو سکا، ور لکھنؤ میں قیام کے دوران اس خدمت کے لئے راضی ہوگئے، اساتذہ و طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، دار العلوم ندوہ کے مہتمم مولانا عمران ندوی کو حضرت کی ترتیب اور آپ کے قیام کی ذمہ داری سونپی گئی، علامہ اعظمی فضیلت کے آخری سال کے طلبہ کو بخاری شریف کا درس دینے لگے۔)

۱۹۵۷ء میں جب رکنیت کی مدت پوری ہوگئی تو مولانا اپنے وطن مئو واپس آگئے۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک ندوہ میں باضابطہ بخاری کا درس دیا۔ اس طرح مولانا کا یہ سیاسی سفر بھی درس حدیث، مطالعہ کتب اور علم کے فروغ میں ہی گزرا۔

امیر الہند: ۱۹۳۵ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس میں امارت شرعیہ کے مسئلہ پر علماء نے باہم غور و فکر کیا، تقریباً سبھی کا یہ خیال تھا کہ امارت شرعیہ کا قیام ہندوستان میں ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ متفقہ طور پر اس مسئلہ کی تکمیل ہو پاتی، علماء بہار نے فقہی دلائل و براہین کی بنیاد پر اس سے اختلاف کیا، چنانچہ کسی فیصلے کے بغیر اجلاس ختم ہوا۔ اس وقت سے مسلسل جمعیۃ علماء ہند امارت شرعیہ کی شکل میں مسلمانوں کے ایک نقطۂ مرکزیت کی تلاش میں تھی، چنانچہ ۱۹۸۶ء میں پھر جمعیۃ علماء ہند نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور اس مرتبہ اہل علم و دانشوران قوم کے متفقہ فیصلے سے مولانا حبیب الرحمن اعظمی کو "امیر الہند" منتخب کیا گیا۔ حسن اتفاق یہ کہ مولانا اس اجلاس میں شریک بھی نہ تھے، مولانا سید اسعد مدنی موجودہ صدر جمعیۃ علماء ہند نے نیابۃً وکالت کی بیعت لی۔

---

[1] البعث الاسلامی عدد ۹ جلد ۳۷ ص ۸۹

صدر جمہوریہ ایوارڈ مولانا حبیب الرحمن صاحب کے تبحر علمی اور تحقیقی خدمات کو تقریباً ہر حلقہ میں سراہا گیا اور داد و تحسین دی گئی، اسی کی ایک کڑی صدارتی ایوارڈ ہے۔ حکومت ہند نے علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۲ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔ اس وقت ہندوستان کے صدر گیانی ذیل سنگھ تھے۔

مؤقر عالمی اداروں اور تنظیموں کی رکنیت یوں تو مولانا ملکی و عالمی سطح پر بہت سی تنظیموں کے رکن، مختلف اداروں اور یونیورسٹیوں کے ممتحن اور متعدد بورڈ آف ایجوکیشن کے ممبر کی حیثیت سے رہے۔ لیکن یہاں پر طوالت کے خوف سے دوچار کے ذکر پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مولانا کو جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کا رکن منتخب کیا، مولانا اعظمی جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس میں شریک ہوتے رہے اور اپنی ذمہ داریوں کو برابر نبھاتے رہے۔ ۱۳۷۲ھ م ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب کئے گئے، مجلس میں آپ کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ آپ ہی کی زیر صدارت مجلس شوریٰ منعقد ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس انتظامی (Executive Council) کے ممبر ہوئے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی رکن رکین رہے۔ ایک مرتبہ جب حکومت ہند نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی ٹھانی تو مولانا نے بڑے ہی شد و مد کے ساتھ اس تبدیلی کی مخالفت کی اور ۵/ مارچ ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے خلاف نصاری لائبریری خیرآباد کی طرف سے منعقد ہونے والے جلسۂ عام میں شریک ہوئے اور قرآن مجید کی پندرہ آیتوں سے ثابت کیا کہ: ''اسلامی شریعت خدا کی نازل کردہ ہے، اسلامی قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور مسلم پرسنل لا حق تعالیٰ کا وضع کیا ہوا ہے۔''[1]

---

[1] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۲۸

۱۹۸۹ء میں عراق کے مشہور علمی ادارے "المجمع العلمی عراقی" نے مولانا کو اپنا رکن بنایا۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی نصاب کمیٹی کے رکن رہے، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک کے شعبۂ تخصص فی الحدیث کے سرپرست رہے اور اس کا نصاب بھی آپ ہی نے تشکیل دیا۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی وقف کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔[1]

اسفار

مولانا نے بیرون ملک سب سے پہلا سفر مقدس سرزمین کی طرف کیا اور حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ مولانا اعظمی کو یہ سعادت آٹھ مرتبہ نصیب ہوئی۔ علم کی تلاش اور تحقیق وجستجو کی خاطر دمشق[3]، حلب، لاذقیہ، جبلہ، بیروت، صیدا، بعلبک اور قاہرہ وغیرہ بلاد عربیہ کا سفر کیا۔ ملک سے باہر آخری سفر ۱۹۸۷ء میں ہوا، یہ سفر حج کے لئے ہوا تھا۔ مولانا کے یہ اسفار خالص علمی اور تحقیقی تھے۔

وفات

"کلُّ من علیها فان" کے قاعدہ اور ضابطہ کے تحت ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ م ۱۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو رحمن نے اپنے حبیب کو اس منزل پر پہونچا دیا جو مومن کی

---

[1] تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ص ۲۵۰ فضل الرحمن اعظمی

[2] معارف اپریل ۱۹۹۲ء ص ۳۱۱

[3] دمشق کی تعمیر یا سے آباد کرنے کے سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں، منجملہ اقوال میں سے ایک قول وہب بن منبہ کا ہے، ان کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کے حبشی غلام نے دمشق کو آباد کیا تھا، نمرود بن کنعان نے حضرت ابراہیم کو اس وقت یہ غلام عطا کیا تھا، جب آپ آگ سے محفوظ نکل آئے تھے۔ اس غلام کا نام دمشق تھا، چنانچہ اسی کے نام پر یہ شہر آباد ہوا۔ (تہذیب تاریخ دمشق الکبیر ۱: ۱۵-۱۶ شیخ عبدالقادر بدران)

معراج ہوتی ہے۔ اور جہاں بے ساختہ یہ آیت شریفہ یاد آجاتی ہے "یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ"

دوسرے دن ۲ مارچ کو ظہر کے بعد مئو کے وسیع ترین ریلوے میدان میں جنازہ کی نماز ادا کی گئی اور بے شمار سوگواروں کے ہاتھوں سپرد خاک کئے گئے۔

حدیث کے اس خدمت گزار کی مقبولیت اور لوگوں کے دلوں میں انکے احترام کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ مولانا کے انتقال سے عالمی پیمانہ پر علمی دنیا کو صدمہ پہونچا، انکے انتقال پر ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ مشاہدین اور لوگوں کی تعداد نہ جانے کہاں سے بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید انتظامیہ کو کافی دقتوں کا سامنا ہوتا۔ جنازہ میں شریک لوگوں کی تعداد کے بارے میں عربی مجلہ "صوت الاسلام" لکھتا ہے:

"مولانا کے جنازہ میں مسلم اور غیر مسلم عوام کا ایک جم غفیر تھا، تقریباً لاکھ یا اس سے زیادہ لوگ تھے۔ یہ دیکھ کر ہمیں محدث اسلام امام احمد بن حنبل یاد آگئے کہ ان کے جنازہ میں پورا شہر نکل پڑا تھا۔"[1]

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس منظر کو دیکھ کر یہ تاثر بیان کرتے ہیں

"... لوگوں کی تعداد کا اندازہ نہ ہو سکا البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے ہوئے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ اسکی توقع ہے تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے۔"[2]

☆ ☆ ☆

[1] صوت الاسلام عدد ۱ جلد ۵ ص ۴۱-۴۲

[2] معارف اپریل ۱۹۹۵ء ص ۳۱۲

باب سوم

مختلف علوم وفنون سے متعلق خدمات

- تفسیر
- حدیث
- فقہ
- مناظرہ
- تاریخ وتذکرہ
- ادب

باب سوم

مختلف علوم وفنون سے متعلق خدمات

تفسیر

تمام علوم کا سرچشمہ ومنبع قرآن حکیم ہے، اس کائنات میں جس طرح ہر ذرہ حمد الٰہی کررہا ہے، اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم کا کوئی دریچہ ہو یا اسکی کوئی شاخ ہو، شجر ہو، حجر ہو، ثمر ہو، وہ قرآن کے دائرے سے باہر نہیں ہے، چنانچہ ائمہ نے قرآن کی اپنی اپنی فہم کے مطابق تفسیر کی۔ استدلال کے لئے عقل ومنطق کا سہارا لیا، اور استخراج نتائج میں اسکا لحاظ رکھا کہ حدیث سے تعارض نہ ہو، اقوال وسیر صحابہ کرام سے ہر نتیجہ کی تائید ہو، اور منشأ قرآن کی توضیح وتشریح بھی ہوتی ہو۔

چنانچہ اس میدان وسیع بیان میں جو علمی کارنامے انجام دیئے گئے، وہ کبھی کشاف، کبھی تفسیر کبیر، کبھی درمنثور اور کبھی بیضاوی وغیرہ کے نام سے یاد رکھے گئے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تا قیام قیامت انسان اپنی فہم کے مطابق قرآن کی آیات سے روشنی حاصل کرتا رہے گا۔ اور جیسے جیسے یہ دنیا ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے علوم وفنون کے دریچے کھولے گی، اسے مفتاح العلوم یعنی قرآن حکیم کا سہارا لینا پڑے گا۔

راقم الحروف اپنے اس عقیدہ پر مفتخر ہے کہ جس نے قرآن سے اپنا رشتہ توڑا

وہ علم خالص سے بے بہرہ ہوا، وراس آیت شریفہ کا مصداق ہوا "ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم۔"

اس تصور کے پیش نظر کسی عالم کی شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی دیکھنا چاہئے کہ اس نے قرآن سے کس حد تک استفادہ کیا ہے، اور میدان تفسیر میں اسکے فکری اکتسابات کس منزل پر ہیں۔

مولانا حبیب رحمن صاحب الاعظمی نے کوئی تفسیر نہیں لکھی، لیکن انکا علمی ذوق صحتمند، خالص ور پاکیزہ اقدار پر مبنی تھا اس لئے انہوں نے جہاں کہیں یہ دیکھا کہ قول سدید سے انحراف ہو رہا ہے وہاں انکا خامہ شرربار خاشاک غیر سدید کو پھونک دینے کے لئے بے چین ہو اٹھا۔ اس سلسلہ میں انکے دو مضامین ہیں، جنکا تجزیہ کیا گیا ہے، حالانکہ تفسیر کے نکات اور قرآن فہمی کے اسرار وغوامض کی تشریح مولانا کے تمام علمی کارناموں میں کسی نہ کسی نہج سے ملتی ہے، لیکن خاص طور سے یہ دو رسائل معتزلہ اور بزعم خود مجددانہ فکر کا ابطال کرتے ہیں۔

التنقید السدید علی التفسیر الجدید

مولانا عبدالحی پروفیسر جامعہ ملیہ نے "التفسیر الجدید" کے نام سے ایک تفسیر تحریر کی۔ اپنی اس تفسیر کی تمہید میں قرآن کی عمدہ اور صحیح تفسیر کے لئے مولانا نے کچھ معیار بھی مقرر کئے، جو اگرچہ صراحتاً تو درج نہیں لیکن ضمناً مفہوم ہوتے ہیں۔ وہ اصول یہ ہیں:

۱۔ تفسیر لکھنے کے وقت احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھنا لازم ہے، کسی آیت کی تفسیر میں یہ چیز سب سے مقدم ہے۔

۲۔ متبادر معانی ومطالب کو اخذ کیا جائے، تاکہ فتنہ وفساد اور توجیہ وتاویل کا باب نہ کھل جائے۔

۳- منطقی دلائل، فلسفیانہ موشگافیوں، ریاضیات، طبعیات اور ہیئت ونجوم کے زور سے استدلال وحجت کو قوی سے قوی بنانے سے گریز کرتے ہوئے بغیر کسی خفاء کے واضح اور صاف باتیں کی جائیں۔

۴- ہر آیت کے لئے کوئی نہ کوئی واقعہ فرض کر لینا پھر اس کے مطالب اسی مخصوص حادثہ میں محدود کر لینا جن میں بیشتر ایسے واقعات ہیں جو اہل کتاب سے منقول ہیں لہذا اس لئے ناقابل اعتماد ہیں، غلط فہمی ہے۔[1]

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے مطابق پروفیسر عبدالحی نے قرآن کی تفسیر کا جو معیار یا خاکہ بنایا ہے، خود انہوں نے ہی اسکا پاس نہیں رکھا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں

"ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ مولانا[2] نے ان اصول کی مراعات کرتے ہوئے تفسیر کی ہوگی، لیکن واقعات آپکو بتائیں گے کہ مولانا نے ان میں سے کسی چیز کی بھی کوئی پروا نہیں کی، اور ان قیدات سے بالکل آزاد ہو کر آیات کے معانی ومطالب بیان کئے ہیں حتی کہ بیشتر مقامات میں نحو وصرف، معانی وبلاغت کے اصول وقواعد کی رعایت بھی غیر ضروری سمجھی ہے، مفردات کے معانی لغویہ کے بیان کرنے میں بھی اجتہاد وقیاس کو دخل دیا ہے۔"[3]

مولانا الاعظمی نے عقیدۂ اہل سنت والجماعت سے متصادم اس تفسیر "التفسیر الجدید" کا رد کیا، اس سلسلہ میں ۴۸ صفحات پر مشتمل مستقل ایک رسالہ تحریر فرمایا، جس کا نام مولانا نے "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" رکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے سوالہ

---

[1] التفسیر الجدید ۲، ۳، بحوالہ التنقید السدید ۳-۴ (انجم لکھنؤ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ)

[2] مولانا سے مراد پروفیسر عبدالحی ہیں۔

[3] التنقید السدید ص ۳ (انجم لکھنؤ ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ)

مقامات کا ذکر کیا ہے جہاں پروفیسر عبدالحق نے قرآن کی تصریح بعض پرانی روایات اور تفاسیر وغیرہ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ایک اجتہادی رائے قائم کی اور جدید انکشافات وتحقیقات پیش کی ہیں۔ وہ سولہ مقامات یا مباحث مندرجہ ذیل ہیں

۱۔آدم علیہ السلام کی جنت، جنت ارضی تھی، ۲۔ سجدہ جو کہ سرِ تکمیل پر آیا تھا وہ بیہوشی تھی، ۳۔ اس واقعہ میں بعث بعد الموت سے مراد ہوش میں لانا ہے، ۴۔ اصحاب السبت پر جو نکال اور عذاب بجس نازل کیا گیا تھا اس سے مراد پوری قوم کا ہلاک ہو جانا ہے، ۵۔ اصحاب السبت درحقیقت بندر نہیں ہو گئے تھے، بلکہ بندروں کی خصلتیں ان میں پیدا ہو گئی تھیں، ۶۔ ترمذیوں کی تدوین دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی تھی، ۷۔ تقلید معمول بکورانہ تقلید اور تقلید کی ہے اور مقلدین لا یعبدوہ وراء ظھورھم اور قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا کے مصداق ہیں، ۸۔ رفع طور سے اسکا سروں پر بلند کرنا مراد نہیں ہے، بلکہ نیچے سرائیل اسکو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے، ۹۔ ہاروت وماروت دو فرشتہ خصلت انسان تھے، ۱۰۔ انہوں نے اپنی بزرگی اور اوراد ووظائف کے ذریعہ تسخیر کی تھی۔ یہودیوں نے بھی اوراد ووظائف ان سے سیکھے تھے، ۱۲۔ یہ اوراد ووظائف شیطانی باتیں ہیں، ۱۳۔ کار سحر، ۱۴۔ آیت ألم تر إلى الذين خرجوا من ديارهم الآية میں جنگ کا ذکر ہے، ۱۵۔ اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ خرق عادت کے طور پر نہیں مرے تھے، ۱۶۔ مرنے کے بعد وہ زندہ نہیں ہوئے تھے[1]

پروفیسر عبدالحق کی تفسیر پر مولانا اعظمی کی تنقید کا یہاں ایک نمونہ پیش خدمت ہے تاکہ قرآن مجید کی تفسیر وتشریح سے متعلق مولانا کے مطالعہ اور اس سلسلہ میں کی دقت نظر اور فکری عمق کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔

---

[1] التنقید السدید ص ۴۳ (مجلہ معنوی تقریباً ۱۳۳۹ھ)

"واذا اخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور" کی تفسیر میں مولانا عبدالحی تحریر فرماتے ہیں:

"اسکا یہ مطلب نہیں کہ پہاڑ انکے سر پر بلند کر دیا گیا تھا بلکہ اپنے سامنے اسکو دیکھ رہے تھے۔ حدیث میں آتا ہے "فرفعت لنا صخرة" جسکے معنی صاحب بحار الانوار نے یہ کئے ہیں کہ ظهرت لابصارنا یعنی چٹان ہمیں نظر آنے لگے بس یہاں یہی معنی مراد ہیں کہ وہ اپنے سامنے پہاڑ کو دیکھ رہے تھے"۔[1]

مولانا الاعظمی نے اولاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جنکو خود مصنف نے دور اول کے مفسرین میں شمار کیا ہے، کی اس آیت کریمہ کے بارے میں رائے اور انکی تفسیر نقل کی جو مصنف کی تفسیر کے خلاف ہے، پھر آگے چل کر مولانا نے پروفیسر عبدالحی کی تفسیر کو قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف قرار دیا۔ مولانا نے اپنے اس دعوی کی دلیل قرآن مجید کی ہی دوسری آیت سے پیش کی، مولانا کی تحقیق خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"سورۂ اعراف میں اسی واقعہ کو دوسرے الفاظ میں ذکر کیا ہے، واذا نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة فظنوا انه واقع بهم الآیۃ اس آیت سے بچند وجوہ مصنف کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ (اولاً) تو یہاں رفع کا لفظ ہی نہیں ہے، اس لئے یہاں اس تصرف کی گنجائش ہی نہیں جو سورۂ بقرہ کے الفاظ میں تھی۔ (ثانیاً) نتق کے معنی نفض ونثر وجذب وزلزلہ یعنی جھاڑنے اور جھٹکا دینے کے ہیں چنانچہ صراح میں ہے واذا نتقنا الجبل ای زعزعناه اور علامہ راغب نے فرمایا ہے کہ نتق

---

[1] التفسیر الجدید ص ۱۳۵ بحوالہ التنقید السدید ص ۸

کے معنی کسی چیز کو اس طرح کھینچنا کہ ڈھیلی ڈھالی ہو جائے۔ (ثالث) کانہ ظلة میں بالکل تصریح ہے کہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان کی طرح بلند کر دیا گیا تھا اور یہ وہ لفظ ہے کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ (رابعاً) فظنوا انه واقع بهم سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ ان کے سروں پر بلند تھا ورنہ اگر وہ پہلے کی طرح اپنی مرکزی جگہ میں جما ہوا تھا تو انہوں نے بلاوجہ بیٹھے بٹھائے آج یہ یقین یا گمان کیوں کر لیا کہ پہاڑ ان کے سروں پر آ رہے گا۔ ان دلائل قاہرہ سے بلاشبہ و بلاریب ثابت ہو گیا کہ مولانا کا اجتہاد غلط اور "قدامت پرستوں" کا صدیوں کا "فرسودہ" خیال ہی مطابق قرآن ہے۔[1]

اسی طرح "قلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة" کی تفسیر میں ائمہ اہل سنت والجماعت کے خلاف پروفیسر عبدالحی کے اس دعویٰ "آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا ظاہر ہے کہ وہ حقیقی جنت نہیں ہو سکتی۔"[2] کو مولانا اعظمی نے تفسیر مدارک کے حوالہ سے بعینہٖ معتزلہ کا مسلک قرار دیا۔ اسی بحث کے ذیل میں مولانا عبدالحی کا وضع کردہ وہ معیار کہ تفسیر کے سلسلہ میں فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ہونی چاہئیں، عام مثال کے سلسلہ میں خود انہیں کی تقریر سے ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ وہ فلسفیانہ اور منطقی مباحث میں اپنی تفسیر میں الجھے نظر آتے ہیں، جو انہیں کے نقطہ نظر کے خلاف ہے۔

آدم علیہ السلام کے قیام جنت کے متعلق مولانا اعظمی نے طویل کلام کیا ہے، چونکہ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ صرف ایک مثال پیش کریں گے اس لئے یہاں پر

---

[1] التنقید السدید ص ۹-۱۰

[2] تفسیر المجید ص ۱۰۱، بحوالہ التنقید السدید ص ۳

اس پوری بحث کو نقل کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی اپنی تحقیق کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچے کہ پروفیسر عبدالحی نے اپنی تفسیر میں اصول تفسیر کی رعایت نہیں برتی، بلکہ یہ کہیے کہ مخالفت کی وریہی بنیادی سبب ہے کہ انکی تفسیر درجہ اعتبار وقبول سے ساقط ہوگئی۔ مولانا نے "الفوز الکبیر" کے حوالہ سے تفسیر کے چند اصولوں کا بھی ذکر کیا ہے جنکی پروفیسر عبدالحی نے اپنی تفسیر میں خلاف ورزی کی ہے۔ وہ اصول یہ ہیں

۱-قرآن پاک کے مشکل الفاظ کے حل میں حسب ذیل چیزوں پر بہ ترتیب دلیل عمل ضروری ہے۔

(الف) حضرت ابن عباسؓ سے جو شرح الفاظ بطریق ابن ابی طلحہ مروی ہے۔

(ب) حضرت ابن عباسؓ سے جو شرح بطریق ضحاک مروی ہے۔

(ج) جوابات حضرت ابن عباسؓ بہ سوالات ابن الازرق۔

(د) وہ شرح الفاظ جو صحیح بخاری میں ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔

(ہ) مفسرین نے جو شرح الفاظ صحابہ، تبع تابعین سے نقل کی ہے۔

۲-قرآن کے کسی مشکل مقام کی تشریح وتوضیح میں سب سے زیادہ قابل قبول بلکہ متعین طور پر واجب القبول وہ تشریح تفسیر ہے جو خود قرآن پاک کے کسی دوسرے مقام سے حاصل ہو مصنف نے ورفعنا فوقہم الطور کی تفسیر میں اسکی خلاف ورزی کی۔

۳-اسباب نزول وتوجیہ مشکل کے متعلق جو آثار واحادیث امام بخاری، امام ترمذی اور حاکم نے ذکر کیے ہیں انکا یاد رکھنا مفسرین کے لئے ضروری ہے۔ مصنف نے الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم الآیۃ اور اصحاب سبت کے قصہ میں اس کی خلاف ورزی کی ہے۔

۴۔ کسی آیت کی تفسیر اگر حدیث میں مذکور ہو یا اس کی تفسیر میں کسی حدیث سے مدد لی ہو تو وہی تفسیر متعین ہے۔ مسخ بنی اسرائیل کے بیان میں مصنف نے اس اصول کو ترک کر دیا ہے۔

۵۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں کہ اسباب نزول بیان کرنے میں ہمارے مولانا (پروفیسر عبد الحی) بخت میں احادیث بعض اوقات اس چیز کے بغیر آیت کی مراد تک رسائی ناممکن ہے۔

۶۔ جس قصہ کا ذکر قرآن پاک میں ہو اسکی تفصیل میں دوسری چیزوں سے مدد لینا ضروری ہے لیکن اسی حد تک کہ وہ تضاد رفع ہو جائے جو قرآن پاک کے الفاظ پڑھنے سے پیدا ہوا تھا اور جتنا حصہ قرآن پاک میں مذکور ہے وہ واضح اور منکشف ہو جائے۔

۷۔ اسرائیلیات مطلقاً شجرہ ممنوعہ نہیں ہیں، بلکہ اسمیں تفصیل ہے۔ مصنف نے سرے سے اسرائیلیات کا انکار کیا ہے، لیکن خود انہوں نے بیشتر مقامات میں اپنے کلام کی بنیاد انہیں اسرائیلیات پر رکھی ہے۔

۸۔ متون لغات واوضاع الفاظ میں بادشاہ کی رائے وقیاس کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ عرب کی تقلید اس باب میں ضروری ہے۔ پروفیسر عبد الحی صاحب نے رجع طور اور صاعقہ کی شرح میں اس اصول کو نظر انداز کیا ہے۔

مولانا اعظمی نے "التنقید السدید علی التفسیر الجدید" میں تفسیر اور اصول تفسیر سے متعلق بے مختصر مگر جامع تحقیقی وتنقیدی مباحث کے ذریعہ "میدان تفسیر" میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔ مولانا نے اپنی اس کتاب کے ذریعہ تفسیر کے سلسلہ میں پٹری سے اتر جانیوالی آزادانہ روش کو پھر سے پٹری پر لانے کی ایک قابل ستائش کوشش کی ہے۔ انہوں نے تفسیر میں اصول تفسیر کی خلاف ورزی کو گمراہی قرار دیا۔ مولانا اعظمی کا یہ رسالہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے مشہور علمی مجلہ "النجم" میں ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو علمی دنیا نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسکے مصنف کو داد تحسین

دی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے قوت استدلال، حسن دلائل، دفع شبہات، لیکن کلام عرض ہر پہلو سے "تنقید جدید" کی تحسین و توصیف فرمائی ہے، جس کو آئندہ کسی مناسب موقع پر نقل کیا جائے گا۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب ۲۸ رجب ۱۳۵۰ھ کے ایک خط میں اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں

"سبحان اللہ عنوان و معنون، تعبیر اور معرفت کے لحاظ سے یہ بے نظیر رسالہ ہے۔ رسالہ کا موضوع باوجودیکہ تنقید و مناظرہ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس متانت و تہذیب اور انصاف و حق گوئی کا ثبوت اس تحریر میں دیا گیا ہے عموماً مناظرانہ تحریریں اس سے خالی دیکھی گئی ہیں" [۱]

نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے

ایک مشہور اور قابل احترام عالم نے "قرآن محکم" کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں انہوں نے نسخ آیات کے سلسلہ میں بحث و تحقیق کی تھی، نسخ کے متعلق مولانا کی تحقیق یہ تھی

"جن جن آیتوں کو ناسخ و منسوخ سمجھا جاتا ہے، محض غلط فہمی پر مبنی ہے، ورنہ قرآن پاک کا چہرہ اس بدنما داغ سے پاک ہے۔" [۲]

بہر حال مصنف کی تحقیق کا لب لباب یہ تھا کہ "نسخ" عیب اور بدنما داغ ہے، قرآن کریم جیسی پاکیزہ اور مقدس کتاب میں اس کے ہونے کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے "قرآن محکم" کا رد لکھا، مولانا نے

---

۱ حیات ص ۱۸۰

۲ قرآن محکم ص ۷ بحوالہ المآثر ج ا ش ۳ ص ۲۸

نسخ کے اصطلاحی معنی کی تعیین کرتے ہوئے اس کی حقیقت، اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی، مفسرین، علماء، محدثین اور فقہاء کی عبارتوں اور ان کی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعداد نسخ کی تعیین کی اور "قرآن محکم" کے مصنف نے پیش کردہ نقطہ نظر پر بحث و تنقید کی ہے۔ مولانا اعظمی کے رسالے کا نام "نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے" ہے۔ مولانا نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بحث کی

(۱) دلیل کیا صرف قرآن ہی ہے، (۲) ناقابل معافی جرأت، (۳) جملہ شرطیہ کی تحقیق، (۴) قرآن میں وقوع نسخ، (۵) نسخ کے لئے تعارض ضروری نہیں، (۶) تاویلات فاسدہ۔

مولانا اعظمی کے مطابق امت محمدیہ میں اس حقیقت کا انکار صرف ابو مسلم اصفہانی معتزلی نے کیا ہے۔ اس کے بالمقابل ابوبکر رازی، ابو الحسین بصری، قاضی بیضاوی، ابن الہمام، اسنوی، ابن امیر الحاج، شاہ ولی اللہ اور تمام علماء اصول کے نزدیک نسخ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ ابو الحسین نے اس کو حسن و خوبی سے تعبیر کیا ہے۔ بہرحال قرون اولی سے آج تک سبھی کو نسخ کی حقیقت تسلیم ہے۔

ما ننسخ من آية أو ننسها نأت بخير منها أو مثلها (سورہ بقرہ)

(ہم کوئی بھی آیت منسوخ کرتے یا اسے بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مثل لاتے ہیں)

اس آیت کے بارے میں "قرآن محکم" کے مصنف نے کہا کہ

"اس آیت سے نسخ آیت کا نہ وقوع سمجھا جا سکتا ہے نہ نسخ آیت کے وقوع کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔"[1]

---

[1] قرآن محکم ص ۲۱ بحوالہ المآثر ج ۱ ش ۳ ص ۱۸

مولانا عثمانی کہتے ہیں کہ فاضل مصنف کا یہ دعویٰ غلط ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے ان کے دعوے کے خلاف اس آیت سے وقوع نسخ سمجھا ہے، اور ان کا یہ سمجھنا اہل حدیث پر بھی حجت ہے اور اہل فقہ پر بھی۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ابی بن کعبؓ اگرچہ ہم میں سب سے بڑھ کر عالم قراءت ہیں پھر بھی ہم انکی بہت سی قراءتوں کو اختیار نہ کرنے اور چھوڑ دینے پر مجبور ہیں، اس لئے کہ انکا قول یہ ہے کہ حضرت کی زبان سے میں نے جو بھی سنا ہے میں اسکو چھوڑ نہیں سکتا، اور حق تعالیٰ کا قول ہے کہ ما ننسخ من آیۃ او ننسھا الخ.

مولانا نے حضرت عمرؓ کے اثر کو پیش کر کے لکھا کہ اگر حضرت عمرؓ اس آیت سے نسخ کا واقع ہونا نہ سمجھتے تو وہ حضرت ابیؓ کی بہت سی آیتوں کو چھوڑ دینے کی وجہ اس آیت کو کیوں قرار دیتے؟ اسی طرح اگر نسخ کا وقوع ہوا ہی نہیں اور یہ آیت نسخ پر دلالت ہی نہیں کرتی تو حضرت ابیؓ کی کوئی قراءت نہ منسوخ ہو سکتی تھی اور نہ حضرت عمرؓ کے لئے اسکا چھوڑنا روا ہو سکتا تھا، نہ اس آیت کو چھوڑنے کی حجت قرار دینا صحیح ہو سکتا تھا!

کیا سبب ہے کہ "قرآن محکم" کے فاضل مصنف نے ایسی جرأت کی کہ نسخ کے وقوع کے سلسلہ میں ایک اجماعی رائے ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی علیحدہ رائے قائم کی دوسرے نسخ کا انکار ہی کر بیٹھے اور اس سلسلہ میں ایسی تحقیق پیش کی کہ معتزلہ سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے وہ سبب اور وہ سمت بھی ڈھونڈ نکالی جس نے مصنف کو مغالطہ میں ڈال دیا تھا یا خود مصنف کی اس کے صحیح مفہوم ومصداق تک رسائی نہ ہو سکی تھی۔ مولانا نے غلط فہمی کا اصل منشاء "منتخب" کی اس عبارت کو قرار دیا جہاں یہ ذکر ہے کہ دفع تعارض کی ایک صورت نسخ آیت بھی

ہے، نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ المآثر ج، ش ۳، ص ۱۸

ہے۔ یعنی جب تک دو آیتوں میں تعارض نہ ہوگا نسخ ہو گا ہی نہیں۔ مولانا اعظمی نے اس خیال کو باطل قرار دیا کہ نسخ کے لئے تعارض ضروری ہے۔ مولانا لکھتے ہیں

"یہ خیال فاسد اس لئے ہے کہ فرضیت تہجد اور فرضیت صلوات خمسہ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ پھر بھی تمام علمائے امت نے تہجد کی فرضیت کو منسوخ اور فرضیت نماز پنجگانہ کو ناسخ قرار دیا ہے۔"[1]

"قرآن محکم" کے مصنف نے ان آیت میں تاویلات کرکے غیر منسوخ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جن کو متقدمین و متاخرین علماء نے منسوخ تسلیم کیا ہے۔ اسکی بھی ایک مثال نذر ناظرین ہے

"کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین"

(جب تم میں سے کسی کو موت آئے تو اگر اس نے مال چھوڑا ہے تو تم پر والدین اور رشتہ مندوں کے لئے موافق شرع وصیت کرنا واجب قرار دیا گیا، یہ متقیوں پر ضروری ہے۔)

فاضل مصنف نے اسکو غیر منسوخ قرار دیا ہے۔ انکی تحقیق کے مطابق لفظ 'وصیۃ' سے وصیت بالمال مراد نہیں ہے، بلکہ خاص وصیت الٰہی مراد ہے۔ اس آیت کے نزول کا مقصد یہ اطلاع ہے کہ تمہارے ترکہ کے متعلق والدین واقرباء کے لئے ایک خاص وصیت الٰہی ہے جو تم پر فرض کی گئی ہے، اور اسکا بیان سورۂ نساء میں ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء کی آیت میراث سورۂ بقرہ کی آیت کی تفصیل اور بیان ہے۔

مولانا الاعظمی کے نزدیک مصنف کی یہ تاویل دراصل ابو مسلم اصفہانی معتزلی کی بیان کردہ ہے۔ نیز فرمایا کہ اس آیت کو منسوخ نہ کہنا حضرت ابن عباسؓ کی

---

[1] ناسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ الماثر ج ۱۱ ش ۳ ص ۲۲

تصریح کے خلاف ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

عن ابن عباس قال كان المال للولد وكانت الوصية للوالدين فنسخ الله من ذلك ما أحب الخ (صحیح بخاری جلد ۳ ص ۲۳۰)

(یعنی مال کا وارث لڑکا ہوتا تھا، اور والدین کے حق میں وصیت ہوا کرتی تھی، پس اللہ نے جو چاہا اس میں سے منسوخ کر دیا۔)

اسکے علاوہ مولانا نے آیت کریمہ کے سیاق وسباق، اسکے مفہوم، اور آیت کی نحوی ترکیب پر بحث کرتے ہوئے "قرآن محکم" کے مصنف کی تاویل کو قرآن کے خلاف قرار دیا۔ مولانا نے اس آیت سے ہی چار دلیلیں پیش کیں۔ قرآن محکم کے مصنف نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا کہ

"ہم کو خود قرآن شریف کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ خود قرآن ناسخ ومنسوخ آیات کی موجودگی کا مدعی ہے یا منکر؟ اگر منکر یا ساکت ہے تو اسکی طرف بغیر کسی دلیل کے منسوب کرنا ناقابل معافی جرأت ہے۔"[۲]

مولانا نے اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ یہ تمام اہلسنت کے موقف کے خلاف ہے، بلکہ انہوں نے اس اظہار خیال کو فرقۂ اہل قرآن کی ہم نوائی قرار دی۔ لکھتے ہیں کہ مان لیا جائے کہ قرآن ساکت ہے کہ اس میں نسخ واقع ہوا ہے یا نہیں، لیکن اس حدیث کا کیا کیا جائے جس میں اسکے وجود کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولانا نے حدیث پیش کی:

كلام الله ينسخ بعضه بعضاً

۱۔ نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ الشارع اش ۳۰ ص ۲۳

۲۔ قرآن محکم ص ۹ بحوالہ الشارع اش ۳۰ ص ۲۸

(کلام الٰہی ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتے ہیں۔)

دوسری حدیث

ان احادیثنا ینسخ بعضها بعضاً کنسخ القرآن

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۲)

(قرآن ہی کی طرح ہماری حدیثیں ایک دوسرے کو منسوخ کر سکتی ہیں۔)

مولانا نے نسخ کے سلسلہ میں حدیث کی ان وضاحتوں کے بعد قرآن محکم کے مصنف سے سوال کیا کہ:

"تو کیا اسکے بعد بھی قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کہنا ناقابل معافی جرأت ہے؟"

مولانا نے اپنی اس مختصر تحریر میں مصنف کی ہر بات کا جواب دینے کا تہیہ نہیں کیا ہے لیکن پھر بھی "نسخ آیات" کے موضوع پر اہم اور بنیادی باتوں کا تذکرہ آگیا ہے۔ انکے اس مضمون کو دیکھ کر آیات کی تفسیر و تشریح میں انکی گہری نگاہ، مفسرین اور اصول تفسیر کے مصنفین کی آراء اور قول سے پوری طرح واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح سے مولانا نے تفسیر، اصول تفسیر، نحوی صرفی بحث، احادیث و آثار صحابہ، منطقی دلائل وغیرہ تمام کو سامنے رکھکر "نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے" مضمون مرتب کیا ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علوم قرآن پر مولانا کو دسترس حاصل تھی۔

مولانا الاعظمی کا یہ مختصر رسالہ اب تک غیر مطبوعہ تھا۔ ابھی حال ہی میں مجلہ "المآثر" مئو نے جلد ۱ شمارہ ۲، ۳، ۴ میں شائع کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

نسخ کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ بحوالہ المآثر ج ۱ ش ۲ ص ۲۹

حدیث

﴿وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ﴾

(آپ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے، یہ تو وحی ہے جو آپ پر نازل کی جاتی ہے۔)

اسلام کو تمام ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات پر اس لئے بھی ترجیح حاصل ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات کا نظری اور عملی پہلو پیش کرتا ہے۔ اس کا تشریحی پہلو اسکے تشریعی رخ سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ جہاں اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے دنیا کے سامنے یہ معجزہ پیش کیا جو حدود زمان و مکان سے ماورا ہے، وہیں اسلام کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ اسکا کوئی رخ ناقابل عمل نہیں۔ کوئی موسم ہو، کیسے ہی پھول کھلیں، اسلام ہر رنگ میں بہار کا ثبات چاہتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام کے نظام میں ایک ایسا جمود و ٹھہراؤ (Rigidity) ہے کہ وہ صرف چند احکامات کے گرد محدود ہے۔

پروردگار عالم نے اپنے بندوں کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق کے لئے "انعمت علیھم" کے مصداق افراد بھیجے، اور انسانوں کو "غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" والے راستے سے روکنے کے لئے ارشادات، احکامات اور ہادیان عصر کو مشعل راہ بنایا اور جگہ جگہ یہ بھی وضاحت کردی کہ اگرچہ "رسول" تمہارے ہی جیسا بشر ہے، مگر یہ درکنار، اس پر وحی آتی ہے، وہ اپنی مرضی سے کلام نہیں کرتا ہے، چنانچہ خداوند قدوس نے کلام پاک میں بہت سے مقامات پر اپنے احکام کی تعمیل کے ساتھ اپنے پیغمبر ﷺ کی اطاعت کا تاکیدی حکم بھی فرمایا ہے۔

حامی مسلک پر عمل رہا ہے۔ امام طحاوی نے ابتداً آپ ہی سے اور ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی شافعی المسلک تھے ان کی خدمت میں رہ کر تفقہ فی الدین حاصل کیا۔ کتاب المختصر کی روایت انہوں نے مزنی سے کی ہے جو مزنی نے امام شافعی سے روایت کی ہے۔[1]

لیکن پھر امام طحاوی کا میلان مذہب امام ابو حنیفہ کی طرف ہوتا گیا اور آپ نے امام اعظم کے مسلک کو اپنا لیا۔ حنفی فقہ کو اپنا طریقۂ عمل بنایا اور ایسے پختہ حنفی ثابت ہوئے کہ مصر میں حنفیہ کی قیادت وریاست آپ پر ختم ہو کر رہ گئی[2]۔ امام طحاوی کے چند مشہور شیوخ واساتذہ میں ابو ابراہیم اسمٰعیل مزنی، ہارون بن سعید ایلی، ابو شریح محمد بن زکریا، امام نسائی، ابوعثمان سعید بن بشر، ربیع بن سلیمان الجیزی وغیرہ ہیں۔ تلامذہ یا روایت کرنیوالوں میں ابوالحسن علی بن احمد طحاوی، ابو محمد عبد العزیز بن محمد تمیمی، ابوبکر مقری، ابوالقاسم مسلمہ بن القاسم بن ابراہیم قرطبی، ابوالقاسم عبیداللہ بن علی الداؤدی القاضی وغیرہ ہیں۔[3]

امام طحاوی کے بارے میں ابن یونس فرماتے ہیں کہ "کان ثقة ثبتاً لم یخلف مثله"[4] یعنی امام طحاوی ثقہ ہیں، ثبت ہیں، خلف میں انکی مثال نہیں ملتی۔
ابن عبد البر فرماتے ہیں کہ

"کان الطحاوي کوفي المذهب عالماً بجمیع مذاهب العلماء."[5]

امام طحاوی کوفی المذہب ہیں، علماء کے تمام مذاہب سے واقف وباخبر ہیں۔

---

1. لسان المیزان ۱: ۲۷۴
2. الاعلام ۲۰۶ - خیر الدین زرکلی
3. الحاوی فی سیرة الامام ابی جعفر الطحاوی ص ۶-۷ محمد زاہد الکوثری
4. العبر فی خبر من غبر ۲: ۱۸۶ - ذہبی
5. الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۳۲ - مولانا محمد عبد الحی لکھنوی

۳۲۱ھ میں امام طحاوی کی وفات ہوئی۔ ۱

طحاوی کثیر التصانیف بزرگ ہیں، جن میں علمی و تحقیقی کتابیں آپ کی یادگار
ہیں، انہیں میں دو اہم ترین کتابیں 'شرح معانی الآثار' اور 'مشکل الآثار' بھی ہیں۔

طحاوی کی خصوصیت | ملا علی قاری کی تصریح کے مطابق معانی الآثار طحاوی کی
سب سے پہلی اور مشکل الآثار سب سے آخری تصنیف ہے۔ ۲ متعدد محدثین
و شارحین نے 'معانی الآثار' کے رجال پر کام کیا اور ان کا تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔ اس
سلسلہ میں علامہ بدر الدین عینی کی دو جلدوں میں 'مغانی الاخیار فی رجال معانی الآثار'
جس کا قلمی نسخہ کچھ نقص کے ساتھ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے۔ ۳ اور قاسم بن
قطلوبغا متوفی ۸۷۹ھ کی 'الایثار برجال معانی الآثار' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۴

لیکن مشکل الآثار کے رجال کو اب تک کسی نے موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔
مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار دونوں کے
رجال و رواۃ پر کام کیا اور ان کے حالات بطور تذکرہ مرتب کئے۔ ڈاکٹر مسعود احمد کے
لفظوں میں

'یہ علامہ اعظمی کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں،
کیونکہ شرح معانی الآثار کے رجال پر متعدد اہل علم نے کام کیا، لیکن
شرح مشکل الآثار کی خدمت آپ کی بے نظیر انفرادیت ہے۔' ۵

مشکل الآثار کے رجال پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے کام کی

---

۱ اللباب فی تہذیب الانساب ۲/۸۲ ابن اثیر

۲ الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ ص ۳۳

۳ الحاوی فی سیرۃ الامام ابی جعفر الطحاوی ص ۳۳

۴ اتحاف النبلاء ص ۱۵۴ نواب صدیق حسن خاں

۵ حیات ابو المآثر ص ۱۷۸-۷۹

ندرت، انفرادیت اور نوعیت کو جان کر اہل علم حضرات کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب محققین نے 'الحاوی' کی حیثیت دیکھی ہوگی جیسے صحرا میں کسی تشنہ لب پیاسے کو کوئی چشمہ نظر آ جائے اور وہ اس سے اپنی پیاس بجھانے کو بے تاب ہو۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کے ایک خط مکتوبہ ۱۲ر جمادی الاولی ۱۳۵۱ھ کو دیکھ کر کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے لکھتے ہیں کہ

> "کاش (الحاوی) چھپ جاتی تو ہم کو بھی اپنے کام میں مدد ملتی۔ حق تعالیٰ کوئی سامان فرما دیں، ان شاء اللہ مناسب موقع پر کوئی کوشش ہو سکی تو دریغ نہ ہوگا۔"[1]

جب 'الحاوی' کے بارے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو معلوم ہوا تو آپ نے یہاں بھی مسرت و حیرت کی ملی جلی سی کیفیت دیکھنے میں آئی جسکو ہم آئندہ کسی موقع پر نقل کریں گے۔

مولانا اعظمی نے جمادی الاولیٰ ۱۳۴۸ھ میں 'الحاوی' کی تصنیف و تالیف کا کام مکمل فرمایا، انہوں نے مخطوطہ کے آخری صفحہ پر یہ مادۂ تاریخ لکھا۔

"بہ واللہ تصنیف شریف ۱۳۴۸ھ۔"

اس کتاب کی تکمیل کے وقت مولانا کی عمر ۲۹ برس تھی۔

مولانا اعظمی کا یہ پہلا تحقیقی کارنامہ ہے، لیکن اب تک یہ کتاب شائع نہ ہو سکی، اس لیے "الحاوی" کے مخطوطہ کے اول اور آخری صفحوں کے عکس پیش کیے جا رہے ہیں۔

---

۱ المآثر مئی تا جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۸

الصحة حتى تفقت بين الندم والإحجام إلى أن استنهض عزيمتي كتاب كريم بعث به إلى هذا العاجز مولانا العلامة المحرر المجتهد الخبير أبو المآثر حبيب الرحمن الأعظمي عميد كلية مفتاح العلوم وصدر مدرسيها في أعظم گڈه في الهند، يفيدني فيه أن النصف الأخير من الدراية في تلخيص نصب الراية لابن حجر دخل في حيازته وعليه تعليقات للحافظ العلامة قاسم بن قطلوبغا بخطه ، فطربت فرحاً بذلك أيما طرب فبادرت بالكتاب إلى الأستاذ أبي المآثر المشار إليه راجياً استنساخ تلك المواضع من الكتاب المذكور فأسرع في الإجابة بما فطر عليه من السجايا الكريمة حيث قام بنسخ التعليقات بقلمه المبارك وأرسلها إلى هذا العاجز فأنعشني ذلك"[۱]

(لیکن الدرایہ کی نشر واشاعت کے واسطے کوشش وسعی کے لئے میری طبیعت آمادہ نہیں ہو رہی تھی، میں اسی پس وپیش میں تھا کہ ایک گرامی نامہ نے میرے پست ارادے میں تحریک پیدا کردی، جسے مولانا علامۂ محرر مجتہد خبیر ابو المآثر حبیب الرحمن الاعظمی جامعہ مفتاح العلوم اعظم گڈھ ہند کے پرنسپل اور صدر مدرس نے اس عاجز کے پاس ارسال فرمایا۔ لکھتے ہیں کہ ابن حجر کی الدرایہ فی تخریج نصب الرایہ کا ایک نصف اخیر مجھے دستیاب ہوا ہے، جس پر علامہ قاسم بن قطلوبغا کی تحریر کردہ تعلیقات ہیں
اس خوشخبری کو سن کر میں خوشی سے جھوم اٹھا اور جلدی سے ایک خط

---

۱ مقدمة الأصل ص ۵-۶

ستاذ ابو المآثر کی خدمت میں اس امید پر روانہ کیا کہ مذکورہ کتاب سے
ن مواقع تعلیقات کو نقل کرکے بھیج دیں چنانچہ انہوں نے اپنی عادت
شریفہ کے مطابق ان تعلیقات کو اپنے دست مبارک سے نوٹ کرکے
ن عاجز کے پاس ارسال فرمادیا، جسے پاکر میں بہت خوش ہوا۔"

شیخ زاہد کوثری نے 'منیۃ الالمعی' کے ساتھ ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء میں
تعليقات الحافظ قاسم بن قطلوبغا على النصف الثاني من الدراية' بھی
شائع کیا ہے۔ مجلس علمی سے نصب الرایہ کا جب دوسرا ایڈیشن ۱۳۹۳ھ میں شائع ہوا تو
اس میں بھی درایہ پر قطلوبغا کی تعلیقات مولانا اعظمی کے حوالہ سے شائع کی گئیں۔ یہ
تعلیقات چار صفحے پر ہیں، پہلی تعلیق کتاب النکاح میں حدیث "لا نكاح إلا
بشهود" پر ہے۔ مولانا اعظمی نے چار جگہ اس پر حاشیہ لگایا ہے، یہ مولانا کی ہی دین
ہے کہ زیلعی پر قطلوبغا کے استدراکات کے ساتھ ساتھ وہ تعلیقات واستدراکات بھی
منظر عام پر آگئے، جو حافظ قطلوبغا نے نصب الرایہ کی تلخیص پر تحریر فرمائے تھے، ورنہ
اب تک اصحاب تحقیق کی نظروں سے اوجھل تھے۔ شیخ کوثری نے صاف لفظوں میں
اس کا اعتراف کیا ہے: "إنه هو السبب الأوحد لنشر الاثنين معاً" یعنی وہ
(مولانا اعظمی) ہی دونوں کی ایک ساتھ نشرواشاعت کا واحد سبب ہیں۔

کتاب الثقات

ابن شاہین | ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان معروف بہ ابن شاہین ایک عظیم المرتبت
محدث ہیں، ۲۹۷ھ میں پیدا ہوئے، مشہور اساتذہ میں محمد بن محمد باغندی، ابو القاسم
بغوی، ابوبکر بن ابی داؤد اور ابن ابی شیبہ ہیں۔ شاگردوں میں برقانی، ختلی اور تنوخی

۱؎ منیۃ الالمعی ص ۸

خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، خلق کثیر نے ان سے سماعت حدیث کی۔[۱]

ترتیب، تفسیر، مسند، تاریخ اور دوسرے موضوعات پر کئی تصانیف ہیں۔ انکے قلم گہر بار سے تین سو تیس تصنیفات وجود میں آئیں۔ انہوں نے ایسی تصانیف کیں کہ ان جیسی تصانیف کسی نے بھی نہیں لکھی۔ وہ ثقہ تھے، البتہ قرات وغیرہ میں غلطی ہو جایا کرتی تھی، اور فقہ کی معرفت حاصل نہ تھی۔[۲] محمد بن ابی الفوارس کا بیان ہے کہ ابن شاہین کے سامنے فقہاء کے مذاہب کا ذکر ہوتا مثلاً امام شافعی وغیرہ کا تو فرماتے میں محمدی المذہب ہوں۔[۳] ۲۰ ذی الحجہ بروز یکشنبہ ۳۸۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔[۴]

کتاب الثقات کی خصوصیت ابن شاہین کی ایک کتاب "کتاب الثقات" ہے، اس کتاب میں ان محدثین اور رواۃ کا حروف تہجی کے اعتبار سے تذکرہ ہے، جن کی شہادت قابل قبول اور عدالت مشہور ہے۔ اور جن سے روایتیں نقل کی جاتی رہی ہیں، جیسے یحییٰ ابن معین، عبدالرحمن بن مہدی، احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور عثمان بن عبداللہ وغیرہ۔

کتاب الثقات کا نسخہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں تھا، مولانا اعظمی نے اس نسخہ کی ایک نقل تیار کرائی، مخطوطہ کے ناقل قاضی اطہر مبارکپوری تھے۔ قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا کے حکم سے میں نے پوری کتاب نقل کی، اور میں نے اور مولانا محمد عثمان صاحب نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔"[۵] اسکے بعد مولانا اعظمی نے اس کتاب کی تحقیق و تعلیق کی۔ ۱۰ مارچ ۵۹ء کو قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ایک خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ

"کتاب الثقات کا کام مکمل ہوگیا، اب اسکی اشاعت کا سوال درپیش ہے۔"[۶]

شیخ ابوغدہ کے سامنے جب اس کتاب کا تذکرہ ہوا، تو شیخ نے اصرار کیا کہ میں

---

۱ تاریخ بغداد ۱۱ ۲۶۴-۲۶۵ خطیب بغدادی

۲ طبقات الحفاظ ص ۳۹۳ جلال الدین سیوطی

۳ تاریخ بغداد ۱۱ ۲۶۶

۴ ایضاً ص ۲۶۷

۵ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۴۶

۶ دارالعلوم اکتوبر ۹۹۲ء ص ۱۴

الترغیب والترہیب

اللہ تعالیٰ نے نیکی اور اس کے فضائل و مناقب، بدی اور اس کے معائب کو قرآن میں کھلے اور واضح لفظوں میں بیان فرمایا ہے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے ارتکاب پر ہونے والے ثواب و عذاب کو بھی واضح فرما دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عمل پر مرتب ہونے والے ثواب و عذاب سے مطلع فرما دیا تاکہ وہ ان کے ذریعہ لوگوں کو تبلیغ کریں، جس سے لوگوں کے قلوب میں اعمال صالحہ کی رغبت اور اعمال سیئہ کرنے سے خوف پیدا ہو اور وہ جذبہ فطری کے تحت عمل کریں۔[1]

تہذیب نفس یا ترغیب و ترہیب کے موضوع پر حدیث کی مستقل کتابیں تالیف کی گئیں ان مجموعوں میں احکام سے متعلق احادیث کو جمع کرنے کے بجائے صرف ترغیب و ترہیب سے متعلق احادیث جمع کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر تالیف کرنے والے مشہور ائمہ حدیث میں ابن زنجویہ متوفی ۲۳۱ھ، ابن شاہین متوفی ۳۸۵ھ، بیہقی متوفی ۳۵۱ھ، ابوالقاسم اصبہانی متوفی ۵۳۵ھ، ابو موسیٰ مدینی متوفی ۵۸۱ھ، حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری متوفی ۶۵۶ھ ہیں۔[2]

منذری کی "الترغیب والترہیب" کو سب سے زیادہ شہرت ملی کیونکہ اس کتاب میں دوسری تمام کتابوں کے مشمولات جمع کر دیے گئے ہیں۔ صحاح ستہ اور مستند کتابوں کے حوالے ہیں، اسناد کی صحت اور ضعف کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ ۳۲۴ شاہ ولی اللہ دہلوی

۲۔ الترغیب والترہیب ۱/۱۵ منذری

کتاب میں موضوع احادیث نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ضعیف احادیث
کی بھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ احادیث فضائل اعمال سے متعلق
ہیں اور فضائل میں ضعیف احادیث قابل قبول ہیں، لیکن پھر بھی بقول مولانا حبیب
الرحمن اعظمی کے حدیث ضعف اور وہم کے شائبہ سے جتنا دور ہوگی اتنی ہی موثر
اور اوقع فی النفس ہوگی۔[1]

چنانچہ اس قاعدہ کی رو سے منذری کی ترغیب وترہیب کے اختصار کی ضرورت
تھی۔ اختصار کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ یہ کتاب بہت مفصل اور مطول ہوگئی تھی جس
سے صاحب علم یا جن کو حدیث سے شغف ہو وہی استفادہ کر سکتے تھے عام طالب علم
کے لیے سہل الاستفادہ نہ تھی۔ اس اہم کارنامہ کو امام الحفاظ حافظ ابن حجر نے انجام دیا۔
انہوں نے اس کتاب کا اختصار کر کے اس کو مفید سے مفید تر بنا دیا۔

حافظ ابن حجر: شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی مصری شافعی
مصر میں ۷۷۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد میں کسی کا نام حجر تھا، انہیں کی طرف
منسوب ہو کر آپ ابن حجر سے مشہور ہوئے۔ ابن حجر کے والد کی کوئی اولاد نرینہ زندہ نہ رہتی
تھی، وہ بہت افسردہ خاطر رہتے، ایک دن مشہور بزرگ شیخ صنافیری کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور دعا کی درخواست کی، شیخ نے دعا کی کہ تیرے پشت سے ایک ایسا بچہ
پیدا ہوگا جو ساری دنیا کو علم کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔[2]

یہی ہوا بھی کہ ایک جامع شخصیت دنیا میں وجود پذیر ہوئی کہ دنیا اس کی مثال
لانے سے عاجز ہے۔ ابن حجر نے بہت سے محدثین عظام اور محدثین وقت سے استفادہ
کیا۔ ان میں مشہور اساتذہ شیخ ابو عفیف نشاوری، حافظ ابو محمد بن ظہیرہ، حافظ زین

۱؎ طبقات الحفاظ ص ۵۵۲ سیوطی

۲؎ بستان المحدثین ص ۷۶ شاہ عبدالعزیز

الدین عراقی، عبدالرحیم بن الحسین، ابوحفص عمر بن رسلان بلقینی، ابوطاہر مجد الدین فیروز آبادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ سے علم حدیث حاصل کرنے اور سبق لینے کے لئے دور دراز علاقوں سے طالبان علم آتے تھے، خانقاہ بیبرس میں انہوں نے تقریباً بیس سال تک حدیث املا کرائی، مصر کے اکثر علماء نے ان سے قراءت سیکھی ہے[1]۔ محمد بن عبدالرحمن سخاوی، برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی، ابن فہد مکی، زکریا بن محمد انصاری جیسے ائمہ آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

قدماء نے آپ کے حفظ، ثقاہت، امانت، معرفت تامہ، روشن دماغی، حد سے بڑھی ہوئی ذہانت اور مختلف فنون میں آپ کے تبحر اور وسعت علمی کی شہادت دی ہے[3]۔ امام شوکانی ان کی شان میں لکھتے ہیں کہ "الإمام المنفرد بمعرفة الحديث وعلله في الأزمنة المتأخرة"[4] (حدیث اور اس کے علل کی معرفت میں بعد کے زمانہ میں یہ (ابن حجر) ایک منفرد امام ہیں۔)

ابن حجر نے ہر فن میں ملکہ حاصل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود آپ کی ذات علم وتحقیق کا محور بن گئی اور تاریخ اسلام نے ان کو حافظ الحدیث، محی السنۃ، خاتمۃ الحفاظ جیسے موقر القاب سے نوازا۔ ابن حجر صاحب التصنیف امام ہیں، شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بقول ابن حجر کی تصنیفات کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے۔[5] فتح الباری شرح بخاری، تہذیب التہذیب، الدرایہ فی منتخب تخریج احادیث الہدایہ، الاصابہ فی تمییز الصحابہ آپ کی علمی حذاقت ومہارت کی روشن مثالیں ہیں۔ تقریب، الترغیب والترہیب

---

۱ الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ ۲ / ۲۹۲-۲۹۳ ابن حجر عسقلانی

۲ شذرات الذہب ۷ / ۲۷۰ ابن عماد حنبلی

۳ الضوء اللامع ج ۲ / ۳۹ سخاوی

۴ البدر الطالع ج ۱ / ۸۷ شوکانی

۵ بستان المحدثین ص ۱۲۸

بھی ابن حجر کی ایک اہم تالیف ہے۔ ۲۸ ذی الحجہ ۸۵۲ھ میں قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔

انتقاء الترغیب والترہیب کی خصوصیات مولانا حبیب الرحمن اعظمی اس کتاب کا تعارف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابن حجر عسقلانی نے منذری کی کتاب "الترغیب والترہیب" کا اختصار کیا ہے۔ حجم میں یہ اختصار اصل کتاب کے چوتھائی حصے کے برابر ہے۔ ابن حجر نے منذری سے انہیں حدیثوں کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جو سنداً قوی اور متناً صحیح ہیں۔ انہوں نے متحد المعانی احادیث میں سے چند کے ذکر پر اکتفاء کیا اور دوسروں پر ایک یا دو جملوں میں کلام کیا ہے۔ مولانا مزید فرماتے ہیں کہ یہ ایک عمدہ اور پاکیزہ کتاب ہے یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کی اسانید اور متون کی تحقیق کے بغیر ہی اس پر اعتماد کیا جائے۔[1]

تصحیح وتعلیق مولانا اعظمی کو جنہیں ہمیشہ نادر مخطوطات کی تلاش رہتی تھی مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے متروکات میں انتقاء الترغیب والترہیب کا سب سے پہلا مخطوطہ دستیاب ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں [illegible] کی سرپرستی میں دوسرا نسخہ ملا، اس کا تیسرا نسخہ مولانا الاعظمی کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے سے دستیاب ہوا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے پہلی مرتبہ جب انتقاء کا نسخہ دیکھا تھا تو اسی وقت اس کی تصحیح و طباعت کا ارادہ کر لیا تھا، لکھتے ہیں

"رأيت هذا المختصر في بهرائج وحضر ببالي خاطر طبعه بعد تصحيحه ليعم النفع به"[2]

(میں نے اس مختصر کو بہرائچ میں دیکھا اور تصحیح کر کے اس کی طباعت کا

۱۔ انتقاء الترغیب والترہیب ص۲

۲۔ ایضاً ص۳

کام کیا ہے۔ کیونکہ جن طلبہ کے لئے مطول سے استفادہ آسان نہ تھا ان کے لئے ابن حجر کی ''انتقاء'' ایک بہترین تحفہ ہے۔ اس کتاب کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ترغیب وترہیب کے سلسلہ میں بہت سی معتبر حدیثیں ایک ہی کتاب میں مل جاتی ہیں۔

تعلیقات کے نمونے:

۱۔ص ۳۳ ح ۱۲۳ ورجل صلى على جاره ولم يؤمر إلخ

دارالعلوم دیوبند اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ''انتقاء الترغیب والترہیب'' کے نسخوں میں 'لم یؤمر' کے بجائے 'لم یتوصا' لکھا ہوا تھا۔

مولانا اعظمی کے نزدیک یہ تصحیف تھی، صحیح 'لم یؤمر' ہے، جیسا کہ آپ متن میں دیکھ رہے ہیں۔

۲۔ص ۲۹ ح ۲۵۶ فإن الصدقة فكاكم إلخ

دیوبند کے نسخہ میں 'فكاكه' ہے، مولانا الاعظمی فرماتے ہیں کہ دیوبندی نسخہ میں 'فكاكه' غلط ہے، صحیح 'فكاكم' ہے۔ مولانا نے اپنی تصحیح کے سلسلہ میں منذری کا حوالہ دیا۔

۳۔ص ۹۵ ح ۳۵۸ "واما تحرك فهو مذخور لك عند ربك"

(رب کے نزدیک تمہاری قربانی ذخیرہ ہے)

بنیادی نسخہ اور لکھنؤ کے نسخہ میں 'مذخور' کے بجائے 'محور' تھا۔ مولانا الاعظمی نے منذری کی کتاب کے حوالہ سے اسکی تصویب وتصحیح کی اور متن میں 'مذخور' تحریر فرمایا، جس سے یہ جملہ بامعنی ہوا۔

رسالۃ الاوائل

محمد سعید بن سنبل مجازی، مکی شافعی المسلک فقیہ ہیں۔ مسجد حرام میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء میں طائف میں آپ کی وفات ہوئی۔ الاوائل السنبلیۃ، اجازات للسید علاء الدین، اسناد محمد سعید اور ثبت آپ کی تصنیفی یادگار ہیں۔[1]

رسالۃ الاوائل کی خصوصیت رسالۃ الاوائل کو الاوائل السنبلیۃ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب کیسے معرض وجود میں آئی خود سعید بن سنبل کے الفاظ میں سنئے

"طلب مني من له حسن ظن بي وهو أعلى مني أن أسمعه شيئاً من أوائل كتب الحديث المشهورة فأجبته لذلك وإن لم أكن أهلاً لذلك لكني وجدت تأليفاً لبعض الأعلام، فيه طول عن تحصيل المرام فأحببت أن ألخص مما ذكر فيه أول حديث من كل تأليف سطره تاركاً لباقيه روماً للاختصار وليقرأ في مجلس واحد لأهل الاستبصار"[2]

(بعض لوگوں نے جو مرتبہ میں مجھ سے بلند ہیں اور میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں، یہ خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں مشہور کتب حدیث سے شروع کی کچھ حدیثیں سناؤں۔ میں نے انکی یہ فرمائش قبول کر لی۔ اگرچہ میں اس کا اہل نہیں تھا، لیکن مجھے بعض مشاہیر کی ایک تالیف مل گئی جس میں تحصیل مقصد سے زیادہ طوالت تھی، چنانچہ کتاب میں مذکورہ باتوں کی

1۔ اعلام ج ۶ ص ۱۴۰

2۔ رسالۃ الاوائل

تلخیص کرنا میں نے بہتر سمجھا کہ جن کتابوں کا اس میں ذکر ہے کی پہلی حدیث کو نقل کروں اور اختصار کی غرض سے باقیہ کو چھوڑ دوں، ایسا اس لئے بھی کیا کہ ایک ہی مجلس میں اہل نظر کے سامنے انکی قرأت ہو جائے۔)

اس رسالہ میں سعید بن سنبل نے ۴۳ کتب حدیث سے ایک ایک حدیث اپنی سند سے نقل کی ہے۔

طباعت واشاعت پہلی مرتبہ اس رسالہ کو مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے مطابق مولانا نور محمد رشوی نے مطبعۃ اکمل المطابع (جو پہلے رسڑا میں قائم ہوا تھا پھر بہرائچ منتقل ہو گیا تھا) میں طبع کرایا تھا، دوسری مرتبہ مصر سے شائع ہوا لیکن افسوس کہ اس کے دونوں نسخے نایاب ہو گئے ہندو بیرون ہند اس کے نسخوں کا ملنا مشکل ہو گیا۔ بعض اہل علم نے مولانا اعظمی کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ مولانا کے پاس ہندوستانی ایڈیشن کا ایک نسخہ موجود تھا، جس میں بعض جگہ شیخ عبدالحق مہاجر مکی کی تعلیقات بھی تھیں لیکن اس ایڈیشن میں طباعت کی غلطیاں تھیں، مولانا لکھتے ہیں:

"وكان في تلك الطبعة بعض الأخطاء المطبعية فأصلحتها"[1]

(اور اس ایڈیشن میں طباعت کی وجہ غلطیاں تھیں، جنکی میں نے اصلاح کردی ہے۔)

اس طرح سے "رسالۃ الاوائل" جس کے دو ایڈیشن بہت پہلے شائع ہوئے تھے، لیکن انکے نسخے نایاب ہو چکے تھے، ایک بار پھر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی گرانقدر کاوشوں کے نتیجہ میں اسکے نسخے عام اور دستیاب ہیں۔ "رسالۃ الاوائل" کا یہ تیسرا ایڈیشن مولانا اعظمی کی تصحیح و اصلاح کے ساتھ ۱۳۸۲ھ ۱۹۶۲ء میں مکتبہ الاعظمی

---

[1] رسالۃ الاوائل

مطبع علوم محمدیہ سے شائع ہوا۔

آخر میں صفحہ ۳ پر مولانا اعظمی نے اپنے مشفق استاد محترم حضرت مولانا عبدالغفار صاحب کی جانب سے رسالۃ الاوائل کی عطا کردہ اجازت و سند بھی نقل فرمایا ہے، اور صفحہ ۴۴ پر مولانا اعظمی نے مولانا عبدالغفار صاحب کی جانب سے کتب صحاح، جوامع، سنن، مسانید، مسلسلات اور اوراد و اذکار وغیرہ تمام چیزوں کی اجازت کا ذکر کیا ہے، جس کو سوانح کے باب میں نقل کیا جا چکا ہے۔

مسند حمیدی

مسند اس مجموعۂ حدیث کو کہتے ہیں جس میں احادیث کے موضوعات اور ابواب کا لحاظ کیے بغیر ہر صحابی کی علیحدہ علیحدہ حدیثیں مع اپنی اسناد کے جمع کر دی گئی ہوں یا مسانید کے مرتب کرنے میں بیشتر الفبائیت کا اعتبار کیا جاتا ہے کہ پہلے خلفائے اربعہ پھر عشرہ مبشرہ اور جماعت اربعہ میں بھی پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر حضرت عمرؓ وغیرہ بالترتیب کی مسانید کو نقل کیا جاتا ہے۔[1]

مسانید بہت ہیں، شیخ محمد بن جعفر الکتانی نے ۸۰ سے زائد مسانید کا ذکر کیا ہے، اور پھر آخر میں کہا "**والمسانید کثیرۃ سوی ما ذکرناہ**"[2] اہل اصول لکھتے ہیں کہ مسانید کا درجہ سنن سے کمتر ہے کیونکہ صاحب سنن انہیں حدیثوں کو نقل کرتے ہیں جو ان کی نظر میں سب سے صحیح ہوتی ہیں، برخلاف مسانید کے مرتب کرنے والوں کے، کہ وہ اپنی مسند میں صحابی کی روایت کردہ ہر حدیث نقل کرتے ہیں خواہ وہ قابل حجت ہو یا نہ ہو۔[3]

---

[1] مسند ابو داؤد طیالسی ص ۵۰ ابو داؤد طیالسی

[2] الرسالۃ المستطرفہ ص ۶۳ محمد بن جعفر الکتانی

[3] مقدمہ ابن الصلاح ص ۳۳ ابن صلاح

مختلف معیارات سے مختلف ائمہ حدیث نے مسانید مرتب کی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ کس نے سب سے پہلے مسند مرتب کی، ذہبی نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ بصرہ میں سب سے پہلے مسند مرتب کرنے والے ابوداود طیالسی ہیں۔[1] امام حاکم کا کہنا ہے کہ تاریخ اسلام میں سب سے پہلے رجال کے اعتبار سے مسند کی تصنیف کرنے والوں میں عبیداللہ بن موسیٰ عبسی اور ابوداود طیالسی ہیں۔[2] اگرچہ مسند ابوداود طیالسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابوداود طیالسی کی مرتب کردہ نہیں ہے، بلکہ بعض خراسانی حفاظ نے اسے مرتب کیا تھا۔[3]

ابن عدی عبداللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ کوفہ میں سب سے پہلے یحییٰ حمانی نے، بصرہ میں مسدد نے اور مصر میں اسد السنہ نے مسانید مرتب کیں۔[4] ابن خطیب لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے مسند تصنیف کرنے والے نعیم بن حماد ہیں۔[5] مسانید مرتب کرنے والوں میں امام حمیدی کا بھی نام آتا ہے، سب سے پہلے مکہ مکرمہ میں مسند مرتب کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔[6]

قطع نظر اس کے کہ کس نے سب سے پہلے مسند مرتب کی یہ بات تو یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا ائمہ حدیث مسانید کی تالیف میں صف اول میں ہیں۔

امام حمیدی: ابوبکر عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ قرشی، اسدی، مسلکاً صاحب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قصی میں اور زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ سے اسد بن عبدالعزیٰ پر جا کر ملتا ہے۔[7]

---

1. سیر اعلام النبلاء ۹/۵۵۳ ذہبی
2. تدریب الراوی ۲/۲۰۴ جلال الدین سیوطی — 3. ایضاً
4. الکامل ۹/۹۸ ابن عدی
5. تاریخ بغداد ۱۳/۳۰۸ خطیب بغدادی
6. مسند امام احمد بن حنبل ۱/۵۶۱
7. عمدۃ القاری ۳۲ بدر الدین عینی

شیوخ میں ابراہیم بن سعد، فضیل بن عیاض، سفیان بن عیینہ، امام شافعی وغیرہ، تلامذہ اور امام بخاری، محمد بن یونس، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو زرعہ، بشر بن موسیٰ جیسے ائمہ حدیث کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

علم و فن میں امام حمیدی کا مقام بہت بلند ہے، حدیث اور فقہ میں آپ کو ایسا درجہ کمال حاصل تھا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو حمیدی کی روایت سے صرف اس لئے شروع کیا کہ وہ قریش میں سب سے بڑے فقیہ تھے[1] حافظہ کی قوت و مضبوطی کا امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کسی بلغمی مزاج شخص کو حمیدی سے زیادہ حافظ نہیں دیکھا، انہیں صرف سفیان بن عیینہ سے دس ہزار حدیثیں یاد تھیں[2]

یعقوب فسوی کا بیان ہے کہ میری ملاقات کسی ایسے شخص سے نہیں ہوئی جو حمیدی سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہو[3] عبدالرحمن نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابن عیینہ سے روایت کرنے میں حمیدی سب سے زیادہ معتبر ہیں، وہ اصحاب عیینہ کے سردار ہیں، ثقہ ہیں، امام ہیں[4] جب امام بخاری کو کوئی حدیث ان سے مل جاتی تو پھر کسی دوسرے ثقہ راوی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہ سمجھتے، بخاری نے ان سے ۷۵ حدیثیں روایت کی ہیں[5]

امام حمیدی کی سیرت کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ مذہب عراق کے سلسلہ میں سخت گیر تھے، ان کے بارے میں سخت کلامی کیا کرتے، حمیدی کو جب غصہ آتا تو

۱ فتح الباری ۱: ۱۰ ابن حجر عسقلانی

۲ طبقات الشافعیہ ۱: ۲۶۳ ابن سبکی

۳ سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۱۷

۴ الجرح والتعدیل ج ۲ قسم ۲ ص ۵۷، عمدۃ القاری ۲۵، سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۶۱۷، تہذیب التہذیب ۵: ۲۴۳

۵ تہذیب التہذیب ۵: ۱۴۳ ابن حجر عسقلانی

برخوردار ہو جاتے اور فضاؤں میں درتی و تخی پر آ جاتے۔

امام حمیدی کی جلالت علمی، فضل و کمال اور حدیث میں آپ کی امامت، کو محدثین نے فراخ دلی کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ اور آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ ... ہے۔[1] امام صاحب کا مکہ مکرمہ میں ۲۱۹ھ میں انتقال ہوا۔[2] امام حمیدی کی چند اہم تصانیف تھیں۔ آپ کی تصنیفات میں کتاب الرد علی النعمان اور کتاب التفسیر عن الحمیدی کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انکی سب سے مشہور تصنیف "مسند" ہے۔

مسند حمیدی کی خصوصیات | یہ امام حمیدی کی شہرۂ آفاق حدیث کی کتاب ہے، اس میں ۱۲۹۳ حدیثیں ہیں، بیشتر مرفوع ہیں، صحابہ و تابعین کے کچھ آثار بھی منقول ہیں۔ پہلی حدیث حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے۔ حالانکہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے بستان المحدثین میں مسند حمیدی کی جو پہلی حدیث نقل کی ہے وہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔[3]

لیکن یہ واقعہ کے بالکل برعکس ہے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اس بابت تحریر فرماتے ہیں

ولعله لم يقف على مسند الحميدي وكان عمدة نقله عن بعض المصنفين واعتمده والواقع خلاف ذلك، فإن أول مسند الحميدي كما ترى حديث أبي بكر الصديق في صلوة التوبة وكيف يفتتح الحميدي مسنده بحديث جابر وقد جرت عادة مصنفي المسانيد أنهم يفتتحون

---

[1] مقدمہ مسند حمیدی

[2] کتاب الانساب ۲/۹۲ سمعانی

[3] بستان المحدثین ۹۳

مسانیدھم باحادیث ابی بکر الصدیق[1]

(شاید شاہ صاحب کو مسند حمیدی کا (اصل) نسخہ نہ ملا ہو اور ان کے پاس کسی مصنف کا نقل کردہ نسخہ ہو اور اسی پر وہ اعتماد کر بیٹھے ہوں۔ یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے، کیونکہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسند حمیدی کی پہلی حدیث حضرت ابوبکر صدیق سے نماز توبہ کے سلسلہ میں مروی ہے۔ اور یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ حمیدی اپنی مسند کو حضرت جابر کی حدیث سے شروع کریں جبکہ عام طور پر مصنفین اپنی مسانید کی ابتدا حضرت ابوبکر صدیق کی روایات سے کرتے ہیں۔)

یہ مسند گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے، یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ کتاب میں "الجزء العاشر" عنوان کے بعد حدیث نمبر ۱۲۴۲ پر "تم الجزء" لکھا ہوا ہے، حالانکہ اسکے بعد قاعدہ کی رو سے "اول الجزء الحادي عشر" لکھا جانا چاہئے، جو کہیں نہیں ہوا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ کتاب کا کوئی جزو ناقص رہ گیا ہو۔

اس کتاب کے گیارہ ہی اجزاء ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہوجاتا ہے کہ کاتبین و کتاب کے اجزاء میں ایجاز واطناب کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی وجہ سے ترتیب میں کمی یا زیادتی ہوجاتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حدیث نمبر ۱۲۴۲ کے بعد "الجزء الحادي عشر" کا عنوان درج ہونے سے رہ گیا ہو۔[2]

مسند حمیدی کے رواۃ | حمیدی سے مسند کو ابواسمٰعیل سلمی متوفی ۲۸۰ھ نے اور ابواسمٰعیل سے قاسم بن اصبغ نے روایت کیا ہے، دوسرے جلیل القدر راوی بشر بن موسیٰ اسدی متوفی ۲۸۸ھ ہیں، حافظ ابن حجر کے بقول حمیدی سے مسند کی روایت کرنے

---

1. مقدمہ مسند حمیدی
2. ایضاً ص ۲

والے اور بھی کئی راوی ہیں۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسند حمیدی کا جو مخطوطہ محفوظ
ہے وہ صرف بشر بن موسیٰ کی روایت کا ہے، مولانا اعظمی نے اسی نسخہ کو مرتب کیا ہے۔[1]

تصحیح وتعلیق

قدیم مسانید کے بارے میں ہم قدیم زمانہ سے سنتے چلے آ رہے تھے
لیکن ان سے استفادہ آسان تو کیا، ناممکن سا تھا۔ مخطوطات کی شکل میں یہ ذخیرۂ
حدیث دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی خال خال ہی پایا جاتا، یہ قیمتی سرمایۂ
حدیث ضائع ہی ہونے کو تھا، یہ تو دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کا امت مسلمہ پر
دیگر احسانات میں سے ایک زبردست احسان ہے کہ 'مسند ابوداؤد طیالسی' کو پہلی مرتبہ
۱۳۲۱ھ میں طبع کر کے عام کیا اور ہم ایک فرض کفایہ سے عہدہ برآ ہو گئے۔ ایک عرصہ
سے مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے دل میں یہ خواہش تھی کہ کاش کوئی اللہ کا بندہ اس
کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا اور بقیہ مسانید کی بھی دریافت کرتا جس سے مستشرقین
کی طرف سے صحاح پر ہونے والے ان اعتراضات کی بھی تردید ہو جاتی کہ تدوین
احادیث میں مرور زمانہ کا اثر ضرور رہا ہوگا، جس کے باعث یہ ذخیرے قابل اعتماد
نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس نیک آرزو کی تکمیل کا شرف مولانا الاعظمی کو ہی بخشا، مولانا
کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں مسند حمیدی کا ایک مخطوطہ مل گیا۔[2] تلاش وجستجو

---

[1] مآثر و معارف ص ۲۰۶ قاضی اطہر مبارکپوری

[2] مسند حمیدی کا یہ قلمی نسخہ بڑے سائز پر ہے، ۱۴۳ صفحات ہیں، ہر صفحہ پر ۲۵ سطریں ہیں، ہر دو
ورق کے درمیان ایک سادہ ورق ہے، شروع میں فہرست بھی ہے، سن کتابت ۱۲۲۳ھ ہے، کاتب کا
نام درج نہیں۔ (تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند ۱/۱۲۵، ۲۰۶ مفتی محمد ظفیر الدین)
مسند حمیدی کے دو ہندی نسخے کے دو کاتب ہیں، ایک تو خود ایک مخطوطہ مولانا [illegible] کی
ہیں اور دوسرے میاں نذیر حسین صاحب کے شاگرد مولوی حافظ نذیر حسین [illegible]
ہیں۔ (رد القلب والتلقین باحادیث ترتیب رب العالمین صفحہ ۱۱ مولانا احمد اللہ قاسمی)

کے بعد ۱۹۵۸ء میں مکتبہ سعیدیہ میں مسند حمیدی کا دوسرا نسخہ دستیاب ہوا، جو ۱۳۱۱ھ کا مکتوبہ تھا، ان دو نسخوں کے ہاتھ لگ جانے پر مولانا نے مسند حمیدی کی تحقیق و تحشیہ کا پختہ ارادہ کر لیا، اسی اثناء میں ۵۹۰ھ سے پہلے کے لکھے ہوئے ایک اور نسخہ کی اطلاع ملی جو کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں موجود تھا۔ عثمانیہ کا قلمی نسخہ سب سے زیادہ صحیح اور قدیم تھا۔

انہیں تین نسخوں کی مدد سے تحقیق کا کام شروع ہوا، مولانا نے دیوبند کے نسخہ کو بنیادی نسخہ قرار دیا اور اس کا مقابلہ مکتبہ سعیدیہ اور جامعہ عثمانیہ کے نسخوں سے کیا، ایک ایک حدیث کو ان تینوں نسخوں سے ملایا گیا اور ایک ایک لفظ و حرف کا پوری امانت و دیانت کے ساتھ پاس و لحاظ رکھا گیا۔ جب مسند حمیدی کی طباعت کا کام شروع ہو تو اسی دوران دار الکتب الظاہریہ دمشق سے مائکروفلم کے ذریعہ تیار کردہ مسند حمیدی کا چوتھا نسخہ ملا، جس سے تصحیح و تحشیہ میں کافی کچھ مدد ملی۔

مولانا نے صرف تصحیح پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ احادیث کی امہات کتب اور متداول کتابوں سے تخریج بھی کی کہ کن کن کتابوں میں، کہاں پر، اور کن طرق سے یہ احادیث آئی ہیں۔ زیادہ تر صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے، جہاں ضرورت پڑی وہاں الفاظ غریبہ کی تشریح و توضیح بھی کی اور اختلاف نسخ کو بھی واضح کیا۔ مسند حمیدی کے اخیر میں اصول سنت سے متعلق حمیدی کا ایک مختصر رسالہ بھی ہے، یہ رسالہ چار ورق مخطوطات میں تھا، مولانا نے اس کو اسی طرح سے مسند کے اخیر میں ملحق کر کے شائع کیا۔

اس کتاب میں مسانید کو جمع کیا گیا ہے یعنی درجات صحابہ کے اعتبار سے احادیث مرتب کی گئی ہیں، اس لئے اگر کسی صحابی کی حدیث کی تلاش ہو تو باسانی مل جائے گی، لیکن اگر فقہی مسئلہ سے متعلق حدیث تلاش کی جائے تو یقیناً یہ ایک دشوار گزار

امر ہوگا اس دقت سے بچنے کے لئے مولانا اعظمی نے جدید اسلوب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند فہرستیں تیار کیں، فقہی ابواب کی ترتیب کے مطابق ایک فہرست، عام واقعہ کی فہرست، اور ایک فہرست مسانید کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں صحابی کی حدیث فلاں صفحہ پر ہے۔ مسانید کی فہرست مولانا اعظمی کی تیار کردہ نہیں ہے بلکہ یہ فہرست مولانا محی الدین الہ آبادی نے مرتب کی تھی، جس کا تذکرہ خود مولانا اعظمی نے مقدمہ میں کیا ہے[1] یہ شمارہ دیوبند کے نسخہ سے ملحق تھا، دیوبند کا نسخہ مولانا محی الدین الہ آبادی کی ہی ملک تھا، جسکو انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو وقف کردیا تھا۔[2]

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے ۲۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب پر مقدمہ بھی لکھا، جس میں مسانید کی تاریخ، مسند حمیدی کا تعارف اور اس کے رواۃ کے مختصر حالات تحریر کئے۔ اس مسند کو کس طرح مرتب کیا گیا، تصحیح و تحشیہ میں کن امور کا لحاظ رکھا گیا، مولانا نے ان تمام باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اخیر میں انہوں نے اپنے فرزند مولانا رشید احمد صاحب اور شاگرد عزیز مولانا عبدالستار صاحب کا ذکر کرتے ہوئے انہیں دعائیں دیں کہ انہوں نے مسند حمیدی کے نقل و تبییض اور نسخوں کے باہم مقابلہ میں تعاون کیا۔

مولانا نے تحقیق کے کام کو یہیں نہیں روک دیا، بلکہ پوری مسند کا غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کیا کہ کہیں کوئی غلطی نہ رہ جائے اور اپنی ہی تحریر میں جلد اول میں چوبیس صفحات پر استدراکات لکھے اور فروگزاشتوں کی اصلاح کی۔ اور جلد ثانی میں "الاستدراک والتعقیب" کا عنوان قائم کرکے تین صفحات میں اغلاط کی تصحیح کی۔

---

[1] مولانا محی الدین جعفری زینبی بانی مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد مولانا حکیم فخر الدین صاحب کے والد ماجد تھے۔

[2] مقدمہ مسند حمیدی

مسند حمیدی مجلس علمی ۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی
(مجلس) سے شائع ہوئی۔ مسند حمیدی کی اشاعت میں جناب مولانا محمد یوسف بنوری
صاحب مؤسس مجلس علمی (کراچی وصنف) کا نام گرامی ادا رہا ہے۔ مولانا اعظمی نے
مقدمہ میں ان کا نام بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیا ہے۔

تحقیق میں خیانت کا الزام ہشام اعظمی نے مسند حمیدی کی تحقیق میں مولانا
اعظمی پر خیانت اور خرد برد کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں سخت انداز
نگارش اختیار کیا ہے مناظرانہ رنگ طرز تحقیق پر غالب ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے
کہ تنقید کے لئے نامناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے، بلکہ ناشائستہ الفاظ سے تنقید
وتحقیق کا معیار پست ہو جاتا ہے۔ ہشام صاحب کا یہ مضمون "مولانا ابو المآثر
حبیب الرحمن الاعظمی کی حدیث رسول میں ناروا خیانت اور جسارت" کے عنوان سے
مجلہ "محدث" (مارچ ۱۹۸۶ء) میں شائع ہوا تھا جس حدیث کو بنیاد بنا کر
اعتراضات کئے گئے ہیں، پہلے وہ حدیث نقل کی جاتی ہے تاکہ اعتراض کی نوعیت
بالکل واضح ہو جائے

حدیث نمبر ۶۱۳ حدثنا الحميدي قال ثنا الزهري قال أخبرني
سالم بن عبد الله عن أبيه قال: رأيت رسول الله صلى الله
عليه وسلم إذا افتتح الصلوة رفع يديه حذو منكبيه، وإذا
أراد أن يركع وبعدما يرفع رأسه من الركوع فلا يرفع ولا
بين السجدتين.

(حمیدی نے کہا کہ ہم سے زہری نے بیان کیا، زہری نے کہا کہ ہم سے
سالم بن عبد اللہ نے اپنے والد کے حوالے کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جس وقت آپ نماز شروع کرتے تو

اپنے ہاتھوں کو دونوں شانوں تک اٹھاتے۔ اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد تو ہاتھ نہیں اٹھاتے اور نہ ہی دونوں سجدوں کے درمیان۔)

اس حدیث میں کئی طرح سے قطع و برید کا الزام ہے، ایک تو یہ کہ مخطوطہ (مکتبۂ ظاہریہ) میں 'حدثنا الحمیدي' کے بعد 'ثنا سفیان' ہے مگر مولانا نے سفیان کو ساقط کر دیا، اسکے بعد 'ثنا الزهري' ہے مگر مولانا نے 'ثنا' کو گرا دیا اور 'الزهري' کو سفیان سے قبل والے 'ثنا' کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اس طرح امام زہری کو امام حمیدی کا براہ راست استاذ بنا دیا گیا، اور امام زہری سے امام حمیدی کا سماع بھی ثابت کر دیا گیا، حالانکہ امام زہری رمضان سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پا چکے تھے اور امام حمیدی امام شافعی (پیدائش ۱۵۰ھ) کے شاگرد ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ امام حمیدی کو اپنی پیدائش سے پہلے ہی امام زہری سے ملاقات، شاگردی اور سماع کا شرف حاصل ہو گیا۔

تحریف کا دوسرا الزام یہ ہے کہ "واذا اراد ان یرکع وبعدما یرفع رأسه من الرکوع" کے بعد صرف ایک فقرہ ہے "ولا یرفع بین السجدتین" لیکن مولانا نے 'ولا یرفع' کے 'واؤ' کو 'ف' سے بدل کر 'فلا یرفع' کر دیا اور اس تحریف سے پیدا ہونے والے معنی کو صحیح بنانے کے لئے مولانا نے جدید کتابت کا سہارا لیتے ہوئے 'حذو منکبیه' کے بعد اور 'واذا اراد' سے پہلے '،' لگا دیا، اس سے ترجمہ میں 'بین السجدتین' مہمل ہو جاتا ہے، اس لئے اس تحریف کو سلامت رکھنے کے لئے موصوف نے ایک اور تحریف کی یعنی 'بین السجدتین' سے پہلے لفظ 'ولا' بڑھا دیا۔

خلاصہ یہ کہ مسند حمیدی کی حدیث اثبات رفع یدین کی تھی۔ [illegible]

۱؎ محدث ش ۳ ج ۵ ص ۳۶-۳۷

حدیث ترک رفع یدین کی حدیث بنا دی گئی۔

الزام تراشی کا جواب دراصل حدیث کی نقل میں سہو ہو گیا ہے، معترض کو ۱۹۹۲ء میں یہ بات سوجھی جبکہ مولانا اعظمی نے ۱۹۶۵ء میں ہی روایات حدیث میں سند ایک کے چھوٹ جانے کا اعتراف کیا ہے، جب پاکستان کے ایک عالم نے اس مسئلہ کی وضاحت چاہی تھی۔ ۱۵/اگست ۱۹۶۵ء کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان قال حدثنا الزهری الخ
مسند حمیدی کے نسخۂ مکتبہ ظاہریہ اور اسکے ہندوستانی مخطوطات میں بھی یوں
ہی ہے، مطبوعہ نسخوں میں حرف جوڑنے والوں کی غلطی سے قال حدثنا
سفیان چھوٹ گیا ہے، غلط نامہ میں اسکو دینا چاہیے تھا مگر سہواً رہ گیا۔"[1]

اس تحریر کے بعد مولانا پر خیانت کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے؟ اور جہاں تک الفاظ میں پھیر بدل کی بات ہے تو اس سلسلہ میں واضح رہے کہ مولانا اعظمی نے تین نسخوں کی مدد سے تحقیق کا کام شروع کیا تھا، ان میں بھی دیوبند کے نسخہ کو اصل قرار دیا تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ ان تینوں مخطوطات میں حدیث کے یہی وہی الفاظ موجود ہیں۔ مولانا اعظمی نے اس حدیث پر حاشیہ لگایا اور اختلاف روایت کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"أخرج البخاري أصل الحديث من طريق يونس عن
الزهري وأما رواية سفيان عنه فأخرجها أحمد في مسنده
وأبو داؤد عن أحمد في سننه لكن رواية أحمد عن سفيان
تخالف رواية المصنف عنه ففي مسند أحمد رأيت رسول

---

[1] المآثر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء ص ۴۳

[2] حاشیے میں سفیان کی روایت کا حوالہ دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ متن میں سہو ہوا ہے ...

الله صلى الله عليه وسلم إذا افتتح الصلاة رفع يديه حتى يحاذي منكبيه وإذا أراد أن يركع وبعدما يرفع رأسه من الركوع وقال سفيان مرة وإذا رفع رأسه وأكثر ما كان يقول وبعد ما يرفع رأسه من الركوع ولا يرفع بين السجدتين (ج ۲ ص ۸) لحقيقه كما ترى اثبات الرفع عند الركوع والرفع منه ونفيه بين السجدتين، وفي رواية الحميدي نفيه في الركوع والرفع منه ونفيه بين السجدتين جميعاً"[۱]

(بخاری نے اصل حدیث کو یونس عن الزہری کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں یہ حدیث سفیان عن الزہری کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں یہ حدیث امام احمد کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ لیکن سفیان سے احمد بن حنبل کی روایت کردہ حدیث حمیدی کی روایت سے مختلف ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھاتے اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھانے کے بعد سفیان کبھی کہتے کہ آپ ﷺ جب سر اٹھاتے اور اکثر یہ کہا کرتے کہ رکوع سے سر اٹھانے کے بعد اور دونوں سجدوں کے درمیان ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ (جلد ۲ ص ۸) اس روایت میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے اور سجدوں کے درمیان اس کی نفی ہے۔ اور حمیدی کی روایت میں رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھنے کے وقت اور

---

[۱] مسند حمیدی ج ۲ ص ۲۷۷-۲۷۸

دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کی نفی ہے۔)

مولانا اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں: ولم يتعرض احد من المحدثين لرواية الحميدي هذه[1] اس جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصولی طور پر اس حدیث کی روایت اور صحت پر کلام کی گنجائش نہیں۔

یہ خیانت کے بجائے علمی دیانت کا اعلیٰ معیار ہے کہ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے حدیث سے مسلک حنفی کی دلیل بنانے کے بجائے اس حدیث کی تحقیق کی اور علمی حیثیت بھی متعین کی۔ معترض نے جس اعتراض کی بنیاد مکتبہ ظاہریہ کے مخطوطہ پر رکھی ہے، ممکن ہے کہ اس نسخہ میں غلطی ہو، کیونکہ یہی روایت اسی سند و متن کے ساتھ مسند ابی عوانہ میں بھی ہے۔

مکتبہ ظاہریہ کے نسخہ میں غلط ونقش کے منافی پہلو کی جانب مولانا عمار صاحب نے متوجہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مسند ابی عوانہ کی حدیث پیش کی اور اس سند پر شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا مجاہد احمد صاحب کی تحریر ملاحظہ ہو:

"حدثنا عبد الله بن ايوب المخرمي وسعدان بن نصر وشعيب بن عمرو في آخرين قالوا حدثنا سفيان بن عيينة عن الزهري عن سالم عن ابيه قال رأيت رسول الله ﷺ اذا افتتح الصلوة يرفع يديه حتى يحاذي بهما وقال بعضهم حذو منكبيه واذا اراد ان يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع لا يرفعهما وقال بعضهم ولا يرفع بين السجدتين

ابوعوانہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن ایوب مخرمی اور سعدان بن نصر

---

[1] مسند حمیدی ۲ ۲۷۸

اور شعیب بن عمرو نے حدیث بیان کی ان سے سفیان بن عیینہ نے زہری
کے واسطے سے، انھوں نے سالم کے واسطے سے، وہ اپنے والد کے واسطے
سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ
ﷺ کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو
کندھوں تک اٹھاتے تھے اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر
اٹھانے کے بعد نہیں اٹھاتے تھے اور بعض نے کہا کہ دونوں سجدوں کے
درمیان نہیں اٹھاتے تھے۔ پھر اس کے بعد ہے کہ

حدثنا الصائغ بمكة قال حدثني الحميدي قال حدثنا سفيان عن الزهري قال أخبرني سالم عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ مثله مطلب یہ ہے کہ حمیدی نے بھی سابقہ سند کے ساتھ اسی کے مثل روایت کیا ہے جیسے پہلی روایت گزری۔

جب تو سفیان سے روایت کرنے والے تنہا حمیدی نہیں ہیں بلکہ
راوی اور اسی طرح روایت کرتے ہیں تو کیا اس کی بنیاد پر نہیں کہا جا سکتا
کہ بظاہر یہ ممکن ہے کہ کاتب سے کچھ تصرف واقع ہو گیا ہو اور صحیح
روایت وہ ہو جو حضرت محدث کے ہاں پہلے سے تھی؟ بہرحال
جب یہ حدیث اسی طرح اسی سند و متن کے ساتھ حافظ ابو عوانہ نے صائغ
کے حوالے سے، حمیدی سے نقل کی ہے تو اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں
ہے کہ مسند حمیدی کے مطبوعہ ایڈیشن میں جو متن درج کیا گیا ہے، اس کی
نسبت امام حمیدی کی جانب درست ہے، اور مسند حمیدی کی روایت اصل
ہے۔ کیونکہ اسی کی تائید مسند ابی عوانہ سے ہو رہی ہے، اور مکتبہ ظاہریہ
کے نسخہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے حضرت سفیان بن عیینہ کے

دوسرے جلیل القدر تلامذہ مثلاً یونس اور امام احمد بن حنبل سے جو اقوال
منقول ہیں وہی لکھ دیے ہیں ورنہ حمیدی سے جو کچھ منقول ہے وہ وہی
ہے جو مسند میں ہے"[1]

جب مسند حمیدی منظر عام پر آئی تو علمی حلقوں میں حدیث کی اس خدمت کی
زبردست پذیرائی ہوئی۔ اس کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کے مشہور علمی رسائل
میں اس پر تبصرے اور ریویو لکھے گئے۔ مشہور محدث اور فقیہ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے
مسند حمیدی کی جلد اول پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ:

"وقد صدر منه الجزء الأول محققاً عن أربع نسخ
مخطوطة، في طباعة جيدة متقنة، وبتحقيق وتعليق العلامة
الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن
الأعظمي الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب
وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة العالية على
العلامة الشيخ أحمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقيقه
لكتاب "مسند أحمد"، وقد أتم حفظه الله تعالى صنيعه
الجميل في إخراج هذا "المسند" أحسن إتمام."[2]

(چار نسخوں کی مدد سے تحقیق وتصحیح کے بعد مسند حمیدی کی جلد اول عمدہ اور
صاف ستھری طباعت کے ساتھ شائع ہوئی، تحقیق وتعلیق کا کارنامہ علامہ
کبیر محقق محدث مولانا شیخ حبیب الرحمن الاعظمی نے انجام دیا، جن کو شام،
مصر، مغرب وغیرہ ممالک کے علماء نے ان کی تحقیقات اور "مسند احمد" کی

---

[1] الماثر جون تا ستمبر ۱۹۹۲ء ص ۴۵-۴۷

[2] مجلۃ المجمع العلمی العربی ج ۳۸ جز ۲، ص ۲۸۸

(اور اس کی تحقیق و تعلیق فضیلۃ استاذ شیخ حبیب الرحمن اعظمی نے
کی ہے، انہوں نے اسکی تحقیق و تعلیق میں نہایت درجہ محنت کا مظاہرہ کیا ہے،
اپنے اس کارنامہ پر وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔)

تحقیقات کے نمونے

- ج اص ۲ ح ۱ اخبرنا الحمیدي، اخبرنا سفیان بن عیینہ ثنا محمد
ثنا مسعر بن کدام عن عثمان بن مغیرۃ الخ

اصل نسخہ (دیوبند کے نسخہ) میں "عثمان" کے بجائے "عمر" تھا،
لیکن اسی نسخہ کے حاشیہ میں کاتب نے "عثمان" بھی لکھا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں
بھی "عمر" ہی تھا، اور چونکہ دیوبند اور مکتبہ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخوں میں خال خال
ہی اختلاف تھا اس لئے اس میں بھی ایسا ہی تھا، لیکن مولانا نے متن میں "عثمان"
تحریر فرمایا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

چنانچہ اب ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ متن میں مولانا اعظمی نے
"عمر" اور "عثمان" میں "عثمان" کا انتخاب کیوں کیا؟ محقق علام نے حدیث
اور رجال حدیث سے متعلق اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کی تصحیح
کے سلسلہ میں حوالے دیئے کہ امام احمد نے مسند احمد میں مسعر اور ثوری کے طریق سے
عثمان بن مغیرہ سے نقل کیا ہے۔ (ج ۱ ص ۲) امام ترمذی نے بھی ابوعوانہ کے طریق
سے عثمان بن مغیرہ سے اسی حدیث کو نقل کیا ہے۔ (ج ۱ ص ۳۳) اسی طرح مسند
حمیدی، ابن سنی کی "عمل الیوم واللیلۃ" میں بھی عثمان بن مغیرہ ہی ہے۔

پھر اب مسئلہ یہ ہے کہ مخطوطوں میں "عثمان" کے بجائے "عمر" کیسے
لکھ دیا گیا؟ مولانا اعظمی اسکی توجیہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ کاتب نے
"عثمان" کو "عمر" کے انداز میں لکھ دیا ہوگا، اور اس پر نقطے نہیں لگائے، اب کسی

دوسرے کاتب نے دیکھا تو سمجھ لیا کہ "عــمــر" نسخہ نواب اس سے بیان نقل کر دیا۔

۲- ج ۱ص ۳۵ ح ۶۳ حدثنا الحميدي، ثنا سفيان، ثنا عمرو بن دينار قال سمعت بجالة إلخ

اصل نسخہ میں "جالداً" تھا، مولانا الاعظمی کے نزدیک "خالداً" غلط ہے، انہوں نے اسکی جگہ پر "بجالة" تحریر فرمایا جیسا کہ ہم متن میں دیکھ رہے ہیں۔ مولانا نے اپنی تصحیح کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے کہ امام بخاری نے (ج ۶ ص ۱۶۳)، امام احمد نے (ج ۳ ص ۱۲۳) اور امام ترمذی نے (ج ۲ ص ۳۹۳) میں اس حدیث کو نقل کیا ہے، اور سبھی کے نزدیک "بجالة" ہی ہے۔

۳- ج ۲ ص ۲۹۰ ح ۶۵۴ -حدثنا الحميدي قال، ثنا سفيان قال ثنا ابن جريج إلخ

ایک ایک حدیث کے سلسلہ میں مولانا الاعظمی پوری طرح سے واقف وباخبر نظر آتے ہیں کہ بعینہ وہ حدیث یا اس مضمون کی حدیث کس کتاب میں کس واسطے سے موجود ہے اور کن راویوں نے اسکو روایت کیا ہے ان تمام چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے مالک اور لیث کے طریق سے مرفوعاً اس کو روایت کیا ہے (ج ۴ ص ۲۲۶، ۲۲۹)، امام بخاری نے مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح یحییٰ بن سعید کے طریق سے دوسرے لفظوں میں بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے (ج ۴ ص ۲۲۵)۔

کتاب الزہد والرقاق

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "اذا رأیتم الرجل قد

أعطي زهداً في الدنيا وقلة منطق فاقتربوا منه فإنه يلقى الحكمة[1]

(جب تم ایسے شخص کو دیکھو جسکو زہد ورقت گویائی عطا کی گئی ہو تو اس سے قربت اختیار کرو کیونکہ اس پر حکمت القا کی جاتی ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مندرجہ بالا حدیث میں زہد کو حکمت کی علامت قرار دیتے ہیں، زہد ایک ایسی نعمت ہے کہ جسکو نصیب ہوگئی تو بس زندگی کا مقصد اصلی حاصل ہوگیا۔ دنیا کی رعنائیوں سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگ جانے کا نام زہد ہے۔ امام غزالی زہد کی تعریف یوں فرماتے ہیں

الزهد عبارة عن رغبته عن الدنيا عدولاً إلى الآخرة أو عن غير الله تعالى عدولاً إلى الله تعالى[2]

(زہد دنیا سے اعراض کرکے آخرت کی طرف یا اللہ کے ماسوا سے اللہ کی طرف رجوع کرنے کا نام ہے۔)

رقائق رقیقۃ سے ہے رقۃ کے معنی رحمت (نرمی) کے ہیں، اسکی ضد صلابۃ (سختی) ہے۔ اس باب میں آنے والی احادیث کو اس نام سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ ان احادیث میں وعظ وتنبیہ ہوتی ہے، جس سے دل میں نرمی اور رقت پیدا ہوتی ہے۔[3] زہد ورقاق کے موضوع پر بہت سی کتب حدیث تصنیف کی گئیں۔ اس موضوع پر مستقل کتاب تصنیف کرنے والوں میں معافی بن عمران موصلی، وکیع بن جراح، اسد

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۳۰۲

[2] احیاء علوم الدین ۳۰۲۰۴ امام غزالی

[3] ارشاد الساری ۳ ۲ ۲ شہاب الدین قسطلانی

ابن مہدی، امام احمد بن حنبل، امام ابو داؤد، ابن شاہین، بیہقی، نسائی اور عبداللہ بن مبارک وغیرہ محدثین عظام کے نام قابل ذکر ہیں۔

عبداللہ بن مبارک (۱۱۸ھ-۱۸۱ھ) حضرت عبداللہ بن مبارک کے گوناگوں اوصاف، کمالات نے ان کی ذات کو مسلمانوں کا مرجع و مقتدی اور صاحب علم و فن کے لئے چشمہ خضر بنا دیا تھا، ہر فن میں ممتاز حیثیت حاصل تھی، مگر فن حدیث سے آپ کو خاص شغف تھا، اسی بناء پر آپ کو "امیر المومنین فی الحدیث" کہا گیا۔ تابعین میں انہوں نے ہشام بن عروہ، اسماعیل بن ابی خالد، اعمش اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ کو پایا، ثوری، شعبہ اور اوزاعی جیسے ائمہ کبار سے روایت کی۔ اور خود عبداللہ بن مبارک سے کسب فیض کرنے والے بے شمار ہیں۔ "حدث عنه خلق لا یحصون"[۱] یعنی ان سے بے شمار لوگوں نے روایت کی۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے صحابہ اور ابن مبارک کے معاملہ میں غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ صحابہ کو ابن مبارک پر اس وجہ سے فضیلت حاصل ہے کہ ان کو (صحابہ کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت حاصل ہے، اور غزوات میں آپ کے ساتھ شریک رہے۔[۲] عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ "میں ابن مبارک پر کسی کو مقدم نہیں رکھتا ہوں۔"[۳] زہد و رقاق کے موضوع پر آپ کی تصنیف "کتاب الزہد و الرقائق" ایک بے مثال کتاب ہے۔

کتاب الزہد کی خصوصیات یہ کتاب دوسری صدی ہجری کی یادگار ہے، ۲۰۶۳ احادیث ہیں۔ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، صحابہ کے آثار اور

---

۱ تذکرۃ الحفاظ ۱: ۲۵۳ ذہبی

۲ صفۃ الصفوۃ ۴: ۱۳۸ ابن جوزی

۳ حلیۃ الاولیاء ۸: ۱۶۳ ابو نعیم اصفہانی

تابعین وغیرہ کے فرمودات کا مجموعہ ہے۔ جب عبداللہ بن مبارک "کتاب الزہد" کی قرأت فرماتے تو اس قدر رقت وخشیت طاری ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ کوئی بیل ذبح کیا گیا ہو، اس وقت آپ میں بولنے کی قدرت نہ رہتی۔[1]

یہ قدیم ترین کتاب ابھی تک خواص وعوام کی دسترس سے باہر تھی، اگرچہ بعض مخصوص ہاتھوں، لائبریریوں اور مخطوطات کے خزانوں میں تھی، تو وہ استفادہ بسہولت ممکن نہ تھا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اس عظیم خزانۂ حدیث کی نشر واشاعت کا عزم کیا اور اس کے مخطوطات کی جستجو شروع کی۔

مخطوطات جب والی قطر شیخ علی بن عبد اللہ کو مولانا کے اس ارادہ کا علم ہوا تو انہوں نے "کتاب الزہد" کا جو نسخہ انکے پاس تھا، اسکا عکس مولانا کے پاس ارسال کیا۔ مولانا نے اس نسخہ کو مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں بھیج دیا، تاکہ اس نسخہ کی ایک صاف ستھری نقل تیار کی جائے۔ مولانا محمد عثمان صاحب ناظم مجلس نے "کتاب الزہد" کے مزید تین نسخے مصر سے حاصل کئے۔ جب پہلے نسخے کی نقل تیار کر لی گئی اور بقیہ تین نسخوں سے اس کا مقابلہ کر کے اسکو طباعت کے لائق بنا دیا گیا، تو مجلس احیاء المعارف نے اس کتاب کو مزید مفید بنانے کے لئے مولانا الاعظمی سے درخواست کی کہ آپ اس کی تحقیق فرمادیں۔ مولانا الاعظمی فرماتے ہیں:

"ثم كلفني المجلس ان أقوم بتحقيق الكتاب والتعليق عليه."[2]

(مجلس نے مجھے مکلف بنایا کہ میں اس کتاب کی تحقیق کروں اور اس پر تعلیقات لکھوں۔)

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ۲۵۹/۱

[2] کتاب الزہد والرقائق ص ۱۷

کتاب الزہد کی تحقیق میں مولانا کے سامنے تین نسخے تھے، ان مخطوطات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے

۱۔ پہلا نسخہ جو مولانا کو والی قطر سے ملا تھا، دراصل وہ ولی الدین جار اللہ کے مکتبہ استنبول کا تھا، جس کا عکس والی قطر کے پاس محفوظ تھا۔ اس نسخے کے یہ دو جزو ہیں، جزء اول احمد بن حسن کی روایت سے ہے، اور ابو علی حسین پورے نسخے دو جزوں کے راوی ہیں۔ اس مخطوطہ کا صفحہ اول خط رقعی میں ہے، اور بقیہ پورا نسخہ خط نسخ میں ہے، اس میں ۳۵ اوراق ہیں، یہ نسخہ صاف ہے کہیں کہیں حروف مٹ گئے ہیں، اس پر ۵۶۰ھ کا سماع درج ہے، مولانا نے اسی نسخہ کو اصل قرار دیا، یہ نسخہ نسخۂ مروزی کہلاتا ہے۔

۲۔ دوسرا نسخہ اسکندریہ کی بلدیہ کی لائبریری کا ہے، ۱۸×۲۶ کے حجم میں ہے، مغربی خط میں ہے اس نسخہ میں ۵۳ اوراق ہیں، ۳۶۶ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نعیم بن حماد کا نسخہ ہے، مولانا الاعظمی فرماتے ہیں

"ويختلف الكتبة عن الأولى تبويباً وترتيباً وزيادة ونقصاً"

(دوسرا نسخہ پہلے نسخے سے تبویب، ترتیب اور زیادتی و کمی کے لحاظ سے مختلف ہے۔)

۳۔ تیسرا نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق کا ہے، خط نسخ میں ہے، اس میں ۷۰ اوراق ہیں، ۶۰۱ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نسخہ عمر بن طبرزد بغدادی کی روایت سے ہے، یہ نسخہ اصل نسخہ (جزء اول) کے نویں جزو کے آخری ورق سے تیرھویں جزو کے ابتدا تک ہے۔

تحقیق و تعلیق مولانا نے ان مخطوطات کی روشنی میں "کتاب الزہد والرقائق" کی تحقیق و تعلیق کا کارنامہ انجام دیا۔ مولانا نے اس کتاب کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ کتاب الزہد والرقائق ص ۲۵

۱- سب سے پہلے مولانا نے مروزی کی روایت سے ایک نسخہ تیار کروایا، دیگر نسخوں سے مقابلہ کیا، آیات کے مواقع اور ان کے نمبرات کا اندراج کیا، نسخہ میں کوئی غلطی یا تصحیف ہے تو اس پر تنبیہ فرمائی، اور نعیم بن حماد کے زوائد کو مروزی کے نسخہ کے ذیل میں شامل کیا۔

۲- متداول کتابوں سے احادیث و آثار کی تخریج کی، لیکن تخریج اور حوالہ دینے میں زیادہ چھان بین نہیں کی گئی، کہیں پر مولانا نے حوالہ میں حدیث کے بعینہ وہی الفاظ نقل کردیے ہیں، جس سے متن میں پیدا ہونے والے ابہام کا ازالہ ہو جاتا ہے، مولانا نے رواۃ حدیث کی تعیین و تشخیص کی اور بعض مقامات پر ان رواۃ کے تراجم کی نشاندہی بھی فرمادی، خصوصاً جب وہ صحاح ستہ کے نہ ہوں۔

۳- دقیق، مشکل اور غریب الفاظ کی تشریح و توضیح فرمائی۔

۴- مولانا اعظمی نے اس کتاب سے استفادہ کو آسان تر بنانے کے لئے مختلف پہلوؤں سے علیحدہ علیحدہ فہرستیں مرتب کیں، پہلی فہرست مرفوع احادیث کی ہے، صحابہ میں سے ۱۳۰ رواۃ کو حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے مرتب فرمایا اور کتاب کے صفحات کی نشاندہی کی، دوسری فہرست مراسیل کی ہے، تیسری آثار صحابہ کی اور چوتھی فہرست تابعین و تبع تابعین کے موقوفات اور فرمودات کی ہے۔

مولانا اعظمی نے ہی اس کتاب کا مقدمہ بھی تحریر فرمایا، جس میں زہد کی اہمیت و افادیت، اقسام، درجات اور ہماری زندگی میں زہد کی کیا ضرورت ہے، ان تمام مباحث پر تفصیلی گفتگو کی۔ اسی طرح عبداللہ بن مبارک کا تعارف، تذکرہ، مخطوطات کا پورا تعارف، تحقیق میں کن مناہج کو اختیار کیا گیا ہے، یہ سبھی چیزیں اس مقدمہ میں آگئی ہیں۔

مولانا اعظمی کے ساتھ معاونت کے طور پر اس تحقیقی سفر میں آپ کے شاگرد

مولانا عبدالجبار صاحب مئوی[1] (جو اس وقت مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث اور مولانا کے استاذ تھے۔) اور فرزند عزیز جناب مولانا رشید احمد صاحب مدرس مفتاح العلوم شریک رہے۔ اس کتاب پر مشہور محقق مولانا ابوالوفا افغانی نے تقریظ لکھی۔

کتاب الزہد والرقائق ۱۳۸۵ھ م ۱۹۶۶ء میں مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں سے پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سلسلہ میں مولانا اعظمی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم تحریر فرماتے ہیں۔

"کتاب الزهد والرقائق قد بذل المحقق جهدا مشكورا حتى اخرجه في صورة دقيقة وفي طبعة انيقة"[2]

(کتاب الزہد والرقائق محقق (مولانا اعظمی) کی سعی و کوشش قابل شکر ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو عمدہ اور صاف ستھری شکل میں شائع کیا۔)

مولانا ابوالوفا افغانی نے تقریظ میں مولانا کے اس کام کی خوب تعریف و توصیف کی ہے، خاص طور سے مولانا کے مقدمہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"وقدمه بمقدمة مفيدة تدل على سعة اطلاعه وطول باعه، قل له نظير في علماء زماننا"[3]

(اور انہوں نے (مولانا اعظمی) ایک مفید مقدمہ تحریر فرمایا، جس سے ان کی وسعت معلومات اور مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی نظیر ہمارے زمانہ کے علماء میں کم ملے گی۔)

کتاب الزہد پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی رقمطراز ہیں کہ

---

[1] مولانا کے حالات زندگی کے لئے دیکھئے "پیکر مہر و وفا" مصنفہ ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی

[2] الامام الزاہد عبد اللہ بن مبارک ص ۱۳۰ ڈاکٹر عبدالحلیم محمود

[3] کتاب الزہد والرقائق ص ۲۳

"مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس پر جو محنت کی ہے وہ بس
دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جو خود اس
میدان کے مرد ہوں۔"[1]

مولانا عبدالماجد دریابادی نے "کتاب الزہد" کو اس طرح خراج تحسین
پیش کی

"محدث وقت مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات فن حدیث میں یوں
بھی کچھ کم نہ تھیں، مستحق تہنیت و تبریک ہیں کہ اس نادر کتاب کی بھی
تدوین کی سعادت انہیں کے حصہ میں آئی۔"[2]

تعلیقات کے نمونے

۱۔ ص ۵۲ ح ۱۶۳ حدثني أبو عمران التجيبي اصل نسخہ کے حاشیہ میں
مستدرک کی علامت بنی ہوئی تھی، اور اس پر لکھا ہوا تھا "اسمه سالم وهو
مولاهم" یعنی ابو عمران تجیبی کا نام سالم ہے اور وہ آزاد کردہ غلام ہیں۔ مولانا اعظمی
نے تنبیہ کی کہ ان کا نام سالم نہیں بلکہ صحیح نام اسلم ہے۔

۲۔ ص ۹۴ ح ۳۲۸۔ (باب صفة النار) اس روایت میں "كلمة قدعة" آیا ہے،
مولانا اس کی تشریح کرتے ہیں "القدع في الكلام الخنا والفحش" یعنی بدزبانی
یا فحش بات کو "كلمة قدعة" کہا جاتا ہے۔

۳۔ ص ۲۰۷ ح ۵۸۴ قال أخبرنا ابن المبارك قال أخبرنا سفيان بن
عيينة عن أيوب إلخ
اصل نسخہ (مکتبہ ولی الدین جار اللہ کے مخطوطہ) میں "عن أبي أيوب" ہے

---

۱ برہان ج ۶۰ ش ۱، ص ۶۷

۲ صدق جدید ۲/جون ۱۹۶۷ء

اسکندریہ کے نسخہ میں عن ایوب، لکھا ہوا تھا مولانا اعظمی نے اصل ہندی عبارت، غلط ٹھیرایا اور اسکندریہ والے نسخہ کی عبارت کو صحیح قرار دیا اور اسی کے مطابق متن میں 'عن ایوب' تحریر فرمایا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ یہ ایوب بن عائذ ہیں جن کا تذکرہ تہذیب میں ہے۔

سنن سعید بن منصور

فقہی ترتیب پر کتاب الطہارۃ سے کتاب الوصایا تک مرتب کردہ مجموعہ حدیث کو "سنن" کہا جاتا ہے۔ سنن کو پہلے ابواب کہا جاتا تھا، "الابواب" مصنفہ امام شعبی (وفات ۱۰۹ھ) اس طرز کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔[۲] کثیر تعداد میں سنن مرتب کی گئی ہیں، جن میں سنن ابو داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، سنن ابن حبان، سنن ابو مسلم الکشی، سنن ابو قرہ، سنن ابو علی بن السکن، سنن حافظ سعید بن منصور خراسانی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

سعید بن منصور خراسانی حافظ سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی، ابو عثمان مروزی، طالقانی، ایک بلند پایہ محدث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جوزجان میں پیدا ہوئے، بلخ میں نشو و نما پائی اور حصول علم کی خاطر شہر شہر پھرے، آخر میں مکہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔[۳] سن ولادت کے بارے میں اصحاب سیر خاموش ہیں، البتہ آپ کی وفات صحیح اور مشہور قول کے مطابق ۲۲۷ھ میں ہوئی۔[۴]

آپ نے جن محدثین عظام سے کسب فیض کیا ان کی ایک لمبی فہرست ہے،

---

۱ [illegible]

۲ کتابت حدیث ص ۳۶ مولانا محمد تقی عثمانی

۳ تہذیب التہذیب ۴/۹۳

۴ ایضاً ص ۹۰

اگرچہ اس کتاب کا ذکر ابن سعد، امام بخاری، اور رازی نے نہیں کیا ہے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ اس کتاب کو شہرت حاصل نہیں تھی، بہت سے علماء حدیث نے اس کتاب کو ماخذ بنایا ہے۔ چنانچہ قاضی اطہر مبارکپوری تحریر فرماتے ہیں

"ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث حافظ ابو العباس احمد بن عبد اللہ محب الدین طبری، مکی متوفی ۶۷۴ھ نے حج و مناسک کی مشہور کتاب "القریٰ لقاصد ام القریٰ" میں سنن سعید بن منصور سے بہت زیادہ احادیث و آثار نقل کئے ہیں، اس کا شاید ہی کوئی صفحہ اس کی احادیث و آثار سے خالی ہو"۔ [1]

مخطوطہ کی بازیافت احادیث و آثار اور اسلامی تاریخ کا یہ قیمتی خزانہ قریب قریب مفقود ہی تھا، اسکے مخطوطات کے بارے میں محققین کو کوئی علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، بعض تحقیقی ضروریات کے لئے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ کا ۱۳۸۰ھ میں استانبول کا سفر ہوا۔[2] وہاں کی ایک بڑی لائبریری "محمد پاشا کوپریلی لائبریری" نے مخطوطات کے سمندر میں غوطہ لگانے والے اس نامور محقق سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ اس کتب خانے کی انتظامیہ نے ڈاکٹر حمید اللہ کو مخطوطات کی ترتیب، تہذیب اور تعمیر کی ذمہ داری سونپی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور مخطوطات کی جانچ پرکھ شروع کی، تو ایک مخطوطہ ملا جسکی پیشانی پر "مصنف ابن ابی شیبہ" لکھا ہوا تھا، لیکن اسکے

[1] مآثر و معارف ص ۳۱۹ قاضی اطہر مبارکپوری

[2] ڈاکٹر حمید اللہ مولانا اعظمی کے نام ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۰ھ کے ایک مکتوب میں ترکی کے مخطوطات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ترکی میں تقریباً دس لاکھ کی تعداد میں سرکاری کتب خانوں میں ہیں، صرف استانبول ہی میں پانچ لاکھ تو ضرور ہی قلمی مخطوطے ہوں گے و الحمد للہ اچھی حالت میں ہیں۔"

(المآثر ج ۱۲ ش ۲ ص ۸۲)

مشمولات کو دیکھ کر شک ہو کہ یہ مصنف ابن ابی شیبہ ہے، کوئی دوسری کتاب؟

چنانچہ 'کوپرولو' کے اس نسخہ کا مقابلہ مصنف کے دوسرے نسخوں سے کیا، ایک نسخہ 'توپ قاپی' کا اور دوسرا 'نور عثمانیہ' کا تھا۔ 'کوپرولو' کے نسخے اور 'توپ قاپی' و 'نور عثمانیہ' کے نسخوں میں واضح فرق تھا۔ چند ایسے قرائن بھی دیکھنے کو ملے جس سے انکشاف ہو کہ یہ 'مصنف ابن ابی شیبہ' کا مخطوطہ نہیں بلکہ "سعید بن منصور" کا ہے۔

اس مخطوطہ میں ایک جگہ چھ سطروں میں سعید بن منصور کا ترجمہ بھی لکھا ہوا ہے۔ تین سطروں میں ابواب وکتب کا بھی تذکرہ تھا باب الحث علی تعلیم الفرائض، من کتاب الفرائض، کتاب ولایۃ العصبۃ، کتاب الوصایا، کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الجہاد۔

مخطوطہ کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے

"أخبرنا   الأسماطي قال أنا   الكرخي رحمه الله، قال أنا أبو علي   بن شاذان قراءة عليه وأنا أسمع، قال أنا السجستي أنا محمد بن علي بن الصائغ، قال حدثنا سعيد بن منصور"[1]

مندرجہ بالا عبارت ملاحظہ ہو، اس میں کہیں بھی ابتدا سے آخری سند تک ابوبکر بن ابی شیبہ کا ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے ہے کہ کتاب کے سرورق پر "مصنف ابن ابی شیبہ" کا ذکر محض کتابت کی غلطی ہے، یا اس مخطوطے کے مالک سے تام نسخے میں سہو ہو گیا ہے۔ "ومن المحتمل أن الذي كتبه النسخ عنده من شعبة (أي سعيد بن منصور بن شعبة) بابن أبي شيبة"[2] (یعنی یہ بھی احتمال

۱؎ کتاب السنن ص ۲

۲؎ ایضاً

ہے کہ کاتب کو ابن شعبہ (سعید بن منصور بن شعبہ) اور ابن شیبہ میں التباس ہو گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ اندرونی اندراجات اور چند شہادتوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مخطوطہ سعید بن منصور کی سنن کا ہے۔ دمشق کے مضافات میں ''عبادیہ'' گاؤں میں ربیع الاول ۷۲۵ھ میں اس نسخہ کی کتابت مکمل ہوئی۔ اس کے کاتب محمد بن احمد بن علی خطیب ہیں۔ بلاشبہ ایک جانب سے بے پناہ خوشی کا احساس ''کتاب السنن'' کی بازیافت ہوئی، تو دوسری طرف افسوس بھی کہ اس ذخیرۂ حدیث کی دریافت بھی ہوئی تو تیسری جلد کی شکل میں۔ یہ ایک ضخیم کتاب تھی جس کے تمام حصوں تک رسائی نہ ہو سکی۔

تصحیح و تعلیق اس مخطوطہ کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مولانا محمد میاں صاحب سملکی کو ہدیہ دیا۔ مولانا نے اس ذخیرۂ حدیث کی قدر و قیمت اور قدامت کو دیکھتے ہوئے اس کی طباعت و اشاعت کا فیصلہ فرمایا، اور مولانا حبیب الرحمن صاحب سے درخواست کی کہ آپ اس کو اپنی تحقیقات و تعلیقات سے آراستہ کرکے طباعت کے لائق بنائیں۔

مولانا نے اس ذمہ داری کو بھی قبول فرمایا، لیکن واقعہ یہ تھا کہ سنن سعید بن منصور کی تحقیق آسان نہ تھی، کیونکہ صرف اور صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہو سکا تھا اور کسی نسخہ کی تحقیق خود اسی نسخہ سے کیسے ممکن تھی؟ لیکن اس کام کے سپرد کرنے والوں کی نظر بھی خوب تھی، شاید نہیں یقین کی حد تک علم تھا کہ مولانا اعظمی بحر تحقیق میں غواصی کرکے ایسے موتی چن چن کر ''عقد فرید'' تیار کریں گے۔ مولانا اعظمی سنن سعید ابن منصور کے سلسلہ میں اپنی جد و جہد کے بارے میں خود رقمطراز ہیں کہ

"إن سعينا في تحقيق الكتب وتصحيح نصوصه عناءً كثيراً لأن النسخة كانت وحيدةً فلم نجد بداً من أن نصحح نوف المصحات ونفتش عن أحاديث هذا الكتاب

فی غیرہ من جوامع الحدیث ۔

(اس کتاب کی تحقیق اور نصوص کی تصحیح میں ہم نے بہت مشقتیں برداشت کیں، کیونکہ نسخہ ایک ہی تھا، چنانچہ ہمارے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ ہم ہزاروں صفحات کی چھان بین کریں اور اس کتاب کی احادیث کی تلاش دوسرے مجموعہ ہائے حدیث میں کریں۔)

سنن سعید بن منصور کے سلسلہ میں مولانا اعظمی نے مندرجہ ذیل خدمات

انجام دیں

۱ حدیث کی تخریج کی، کیونکہ حدیث جب دوسرے ماخذ میں ہو اور اسلوب مختلف ہو تو حدیث کے معنی و مفہوم سمجھنے میں یہ چیز معاون ثابت ہوگی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دوسرے ماخذ میں تشریح و تعلیق بھی ہوتی ہے، جس سے اس کتاب کے مطالعہ کے وقت پیش آنے والے مشکلات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

۲ احادیث کے مبہم اور غریب الفاظ کی تشریح و توضیح کی۔

۳ بہت سے مقامات پر حنفی مسلک کی وضاحت بھی کی۔

۴۔ صاحب مخطوطہ سے مصنف تک کے رواۃ کے تراجم مختصر تحریر فرمائے۔

سنن سعید بن منصور کی تحقیق میں مولانا اعظمی کی کاوش کو دیکھ کر ڈاکٹر حمید اللہ مولانا ابراہیم کے نام ایک مکتوب میں اسکا تذکرہ یوں فرماتے ہیں کہ:

"مولانا اعظمی سنن سعید بن منصور کی تحقیق کیا کر رہے ہیں، کتاب کو چار چاند لگا رہے ہیں۔"[۲]

جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا، جس میں

---

[۱] کتاب السنن۔ کلمۃ المحقق

[۲] حیات ابو المآثر ص ۳۰۹

مخطوطے کے انکشاف، سعید بن منصور کا تذکرہ اور کتاب کی اہمیت و افادیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دو جلدوں میں یہ کتاب ۱۳۸۸ھ مطابق ۱۹۶۷ء، ۱۳۸۹ھ ۱۹۶۸ء میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ "سنن سعید بن منصور" کی کسوٹی مولانا اعظمی کی تحقیقی صلاحیت اور فن حدیث میں گیرائی و گہرائی کی جانچ پرکھ کے لئے کافی ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پوری تحقیق کا محور مولانا کی یادداشت اور وسعت مطالعہ ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے اس کتاب کے طرز تحقیق پر حیرت و استعجاب کا اظہار اس انداز میں کیا

"کتاب کی تہذیب و تدوین اور تحشیہ وغیرہ کا کام مولانا اعظمی کا کیا ہوا ہے، اور حیرت ہوتی ہے ان میں اس کام کی اتنی سلیقہ مندی اور مہارت بغیر یورپ گئے ہوئے اور مستشرقین کی صحبت اٹھائے کیسے پیدا ہوگئی ہے۔"[1]

مولانا شاہ معین الدین ندوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی ہے مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اسکو ایڈٹ کیا ہے، ان کا نام تصحیح تحشیہ و ترتیب و تہذیب وغیرہ کی صحت و خوبی کی پوری ضمانت ہے ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوا جسکے لئے فاضل مرتب اور مجلس علمی دونوں اہل علم کے شکریے کے مستحق ہیں۔"[2]

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج ۱ ص ۸۱ ح ۳۱۰ سعید قال نا هشيم عن يونس عن الحسن في

---

۱ صدق جدید ۲ اگست ۱۹۶۸ء

۲ معارف ج ۱۰۲ ش ۱ ص ۴

ميراث المرتد لورثته.

تعلیقات وحواشی میں مولانا اعظمی بعض اہم مسائل میں فقہاء کے مسالک بھی مختصراً بیان کرتے چلتے ہیں، جب کوئی مرتد حالت ارتداد میں مر جائے یا قتل کردیا گیا ہو یا دارالحرب چلا گیا ہو اور قاضی نے بھی اسکے دار حرب جا ملنے کا فیصلہ کردیا ہو تو ایسی صورت میں اسکے مال کا وارث کون ہوگا؟ مولانا اعظمی نے اس روایت کے ذیل میں مرتد کی میراث سے متعلق فقہاء کے مذاہب بیان کئے ہیں، فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جو مال اس شخص نے حالت اسلام میں کمایا ہے اسکے وارث مسلم ورثاء ہوں گے اور جو مال حالت ارتداد میں کمایا ہے اسکو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اسکی تمام کمائی کے مالک اسکے مسلم ورثاء ہونگے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اسلام و ارتداد دونوں حالتوں میں کمائے ہوئے مال کو بیت المال میں ڈال دیا جائے گا۔ مولانا اعظمی "سراجیہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جو مال مرتد نے دارالحرب کوچ کرجانے کے بعد کمایا ہے تو اس مال کی حیثیت بالاجماع "فئی" کی ہوگی۔

۲۔ ج ۱ ص ۲۸۶ ح ۷۶ — حدثنا سعيد قال نا هشيم قال أنا يونس عن الحسن قال: تطلق التي نوى، أو أراد أو أراد إلخ

"أو أراد أو أراد" پر حاشیہ لگا کر مولانا قمطراز ہیں "أرى أن الناسخ أعاده سهواً يدل عليه ما في عب، وقد أخرجه بهذا الإسناد سواء (۳ ۱۵۲)" یعنی میرا خیال ہے کہ کاتب نے بھول سے دو مرتبہ لکھدیا ہے مصنف عبدالرزاق کی حدیث اسکی دلیل ہے، عبدالرزاق نے اس روایت کو بعینہ اسی سند سے نقل کیا ہے۔ (۳ ۱۵۲)

۳۔ ج ۲ ص ۲۷۸ ح ۲۶۹۲ — حدثنا سعيد قال نا أبو الأحوص عن

اسے بھی "کو شیخ نے اصل قرار دیا اور اپنی کتاب "مجمع بحار الانوار" میں اسی کی عبارت کو نقل کیا ہے، شاذ و نادر ہی کوئی چیز نقل ہونے سے رہ گئی ہو، یہ وہ بحث ہے جو بہت ہی مشہور ہے۔

شیخ نے "مجمع بحار الانوار" میں بہت ہی مفید باتوں کا اضافہ کیا ہے جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں، اور تحقیق کے دوران جو دریافتیں ہوئیں انکو بھی شامل کر دیا۔ کتاب کے آخر میں تکملہ بھی لکھا جس سے کتاب کی افادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

نواب صدیق حسن خاں کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں

"وهو كتاب جمع فيه كل غريب الحديث وما ألف فيه فجاء كالشرح للصحاح الستة، فإن لم يكن عند أحد شرح لكتاب من الأمهات الست فهذا الكتاب يكفيه لحل المعاني وكشف المباني، وهو كتاب متفق على قبوله متداول بين أهل العلم منذ ظهر في الوجود [۱]

(اس کتاب میں حدیث کے تمام غریب الفاظ اور اس موضوع پر تالیف کردہ کتابوں کے مباحث جمع کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اسکی حیثیت صحاح ستہ کی شرح کی ہوگئی ہے، اگر کسی کے پاس صحاح ستہ میں سے کسی کتاب کی شرح نہ ہو تو یہ کتاب اسکے الفاظ و معانی کے حل کے لئے کافی ہوگی۔ اس کتاب کی مقبولیت پر سبھی کا اتفاق ہے، جب سے منظر عام پر آئی ہے علماء کے درمیان متداول ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں

"در علم حدیث تالیف مفیدہ جمع کردہ از آنجملہ کتابیست کہ متکفل شرح

۱۔ ابجد العلوم ص ۸۹۶ نواب صدیق حسن خاں

صحاح ستہ کی شرح مجمع بحار الانوار

(علم حدیث میں آپ کی مفید تالیفات ہیں انہیں میں ایک کتاب مجمع
بحار الانوار کے نام سے ہے جو صحاح ستہ کی شرح کی ضامن ہے۔)
مجمع بحار الانوار کو زیور طبع سے آراستہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سہرا
منشی نول کشور کے سر جاتا ہے۔ جب منشی جی کو اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا علم ہوا تو
ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اسکے چھ نسخے حاصل کئے جن کی تصحیح کا کام حضرت
مولانا محمد مظہر نانوتویؒ صدر المدرسین مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور نے انجام دیا تھا
نسخوں میں ۱۰۱۹ھ کا مکتوبہ شیخ عبدالحق دہلوی کا بھی نسخہ تھا، اسی نسخہ کو بنیاد
بنا کر منشی نول کشور پریس لکھنؤ نے مجمع بحار الانوار کو پہلی دفعہ ۱۲۸۳ھ میں شائع کیا۔[2]
۱۳۱۴ھ میں اسی مطبع سے یہ کتاب دوبارہ طبع ہوئی اسکے چار ایڈیشن اس پریس سے
نکلے۔[3] لیکن جب مطبع نول کشور بند ہوگیا اور مطبوعہ کتابیں ضائع ہونے لگیں تو انہیں
میں سے ایک کتاب مجمع بحار الانوار بھی تھی جو نایاب یا عنقا ہو کر رہ گئی تھی۔

مجمع بحار الانوار کی جدید اشاعت | حجاز میں مقیم شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے وطن
کے لوگوں کو اس جوہر نایاب کی فکر ہوئی اور اس عظیم کتاب کی اشاعت وطباعت کا
ارادہ کرلیا۔ ان میں سب سے اہم نام "عبدالقادر نوروفی" کا ہے۔ ان لوگوں نے
حضرت مولانا علی میاں صاحب سے درخواست کی کہ تصحیح وغیرہ سے متعلق جملہ امور کی
ذمہ داری سنبھال لیں۔
تصحیح وتعلیق کے لئے مولانا علی میاں صاحب جیسے نابغہ نظر عام کی جگہ

---

[1] حیات الاخیار ص ۲۷۳ شیخ عبدالحق دہلوی
[2] مطبع نول کشور ۲۳ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ میں قائم ہوا۔ اس مطبع کی سب سے پہلی کتاب پنواریوں
کی پیمائش کی کتاب تھی۔ (تحقیقی مقالات ص ۲۲۵ ظفر احمد صدیقی)
[3] مقدمہ مجمع بحار الانوار

انتخاب مولانا حبیب الرحمن الاعظمی پر پڑی، علامہ ممدوح نے بخوشی حامی بھر دی تا
اعظمی اس کام کو اپنی نگرانی میں کرائیں، دوسری جانب مولانا عبدالحفیظ صاحب مرتب
مصباح اللغات کو مولانا کی معاونت کے لئے آمادہ کیا۔ مولانا علی میاں ندوی مولانا
اعظمی کو اس بابت ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"بڑے اصرار وخواہش سے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ "مجمع بحار الانوار" کی اشاعت ثانیہ اور تصحیح کا کام اپنی نگرانی ورہنمائی میں کرائیں، آپ نے اسکو قبول فرمالیا اور اسکا وعدہ فرمایا کہ آپ کسی صاحب علم سے اپنی نگرانی میں یہ کام لیں گے یقیناً اس کتاب کے شایان شان اور موجودہ تحقیقی معیار اور طرز کے مطابق وہی نسخہ ہوگا جو آپ کے پیش نظر ہے، اور اسکی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت آپ کو عطا فرمائی ہے۔"[1]

مخطوطات اب ایک بار پھر مجمع بحار الانوار کے نسخوں کی تلاش شروع ہوئی، مطبوعہ نسخوں کے علاوہ دو قلمی نسخے بھی دستیاب ہوئے۔ ایک نسخہ حیدرآباد سے شاہ پیر محمد کے کتب خانہ سے حاصل کیا گیا اور دوسرا قدیم نسخہ پٹن سے منگایا گیا۔ شیخ کی زندگی میں تیار کردہ اس کتاب کے دو نسخوں کا مولانا اعظمی نے لکھنؤ اور حیدرآباد کے کتب خانوں میں مشاہدہ کیا۔[2]

تصحیح وتعلیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اور انکے معاون مولانا عبدالحفیظ صاحب نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے موجودہ نسخوں کا باہم مقابلہ وموازنہ کرکے تصحیح وتحشیہ کا کام انجام دیا۔ مولانا اعظمی نے الفاظ کی تخریج کی، حدیث کی کن متداول کتابوں میں وہ الفاظ آئے ہیں ان کا حوالہ بھی دیا اور مطبوعہ نسخوں میں ہونے وال

---

[1] المآثر نومبر تا جنوری ۰۲-۲۰۰۱ء ص ۹۱-۹۲
[2] مقدمہ مجمع بحار الانوار

لغزشوں کی طرف بھی توجہ دلائی۔ مولانا لکھتے ہیں

وقد عن لي أثناء إعادة النظر في المبيضة أشياء فعلقتها أيضاً وأوهام فنبهت عليها وختمت أكثرها برمز "ح" أو بلفظ "الأعظمي" وتركت بعضها غفلاً"[1]

(مسودہ پر نظر ثانی کے دوران بہت سی اشیاء اور وہم نظر سے گزرے جن پر میں نے حواشی لکھے اور متنبہ کیا، ان میں سے بیشتر کے اخیر میں "ح" یا "اعظمی" کی علامت بنی ہوئی ہے اور بعض جگہوں کو میں نے بے علامت چھوڑ دیا ہے۔)

کم وبیش ۹۲ مقامات ایسے ہیں جہاں مولانا اعظمی نے حواشی لکھے یا تصحیح کی۔ اور جن جگہوں پر مولانا نے شناختی علامت نہیں بنائی ہے اس کو شامل کرلیں تو تعلیقات وحواشی کی تعداد مزید بڑھ جاتی ہے۔ پٹن سے دستیاب نسخہ میں جگہ جگہ مفید تعلیقات تھیں، جن کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ مؤلف کے ہی قلم سے ہیں، مولانا نے ان تعلیقات کو بھی صفحات کے نیچے نقل کردیا ہے۔

مولانا نے "مجمع بحار الانوار" پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا، اس مقدمہ میں قرآن وحدیث کے الفاظ غریبہ کی جمع وتدوین کی تاریخ، اس فن کی ضرورت وافادیت اور اس موضوع پر اہم تصنیفات کا مختصر اجائزہ لیا، اور "مجمع بحار الانوار" کی خصوصیت وامتیاز پر روشنی ڈالی۔ مولانا علی میاں صاحب ندوی اس مقدمہ کی تعریف میں لکھتے ہیں

"ماشاء اللہ بڑا فاضلانہ مقدمہ ہے، اس فن کے ارتقاء اور عہد بعہد تالیفات کا جائزہ لے لیا ہے، کتاب کے خصائص مبصرانہ ہیں، انہیں تحقیقات وخصوصیات کی بناء پر میرے دل میں آپ کی جو قدر ومنزلت

[1] مقدمہ مجمع بحار الانوار

ہے اس کو خدا جانتا ہے۔“[۱]

قاضی اطہر مبارکپوری ”مجمع بحار الانوار“ کے سلسلہ میں مولانا اعظمی کی خدمات کو اس انداز میں سراہتے ہیں

”مولانا نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دیا، کہنا چاہئے کہ اس عظیم لغت حدیث کی تحقیق بھی آپ نے ہی کی ہے۔“[۲]

یہ کتاب مولانا اعظمی کی لغت وادب پر گرفت اور انکے علمی کمالات کی عکاس ہے۔ ان تعلیقات سے آراستہ پانچ جلدوں پر مشتمل ”مجمع بحار الانوار“ ڈاکٹر عبد المعید خاں کے زیر نگرانی دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے ۱۹۶۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔

تعلیقات کے نمونے:

۱۔ ج ۱ص ۳۴ پر ایک لفظ ’ماتۃ‘ آیا ہے، مولانا اس لفظ کی تشریح وتوضیح کرتے ہیں کہ ’ماتۃ‘ کی جمع ’مواب‘ ہے، ’المت‘ کا اسم ہے، اسکے معنی تقرب حاصل کرنے یا وسیلہ اختیار کرنے کے ہیں، مطبوعہ ایڈیشن اور قلمی نسخہ میں ایسا ہی واقع ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ مکتبہ پیر جھنڈو پاکستان کے نسخہ میں ’ماتۃ‘ کے بجائے ’مائۃ‘ ہے اور وہ غلط ہے۔

۲۔ ج ۱ص ۲۷۷ پر ’بشر‘ آیا ہے، مولانا اسکے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہیں کہ جلد کی سطح جس پر بال اگتا ہے، کو چھپنے کو ’بشر الجلد‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ ج ۲ص ۲۰۶ پر ایک لفظ ہے ’سب‘، مولانا حاشیہ میں اس کی وضاحت فرماتے ہیں بالکسر ثوب رقیق‘ یعنی ’سب‘ کی سین مکسور ہے، یہ ایک باریک کپڑا ہوتا ہے۔

۱۔ المآثر ج ۱ ش ۲ ص ۹۳

۲۔ ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۴۶

مصنف عبدالرزاق

احادیث کی کتابوں کی ترتیب میں مختلف اسالیب اور طریقے اختیار کئے گئے۔ خاص طرز پر مرتب کردہ کتابوں کے خاص اصطلاحی نام بھی رکھے گئے۔ مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے ان کتب احادیث کی چھ قسمیں ہیں

(۱) جوامع (۲) مسانید (۳) معاجم (۴) اجزاء (۵) رسائل (۶) اربعینات

جامع حدیث کی اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں آٹھ طرح کے مضامین جمع کئے گئے ہوں

(۱) عقائد (۲) احکام (۳) رقاق (۴) آداب (۵) تفسیر (۶) تاریخ (۷) فتن (۸) مناقب[1]

کثیر تعداد میں جوامع لکھی گئیں۔ مشہور جوامع میں سے ایک جامع عبدالرزاق ہے، جو مصنف عبدالرزاق کے نام سے مشہور ہوئی۔ علماء کی ایک رائے یہ ہے کہ مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب کی گئی ہو، مگر یہ تعریف سنن کی ہے۔ ابتداء سنن کو مصنف ہی کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمود طحان مصنف کی تعریف میں لکھتے ہیں

"هو الكتاب المرتب على الأبواب الفقهية و المشتمل على الأحاديث المرفوعة والموقوفة والمقطوعة "[2]

(مصنف وہ کتاب ہے جو فقہی ابواب پر مرتب ہو اور مرفوع، موقوف ومقطوع حدیثوں پر مشتمل ہو۔)

ڈاکٹر محمود طحان نے آگے چل کر "مصنف" اور "سنن" کے فرق کو بھی واضح

[1] لامع الدراری ۴۳-۴۴ شیخ محمد زکریا کاندھلوی
[2] اصول التخریج ودراسۃ الاسانید ص ۱۳۲ ڈاکٹر محمود الطحان

کیا کہ مصنف میں احادیث مرفوعہ، موقوفہ اور مقطوعہ سبھی پائی جاتی ہیں، جبکہ سنن میں
شاذ و نادر ہی دیکھا ہوتا ہے کہ احادیث مرفوعہ کے علاوہ کوئی حدیث پائی جاتی ہو۔ چنانچہ
اسی لئے احادیث موقوفہ و مقطوعہ کو اصطلاح میں "سنن" نہیں کہا جاتا ہے۔[1]

امام عبد الرزاق عبد الرزاق بن ہمام بن نافع صنعانی (۱۲۶ھ-۲۱۱ھ) جلیل
القدر امام حدیث ہیں، اپنے زمانہ کے مرجع العلوم سمجھے جاتے ہیں، علم و کمال کا دور دور
تک شہرہ تھا آدم بن موسیٰ امام بخاری کا قول نقل کرتے ہیں کہ عبد الرزاق نے اپنی
کتاب سے جو بھی بیان کیا ہے وہ اصح ہے۔[2] امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ مجھے معمر
سے روایت کرنے میں، عبد الرزاق کی حدیث، بصریوں کی روایت کردہ حدیث سے
زیادہ محبوب ہے۔[3] آپ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
ان کے علاوہ کسی شخص کے پاس اس قدر لوگوں نے سفر نہیں کیا۔[4] حافظہ کا حال یہ تھا کہ
سترہ ہزار حدیثیں ان کو یاد تھیں۔[5] امام عبد الرزاق کو ابن جریج، ثور بن یزید، معمر،
اوزاعی، اور سفیان ثوری کے علاوہ بہت سے علماء و مشائخ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔[6]
سفیان بن عیینہ، احمد بن حنبل، ابن راہویہ، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی وغیرہ ائمہ
حدیث آپ کے شاگردوں میں ہیں۔[7]

امام عبد الرزاق پر الزام ہے کہ مائل بہ تشیع تھے۔ اس سلسلہ میں خود

۱؎ اصول التخریج و دراسات الاسانید ص ۱۳۳
۲؎ التاریخ الکبیر ق ۲ ج ۳ ص ۱۳۰ امام بخاری
۳؎ تہذیب التہذیب ۶ ۳۱۲
۴؎ وفیات الاعیان ۲ ۱۰۳ ابن خلکان
۵؎ الاعلام ۳۵۳:۳
۶؎ تذکرۃ الحفاظ ۳۳۱:۱
۷؎ سیر اعلام النبلاء ۹ ۱۳

عبدالرزاق کے ایک قول کو نقل کیا جاتا ہے اور اسی کو ہم کافی سمجھتے ہیں فرماتے ہیں
کہ مجھے کبھی بھی شرح صدر نہ ہو سکی کہ میں حضرت علیؓ کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر فضیلت
دوں۔ اللہ حضرات شیخین اور عثمانؓ و علیؓ پر رحمت نازل کرے، جو ان سے محبت نہ رکھے
وہ مومن نہیں ہے[1]

مصنف عبدالرزاق کی خصوصیات | مصنف عبدالرزاق مصنف ابن ابی شیبہ
سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اسکی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، اس میں اکیس ہزار حدیثیں
ہیں۔ احادیث و آثار کا یہ ایک قیمتی ذخیرہ تھا، جس سے بہت سے فقہاء
و محدثین نے استفادہ کیا، جس کے وجود سے دوسری تیسری صدی ہجری سے پہلے تک
تدوین حدیث کے انقطاع کے دعویٰ کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں تصنیف کردہ کتب حدیث کی ایک اہم خصوصیت
یہ رہی ہے کہ اکثر موضوعات اور عنوانات کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہیں۔ حضرت شاہ
ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مصنف عبدالرزاق کا شمار کتب احادیث میں تیسرے طبقہ
میں کیا ہے[2]

مصنف کی تحقیق | محدث اعظم علامہ انور شاہ صاحبؒ کی خواہش تھی کہ کاش وقت
کی ضخیم تراث حدیث (مصنف) کو شائع کرکے اسے پھر سے حیات نو بخشا جائے۔
شاگرد مولانا محمد میاں سملکی و مجلس علمی نے استاذ کی اس آرزو پر لبیک کہا اور اسے پورا
کرنے کا عزم کرلیا۔ مختلف مقامات سے مصنف کے نسخے حاصل کیے اور شاہ صاحب
کے ہی شاگرد مولانا حبیب الرحمن الاعظمی سے درخواست کی کہ اس کی تحقیق فرمائیں[3]

---

[1] تہذیب التہذیب بحوالہ سیر اعلام النبلاء ۹ ۳ ـ ۵

[2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ۳۸۹ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

[3] مصنف عبدالرزاق ـ مقدمۃ الناشر

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بھی ستائیس رائی ن س خو بش ... ملی
سے لگایا اور مصنف پر کام شروع کیا، مصنف کے اجزا مختلف ممالک میں منتشر تھے۔
جہاں تک رسائی ہوئی ان کو حاصل کیا گیا۔ افسوس کہ مولانا اعظمی مصنف پر مقدمہ لکھ
سکے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔[1] ورنہ مصنف کے سلسلہ میں ہمارے سامنے پوری
تفصیلات ہوتیں کہ کہاں سے مخطوطات حاصل کئے، کس کو اصل قرار دیا اور اس کی تحقیق
میں کن طریقوں کو اپنایا گیا۔

مختصراً عرض ہے کہ مولانا کو جتنے بھی نسخے ملے سبھی ناقص تھے، سوائے ''مراد
ملا'' آستانہ کے نسخہ کے کہ وہ کامل تھا، البتہ اس کی بھی جلد اول اور پانچویں جلد کے شروع
میں کچھ نقص تھا۔[2] مصنف کے شروع میں مکتبہ اسلامی دمشق اور مراد ملا آستانہ کے
جن دو مخطوطوں کے عکس دیئے گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ان
دونوں نسخوں سے ایڈیٹنگ میں خاص طور سے مدد لی ہے، اس کے علاوہ حیدرآباد کا بھی
نسخہ آپ کے سامنے تھا اور تحقیق کے دوران ڈاکٹر حمید اللہ کے واسطہ کا نسخہ بھی ملا، جس
سے مولانا نے استفادہ کیا۔

مولانا اعظمی نے مصنف عبدالرزاق کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل خدمات
انجام دیں

---

[1] ۵ر فروری ۱۹۷۹ء کے ایک مکتوب میں جو شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
کے نام ہے۔ مولانا نے مقدمہ نہ لکھ سکنے کے اسباب تحریر فرمائے ہیں کہ "مصنف عبدالرزاق
کے مقدمہ کا بہت کثرت سے اور نہایت شدید تقاضہ ہے، لیکن کچھ تو میری طبیعت ٹوٹ گئی، کچھ
دوسرے اہم کاموں میں سہارا ک، پھر برسوں تک شدید ترین علالت کا سلسلہ، ان سب کی بنا
پر اب تک کچھ نہ لکھ سکا، حافظہ میں مواد فراہم ہے، اس کو اوراق پر منتقل کرنے کی نوبت نہیں آرہی
ہے۔ (المآثر اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء)

[2] مصنف عبدالرزاق ۔ تتمہ

۱۔ مخطوطات میں جو اغلاط تھے، خواہ وہ غلطی راوی کے نام میں ہو، یا حدیث کے الفاظ میں، ان سب کی حواشی سے تصحیح کی۔

۲۔ مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی۔

۳۔ اختلاف نسخ کو بیان کیا اور ترجیح کی صورت میں کسی ایک کو ترجیح دی۔

۴۔ حدیث کی تخریج کی اور کن دوسرے مجموعہ ہائے حدیث اور متداول کتابوں میں یہ حدیث موجود ہے ان کا حوالہ دیا، سند پر جرح کرتے ہوئے اس حدیث کا درجہ متعین فرمایا۔

۵۔ حدیث کے کسی شارح و محشی سے کوئی چوک ہوگئی ہے تو اس پر تنبیہ فرمائی اور مصنف میں اس کی تصحیح کی۔

۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ کا جو قلمی یا مطبوعہ نسخہ مولانا کے پاس تھا، وہ پورے کا پورا مصنف کے ذیل میں لے لیا گیا ہے۔[1]

۷۔ مسند حمیدی کی تحقیق میں مولانا نے کتب اصلیہ پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ لیکن مصنف عبدالرزاق میں کتب شبہ اصلیہ اور کتب غیر اصلیہ پر زیادہ اعتماد ہے۔[2]

مولانا اعظمی کی مسلسل دس سال تک جانفشانی اور جانسوزی کے بعد "مصنف عبدالرزاق" پایۂ تکمیل تک پہنچی، یہ بات ہے مصنف کے پہلے ایڈیشن کی عمدہ طباعت بھی مولانا کی ہی رہین منت ہے، انہوں نے اس کی طباعت اپنی نگرانی میں کرائی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء (۱۳۹۰ھ تا ۱۳۹۲ھ) کے دوران یہ کتاب گیارہ جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔

جامع عبدالرزاق یا جامع معمر؟ کتاب الجامع مصنف کی حدیث نمبر ۱۹۳۹

---

[1] معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ ص ۲۱۶ از ڈاکٹر حمید رضی

[2] الماثر نومبر تا جنوری ۹۸-۱۹۹۷ء، ص ۳۵

جلد اس سے شروع ہوتی ہے۔ اور حدیث نمبر ۲۰۰۳۳ جلد ۱۱ پر ختم ہوتی ہے۔
"مصنف" کے اس حصے کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ کہ آیا یہ (جامع) عبدالرزاق
کی تصنیف ہے یا انکے استاذ معمر بن راشد کی؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلے بحث
کرنے والے مشہور محقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ہیں۔ مولانا الاعظمی کی تحقیق ہے کہ
کتاب الجامع عبدالرزاق کی تصنیف ہے معمر بن راشد کی نہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ مولانا
الاعظمی کی تحقیق پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> "مصنف عبدالرزاق کی آخری دو جلدوں میں جامع معمر بن راشد چھپی
> ہے، اور اسکے ایڈیٹر مولانا اعظمی (مولانا حبیب الرحمن صاحب) کو خیال
> نہ ہوا کہ یہ ایک الگ کتاب ہے مصنف عبدالرزاق نہیں، بلکہ عبدالرزاق
> کے استاذ معمر بن راشد کی کتاب الجامع ہے۔"[1]

مولانا الاعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ کے اس نقد کے جواب میں یہ مختصر مضمون
تحریر فرمایا، لکھتے ہیں کہ:

> "یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی خام مسلم مستشرق کی باتوں میں
> آگئے۔ مصنف عبدالرزاق کی آخری کتاب، کتاب الجامع کو جامع
> معمر قرار دینے والوں نے اس کی اکثر حدیثوں کو بروایت معمر پا کر اپنے
> استشراق کے زور سے اس کو جامع معمر یقین کر لیا، وہ اور کچھ نہیں پوری
> کتاب الجامع کو حرفاً حرفاً پڑھ لیتے تو یہ دعوی کرتے ہوئے ان کو خود شرم
> محسوس ہوتی۔"[2]

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اپنے موقف کے دفاع میں مندرجہ ذیل

---

[1] ارشاد ج ۳ ش ۷ ص ۵۷

[2] ارشاد مئی ۱۹۸۳ء ص ۳۵-۳۶، الفرقان جون جولائی ۱۹۸۳ء ص ۶۳-۶۵

شواہد پیش کیے

۱۔ کتاب الدلائل میں شیخ محمد سعید بن سنبل مکی نے مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث "کان شعر رسول اللہ ﷺ الی انصاف اذنیہ" نقل فرمایا اور اسکے بعد تحریر فرمایا "وھو اخر مصنفہ" یعنی یہ حدیث مصنف عبدالرزاق کی آخری حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامع جو مصنف میں ہے جامع عبدالرزاق ہی ہے۔

۲۔ شاہ عبدالعزیز صاحب "بستان المحدثین" میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف شمائل پر ختم کی اور شمائل کو حضور اکرم ﷺ کے موئے مبارک کے ذکر پر ختم فرمایا۔ یعنی شاہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ یہ مصنف کا آخری حصہ ہے۔

۳۔ داخلی شہادت کے طور پر مولانا نے جلد دس سے سات اور گیارہ سے تین حدیثوں کی نشاندہی فرمائی جن کا کوئی تعلق معمر سے نہیں ہے، بلکہ ان کو عبدالرزاق نے دوسرے شیوخ سے روایت کیا ہے۔

۴۔ صاحب کشف الظنون نے امام عبدالرزاق کی کتاب جامع کا ذکر کیا ہے، اور فواد سید نیز شیخ البانی نے لکھا ہے کہ الجامع لعبد الرزاق کا ایک نسخہ مکتبہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے، اس نسخہ پر ۵۵۸ھ کا ایک سماع بھی درج ہے۔[1]

مولانا اعظمی نے دلیل کے طور پر سب سے پہلے شیخ محمد سعید بن سنبل کی تحریر پیش کی اور لکھا "اسکا مطلب یہ ہو کہ شاہ محمد اسحٰق کے شیخ الشیخ کے شیخ کو بھی مغالطہ نہیں ہوا" دوسری دلیل میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریر پیش کرتے ہیں اور پھر لکھتے ہیں "لیجیے شیخ المشائخ کو بھی اشتباہ نہیں ہوا۔"

مندرجہ بالا شواہد کی حیثیت تائیدی تو ہوسکتی ہے، داخلی شہادت اور مخطوطات

---

[1] الرشاد دہلی ۱۹۸۳ء ص ۴۵-۴۷، الفرقان جون جولائی ۱۹۸۳ء ص ۷۳-۷۰

۳۶۲ھ کا تحریر کردہ ہے، القرہ میں تھا۔ دوسرا اس کی نسخہ استنبول میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں مخطوطوں کے مندرجات کا مصنف عبدالرزاق سے باب کتاب الجامع سے مقابلہ کیا تو انہیں ہو بہو ایک ہی چیز پایا۔

(۲) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بقول مصنف عبدالرزاق کے جو متداول نسخے اب مختلف ملکوں میں ملتے ہیں ان میں "کتاب الجامع" کتاب کے آخر میں ہے۔ گویا ہر نسخہ شیخ سعید بن سنبل یا حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی نظر سے گزرا ہوا اور انہوں نے کچھ لکھا ہو اور کچھ خیال آرائی کی ہو تو قصور ان کا نہیں، ہے خیال میں ہر کسی سے ہیا ممکن ہے۔ اگر کسی نے انہیں توجہ دلائی ہوتی اور اس کے بعد بھی وہ اپنی رائے پر قائم رہتے تو وہ اہم چیز ہوتی۔

(۳) گو جامع معمر میں جو مصنف عبدالرزاق کا ضمیمہ بن گئی ہے چند ایسی حدیثیں ہیں جو عبدالرزاق نے معمر سے نہیں بلکہ کسی اور شیخ سے روایت کی ہیں تو اس سے بھی ڈاکٹر صاحب کے مطابق کچھ ثابت نہیں ہوتا مصنف کا وہ حصہ جو بلا اختلاف مصنف عبدالرزاق ہے (۱۰ جلدیں) ان میں کثرت سے حدیثیں "عبدالرزاق عن معمر" ملتی ہیں۔ اس سے وہ جامع معمر کا جزو نہیں بن جاتیں۔ ایسا بار ہا ہوتا ہے کہ کتاب راوی کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے۔ ابن حبیب کی ایک کتاب ان کے شاگرد اور راوی سکری کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔

(۴) دمشق کے مخطوطے کو مصر کے فواد سید نے عبدالرزاق کا قرار دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ فواد سید انقرہ اور استانبول کے مخطوطوں سے واقف نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ترکی کے مسٹر گین جامع معمر کو اشاعت کے لئے تیار کرنے کے بعد دمشق اور رباط گئے، ان دونوں جگہوں کے مخطوطوں کو بھی دیکھا۔ مسٹر گین اپنی جرمن کتاب تاریخ تالیفات عربی میں لکھتے ہیں کہ جامع کے راوی

عبد الرزاق ہیں اور انھوں نے اسے اپنی مصنف کا ذیل بنایا ہے اور اس میں بعض حدیثوں کا اضافہ بھی کیا ہے اور یہ کہ صاحب ابن حجر جلد ۲ ص ۳۰، ص ۳۰۰ میں بھی جامع معمر کے اقتباسات ہیں۔

(۵) ڈاکٹر حمید اللہ صاحب لکھتے ہیں "معمر بہت قدیم مؤلف ہیں۔ ان کے زمانہ میں معمر کے وقت حدیث کے مجموعوں میں کوئی تبویب نہیں ہوتی تھی۔ معمر گویا تبویب کا آغاز کرتے ہیں، پھر ان کے شاگرد تبویب کو مزید ترقی دیتے ہیں اور فقہی ابواب پر حدیثیں مرتب کرتے ہیں اور ان کتابوں کے تحت ذیلی ابواب دیے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں صرف مصنف میں ہی ملتی ہیں، کتاب الجامع میں نہیں ملتیں۔ اس کا نسخہ بالکل علیحدہ ہے اور تبویب بہت ابتدائی حالت میں ہے۔ مصنف میں کتاب الاشربہ اور کتاب البیوع کی حدیثیں دوبارہ الگ مقام پر (یعنی جامع معمر میں) نہ ہوتیں۔ اگر دونوں ایک ہی کتاب کے اجزاء ہوتے تو دو جگہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی حال مصنف میں حضرت عمرؓ کی وصیت کا ہے جو مصنف میں بھی ہے اور جامع معمر میں بھی ہے اور دیگر تفصیلوں پر مشتمل ہے۔[1]

مولانا اعظمی نے، جنھوں نے مصنف عبد الرزاق کے ایک ایک حرف پر بڑی باریک نظری سے تحقیق کی تھی، ڈاکٹر حمید اللہ کے جوابی مضمون پر ایک مفصل جواب تحریر فرمایا، جو عربی مجلہ "البعث الاسلامی" میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس مضمون میں مخطوطات پر بحث کی، مخطوطات کے ناقلین کے اندراجات پیش کرکے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ یہ مصنف کا ہی جزو ہے، معمر بن راشد کی جامع نہیں۔ مولانا نے اس مضمون میں بڑی محققانہ بحث کی ہے۔ ہم اس بحث کی تلخیص یہاں پیش کرتے ہیں۔

---

[1] الرشاد، جون و جولائی ۱۹۸۳ء، ص ۲۵–۲۷

مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ احمد بن منصور رمادی نے امام عبد الرزاق
سے مصنف کے اس حصہ (جامع) کی سماعت [illegible] کی ہے۔ یہ طریقہ اجازت
حدیث دینے کے لئے متقدمین اور رائج رہا ہے۔ رمادی کی روایت والے جامع
کے جزء اول کا ایک نسخہ اور ایک دوسرے نسخہ کے جزء اول کا کچھ حصہ میری نظر سے گزرا
ہے۔ جس نسخہ میں جزء اول کا پورا حصہ ہے وہ دوسرے والے نسخہ سے قدیم ہے
اور حافظ ابو الفتح نصر بن ابو الفرج حصری متوفی ۶۱۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا نے
مخطوطات میں درج سماعات یا روایۃ کے جن اندراجات کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل
میں نہ جا کر اختصار کے ساتھ ان کے پیش کردہ دلائل نقل کئے جاتے ہیں

۱۔ حافظ نصر بن ابو الفرج نے مخطوطہ کے سرورق پر یہ عبارت رقم کی ہے "الجزء الأول من كتاب الجامع عن عبد الرزاق بن همام أبي بكر الصنعاني" اس نسخہ میں سماع کی تفصیل بھی درج ہے، جس سے اس مخطوطہ کی صحت و ثقاہت کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

۲۔ حافظ نصر اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ جامع عبد الرزاق کے جزء اول کو اس نسخہ سے نقل کیا ہے، جس میں حافظ ابو المحاسن القرشی کی تحریر میں یہ صراحت ہے "جامع عبد الرزاق کے اس جزء کی ایک جماعت نے شیخ حسین بن طلحہ سے سماعت کی ہے۔ ان سماعت کرنے والوں میں [illegible] قراءت و سماع کا یہ واقعہ ۳۹۲ھ کا ہے۔"

امام نصر بن ابو الفرج نے ابن الخضر کی تحریر سے نقل کیا کہ "جامع عبد الرزاق کے جزء اول کی سماعت ابن طلحہ سے ۳۹۰ھ میں ایک جماعت نے کی جن میں قابل ذکر مشہور کاتبہ شہدہ بنت ابی نصر ہیں۔"

۳۔ حافظ عمر بن حاجب متوفی ۶۳۰ھ کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہ جامع عبد الرزاق کا جزء اول ہے۔ انہوں نے نصر کا تحریر کردہ نسخہ حاصل کیا اور اس کے سرورق پر تحریر فرمایا کہ

الأربعة وهو جمع كتاب الجامع لعبد الرزاق بن همام على الحرة الأصيلة أم الفضل كريمة ابنة عبد الوهاب "

(میں نے اس جزء اول اور اس کے بعد والے اجزاء یعنی چاروں اجزاء جو عبد الرزاق بن ہمام کی مکمل کتاب الجامع ہے، کریمہ بنت عبدالوہاب کے سامنے قرأت کی۔)

یہ پوری بحث تو ایک نسخہ کی ہوئی، مولانا الاعظمی کی نظر سے جو دوسرا نسخہ گذرا تھا اسکے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ حافظ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تقی الدین قلقشندی کا نسخہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ انہیں کا مکتوبہ ہے۔ اس مخطوطہ کے بھی پہلے ورق پر یہ عبارت رقم ہے "الجزء الأول من كتاب الجامع تاليف الامام عبد الرزاق بن همام الصنعاني" اس مخطوطہ پر بھی سند درج ہے[1]

مولانا نے البعث الاسلامی کے اسی شمارہ میں ذاتی نسخہ میں ضمیمہ کے طور پر ایک اور دلیل پیش کی جسکو المآثر نے شائع کیا ہے لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر بھی کتاب الجامع کو جامع عبدالرزاق ہی مانتے ہیں، امام بخاری نے افشاء السلام من الاسلام کے باب میں حضرت عمارؓ سے ایک موقوف حدیث نقل فرمائی ہے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "معمر نے بھی اسکو اپنی جامع میں موقوف ہی روایت کیا ہے، عبدالرزاق نے اسکو معمر سے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے۔" جب اس حدیث کی تلاش ہوئی تو مصنف عبدالرزاق کے آخری حصہ میں ملی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حجر بھی اسی کے قائل ہیں کہ اتنا حصہ جامع عبدالرزاق کا ہے جامع معمر بن راشد کا نہیں ہے[2]

---

[1] البعث اسلامی صدوہ ج ۲۹ ص ۷۶-۷۵

[2] المآثر ج ۱۳ ش ۳ ص ۸۲

مولانا نے بڑی ہی دقت نظری، وسعت مطالعہ اور مضبوط تحقیقی شواہد کے ساتھ اس پوری بحث کا جائزہ لیا اور اپنے موقف کے سلسلہ میں دلائل کے انبار لگا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس کے جواب میں کوئی مضمون نہیں دیکھا گیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ڈاکٹر حمید اللہ کو مولانا الاعظمی کے ان دلائل نے تحقیقی طور پر مطمئن کر دیا، کیونکہ ڈاکٹر حمید اللہ جیسے محقق سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی ایسے مسئلہ پر جو تحقیقی طور پر ناقابل قبول ہو، محض اس لئے خاموش ہو جائیں کہ بحث کو طول نہ دیا جائے۔

مولانا الاعظمی کے پروفیسر عبدالرحمن مومن کے نام ایک خط مکتوبہ ۲۳ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ، کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو بھی ڈاکٹر حمید اللہ کے جواب کا انتظار تھا۔ مولانا لکھتے ہیں

> "آپ نے البعث الاسلامی والے مضمون کی نسبت ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے کبھی نہیں دریافت کی؟"[1]

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے مصنف عبدالرزاق کی دریافت اور تحقیق کر کے حدیث اور تدوین حدیث کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے شک و ارتیاب کا سد باب کر دیا۔ اور دنیا کو ایک بار پھر یہ پیغام دیا کہ ہم نے جو کچھ بھی قرآن وحدیث سے سنا بحمد اللہ من وعن ویسے ہی محفوظ رکھا جیسا کہ سنا تھا۔ مصنف ابھی زیر طبع ہی تھی کہ مولانا الاعظمی کی ملاقات شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے حرم شریف میں ہوئی، حضرت شیخ مولانا سے لپٹ کر رونے لگے اور فرمایا کہ آپ نے بہت بڑا کام انجام دیا اور سلف کا قرض اتار دیا۔[2]

---

[1] دارالعلوم مئی ۱۹۹۵ء ص ۲۹

[2] ترجمان اسلام ۱۱ ۱۲ ص ۲۰۳

تحقیقات کے نمونے

۱- ج ۱ ص ۱۹۷ ح ۷۶۳ عبدالرزاق عن معمر عن أيوب عن يزيد بن سعيان الخ

مولانا اعظمی 'سعیان' پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ اصل نسخہ میں 'یزید بن سعیان' کے بجائے "یزید بن فلان" رقم تھا۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ ۲۲ میں عبدالوارث کے طریق سے "عن أيوب عن يزيد بن سعبان" ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر کاتبوں سے کوئی تصرف نہ ہوا ہو تو میرے خیال میں "یزید بن سعیان" ابوالمہزم بصری ہیں، جنکا ذکر ابن ابی حاتم وغیرہ نے کیا ہے ورنہ تو میرے نزدیک صحیح 'یزید ابو العلاء' ہے۔ اور وہ یزید بن عبداللہ بن شخیر مطرف کے بھائی ہیں، جن کی کنیت 'ابو العلاء' ہے، مطرف سے روایت کرتے ہیں تہذیب میں ان کا تذکرہ ہے۔

۲- ج ۲ ص ۲۸۷ عبدالرزاق عن معمر عن الزهري عن ابن المسيب عن أبي هريرة الخ

مولانا اس حدیث کی تخریج فرماتے ہیں کہ اسکو مسلم نے ابن عیینہ کے طریق سے عن الزهري عن سعيد اور ابراہیم بن سعد کے طریق سے عن الزهري عن سعيد وأبي سلمة (۲۲۰) اور بخاری نے ابن ابی ذئب کے طریق سے عن الزهري عن سعيد وأبي سلمة روایت کیا ہے۔ (فتح ۳ ۹۲)

۳- اس حدیث میں ایک لفظ "عطاش" آیا ہے۔ اس لفظ کی تشریح مولانا ان الفاظ میں کرتے ہیں "داء يصيب الإنسان فيشرب الماء فلا يروى" یعنی عطاش ایک ایسا مرض ہے جو اگر کسی کو لگ جائے تو پانی پیتا رہے گا لیکن اسے سیرابی نہیں ہوتی اور پیاس نہیں بجھتی ہے۔

مصنف عبدالرزاق پر قسط وار مضمون محمد معارف (اعظم گڑھ) اکتوبر ۲۰۰۶ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کلام کی حفاظت کی ضمانت لی "وانا لہ لحافظون"، اسی طرح اس پاک کلام کے شارح اپنے محبوب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے بکھرے ہوئے یاقوت ومرجان کی بھی حفاظت فرمائی۔ اور محدثین عظام کے ذہن ودماغ کو ایسا روشن ومجلی کردیا کہ وہ احادیث مبارکہ کی حفاظت کی خاطر نئے نئے طریقے اپناتے اور حدیث کی تدوین مختلف حیثیتوں سے کرتے رہتے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ان ہی میں سے ایک طریقہ "زوائد" کی ترتیب کا بھی ہے۔

"زوائد" ان احادیث کو کہتے ہیں جو صحاح ستہ میں نہ ہوں لیکن دوسری کتب حدیث میں موجود ہوں۔ اولا حافظ نورالدین ہیثمی مصری (متوفی ۸۰۷ھ) نے مسند احمد، مسند ابویعلی، مسند بزار اور طبرانی کی معجم کبیر، معجم صغیر اور معجم اوسط کے زوائد کو منتخب فرمایا، اور ان زوائد کو مع انکی اسانید کے ایک جگہ جمع کردیا۔ بعد میں ہیثمی نے اپنے استاذ زین الدین عراقی کی خواہش پر زوائد میں سے اسانید حذف کردیں۔[1] اس مجموعہ حدیث کا نام "مجمع الزوائد ومنبع الفوائد" ہے۔

المطالب العالیہ کی خصوصیات | علامہ ہیثمی کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی نے اسی طریق پر چلتے ہوئے آٹھ مسانید مکمل مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند ابن ابی عمر، مسند مسدد، مسند احمد بن منیع، مسند ابن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند ابن ابی اسامہ کے زوائد کا انتخاب فرمایا، اسکے ساتھ ساتھ مسند ابویعلی کے ان زوائد کو جو مجمع الزوائد میں آنے سے رہ گئے تھے اور مسند اسحاق بن راہویہ کا جو ناقص نسخہ حافظ ابن حجر

---

[1] مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۲،۱

کے پاس تھا اسکے زوائد کو بھی یکجا کیا۔

علامہ ابن حجر کا ارادہ ہوا کہ جتنی بھی احادیث ان کے حصارِ علم میں ہیں ان کو یکجا جمع کر دیں تاکہ استفادہ آسان ہو لیکن پھر یہ ارادہ بدل گیا جیسا کہ خود ابن حجر کی تحریر سے واضح ہوتا ہے

"فرأيت جمع جميع ما وقفت عليه من ذلك في كتاب واحد يسهل الكشف منه على أولي الرغبات، ثم عدلت إلى جمع الأحاديث الزائدة على الكتب المشهورات في الكتب المسندات"[1]

(میرا خیال ہوا کہ وہ تمام احادیث جن سے میں واقف ہوں ایک کتاب میں جمع کر دوں تاکہ اس وجہ میں ہی استفادہ آسان ہو، پھر میرا ارادہ ہوا کہ مشہور کتابوں کے زوائد جو مسانید میں ہیں انہیں یکجا کر دوں۔)

ابن حجر عسقلانی کے نزدیک کتب مشہورہ سے مراد صحاح ستہ اور مسند احمد ہیں، یعنی جو حدیثیں ان سات کتابوں میں نہیں ہیں اور دوسری مسانید میں ہیں انکو ابن حجر نے جمع کیا۔ دس مسانید (جن میں سے اکثر اب نایاب ہیں) کی احادیث کو ایک مجموعۂ حدیث میں یکجا کر کے حافظ ابن حجر نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا۔ اس مجموعہ کی ترتیب فقہی ابواب کی ترتیب پر ہے۔ اس مجموعۂ حدیث کو "المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ" کا نام دیا گیا۔ اس میں ابن حجر نے کہیں کہیں حدیثوں پر حکم لگا کر ان کا درجہ بھی متعین کیا ہے، اس کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ اس ایک کتاب میں حدیث کی کثیر کتابوں کے زوائد نقل کئے گئے ہیں۔

مخطوطات کی تلاش اس اہم سرمایۂ حدیث، جو کئی مجموعہائے حدیث کا مجموعہ تھا

[1] مطالب عالیہ ــ مقدمہ

مسدد سے اس کو نقل کیا گیا۔

۲۔ بوصیری نے ''اتحاف'' میں اس حدیث پر بحث کی ہے اس پر نشان لگا دیا۔

۳۔ ہیثمی نے ''مجمع الزوائد'' میں حدیث کے تحت جو کلام کیا ہے اس کو نقل کیا ہے۔

۴۔ جن احادیث پر محدثین یا ان کے علاوہ کسی نے بھی کوئی کلام نہیں کیا ہے تو ان احادیث کے موقوف، مرفوع، مرسل یا موصول ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کے راویوں پر اسماء رجال کی کتابوں کے مطابق حکم لگایا گیا، لیکن ہر جگہ اس کا التزام نہیں برتا گیا ہے۔

احادیث کی تحقیق و ترتیب میں کچھ رموز و مخففات کا بھی سہارا لیا گیا ہے، مثلاً اگر کسی حدیث کے شروع میں (☆) کی علامت بنی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث صحیح ہے اور لائق اعتماد ہے، لیکن اس کے ساتھ مولانا اعظمی نے یہ بھی وضاحت کردی کہ ''ولیس فقدان الأمارة دالا علی ان الحدیث مردود'' یعنی جس حدیث پر یہ علامت نہ بنی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ قابل اعتماد نہیں، بلکہ (☆) نہ ہونے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اس حدیث کی مزید تحقیق کرلی جائے۔

حدیث کے آخر میں یہ علامت (=) اگر آپ دیکھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا تعلق آگے آنے والی حدیث سے ہے چنانچہ اس کا شمار دوسری یا تیسری حدیث کے ساتھ ہوگا جب ماخذ ایک ہی ہو۔ کہیں کہیں حافظ ابن حجر کی شرح کو نقل کیا ہے اور صحاح ستہ اور مسند احمد میں سے کوئی حدیث ملی ہے تو اس کی بھی نشاندہی کی گئی۔

مولانا اعظمی مطالب عالیہ کے سلسلہ میں اپنی خدمات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

''علقت علی الكتاب تعليقات وجيزة فسرت فيها غريبه

وأوضحت غامضه وعرفت من رجال الأسانيد من رأيت الضرورة داعية إلى التعريف له"[1]

(میں نے اس کتاب پر مختصر تعلیقات لکھیں، غریب اور مغلق عبارتوں کی تشریح و توضیح کی اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی راویوں کا تعارف کرایا۔)

مولانا نے اس کتاب پر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا، جس میں مصنف کا تذکرہ ہے، اور مخطوطات کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے۔ اور تحقیق میں جو طریقے اختیار کئے گئے ان کی پوری تفصیلات مذکور ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۰ء میں پہلی بار وزارۃ الاوقاف کویت سے شائع ہوئی۔

مولانا اعظمی نے مطالب عالیہ کی خدمات کے سلسلہ میں جو کام کئے ہیں، ان سے ان کی دیدہ ریزی، جانفشانی اور علمی حذاقت کے ساتھ ساتھ تحقیق کے بلند معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی رقمطراز ہیں:

"یہ تعلیقات تاریخی، ادبی، اور فن حدیث، علم اسماء و رجال سے متعلق معلومات کا بیش بہا گنجینہ ہیں، جس کے باعث کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے، اور جو مولانا کے غزارت علم اور وسعت مطالعہ کی شاہد عدل ہیں۔"[2]

تعلیقات کے نمونے:

۱- ج ۱ ص ۱۲۷ ح ۳۶۱ - أبو محجن قال قلت لابن عمرو وابن عباس

اصل نسخہ میں "لابی عمرو" تھا، مولانا اعظمی نے اس کی تصحیح کی اور

---

۱ مقدمہ

۲ برہان اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۸۱

"لابی عمرو" کی جگہ "لابن عمر" تحریر فرمایا اور مجمع میں طبرانی کی روایت پیش کی، اسی طرح زوائد ۲/۲۷ کا بھی حوالہ دیا جہاں یہ طبرانی ہے۔

۲۔ ج س ۲۲۵ ح ۸۳۹- ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک راوی عبید بن سفیان مولی کثیر بن اصلت ہیں، مجھے ان کا تذکرہ نہیں ملا، البتہ اسکے بقیہ رواۃ ثقہ ہیں۔ مولانا اعظمی نے بتایا کہ ابن حجر نے تہذیب میں کثیر بن اصلت کا تذکرہ کیا ہے اور "تقریب" میں انہوں نے انکو مقبول کہا ہے۔ نسخہ مسندہ میں "عبد ربہ بن سفیان" ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ غلط ہے صحیح عبید بن سفیان ہے۔

۳۔ ج ۴ ص ۴۴ ح ۳۹۶۹- بوصیری نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے کہا کہ اسکے رواۃ ثقہ ہیں۔ ہیثمی نے تنبیہ کی کہ اسکے تمام رواۃ ثقہ نہیں ہیں بلکہ اس میں ایک راوی زکریا اصبہانی ہیں اور وہ ضعیف ہیں۔ (۹/ ۱۲۸)

مولانا اعظمی نے ہیثمی کی اس تنبیہ پر تنبیہ کی کہ اس ضعیف راوی کا نام زکریا اصبہانی نہیں، بلکہ صحیح نام زکریا الضبہانی ہے۔ ازدی نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے، ابن ابی حاتم نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن جرح وتعدیل سے خاموش ہیں۔

فتح المغیث بشرح الفیۃ الحدیث

زین الدین عراقی (۷۲۵ھ-۸۰۶ھ) ایک بلند پایہ محدث گزرے ہیں۔ اصول حدیث پر انکی ایک گرانقدر کتاب 'الفیۃ الحدیث' ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ نثر میں نہیں بلکہ نظم میں ہے۔ اس منظوم کتاب 'الفیۃ الحدیث' کی نثری شروحات بھی لکھی گئیں، جن میں مشہور اور قابل ذکر شروح شرح قاضی زکریا بن محمد الانصاری، شرح سیوطی، شرح شیخ ابراہیم بن محمد الحلبی، شرح زین الدین حنفی، شرح ابی الفدا، الکنانی، شرح شیخ قطب الدین الخیضری اور شرح شمس الدین السخاوی ہیں۔

امام سخاوی محمد بن عبدالرحمن بن محمد شمس الدین سخاوی (۸۳۱ھ - ۹۰۲ھ) ایک مورخ، محدث، مفسر اور ادیب کی حیثیت سے آفاقی شہرت حاصل ہے، مصر کے ایک گاؤں 'سخا' سے آپ کی اصل ہے، قاہرہ میں پیدا ہوئے اور مدینہ میں وفات پائی۔[1] بے شمار ائمہ فن سے کسب فیض کیا جن کی تعداد چار سو کے عدد کو بھی پار کر جاتی ہے، مختلف ائمہ سے آپ کو افتاء، تدریس اور املاء کی اجازت حاصل ہوئی، حافظ ابن حجر عسقلانی سے سب سے زیادہ وابستہ رہے اور ان سے کثرت سے سماع حدیث کیا۔[2]

فتح المغیث کی خصوصیات سخاوی نے دو سو کتابیں تصنیف فرمائیں[3] جن میں ایک 'الفیۃ الحدیث' کی نثری شرح 'فتح المغیث' ہے۔ شروحات تو بہت لکھی گئی ہیں، لیکن 'فتح المغیث' کی حیثیت ان سب سے منفرد ہے، حافظ سخاوی نے 'فتح المغیث' میں 'الفیۃ الحدیث' کے متن کی تہذیب و ترتیب ایسے انوکھے انداز سے کی ہے کہ اس فن میں اس سے زیادہ جامع اور تحقیقی شرح کا علم نہیں[4] نواب صدیق حسن خاں کے لفظوں میں "شاید کہ ایں شرح احسن شروح ست۔"[5]

'فتح المغیث' ہند و بیرون ہند سے شائع بھی ہو چکی تھی، لیکن کتابت و طباعت میں غلطیاں و سقطات اس قدر تھے کہ قاری کے لئے اس جیسی اہم ترین کتاب سے استفادہ دشوار تھا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے افادہ واستفادہ کی راہ میں رخنہ ڈالنے والے ان عیوب سے 'فتح المغیث' کو پاک کر کے ایک جدید نسخہ تیار کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اس کے مطبوعہ نسخوں میں تقابل کر کے کتابت و طباعت کی اغلاط کی تصحیح کی۔ اس

---

[1] الاعلام ۶: ۹۴

[2] شذرات الذہب ۸: ۱۵

[3] الاعلام ۶: ۱۹۴

[4] الضوء اللامع ۸: ۱۶

[5] اتحاف النبلاء ص ۲۳

کتاب میں مولانا اعظمی کی تعلیقات ہمیں جا بجا نظر آتی ہیں، اس سے ..۔
مولانا کی ان قابل قدر کاوشات کی بدولت پانچ سو سال بعد اس کتاب کے ایک
جدید نسخہ کی تہذیب وترتیب عمل میں آئی۔ اس تصحیح شدہ نسخہ کی پہلی جلد مطبع ... کی
مئو، اعظم گڈھ نے شائع کی، لیکن افسوس کہ اس کی دو جلدیں اب بھی طباعت
واشاعت کا مرحلہ طے نہ کرسکیں۔ طالبین حدیث سے ... متعدد مقامات
اب بھی وہی دشواریاں برقرار ہیں جو اس سے پہلے تھیں۔ ... مولانا اعظمی کے تصحیح
کردہ نسخہ کی مکمل طباعت کا مرحلہ طے کردے۔ آمین

تعلیقات کے نمونے:

۱۔ ج ۱ ص ۱۰۳۔ أو إلى مالك ونحو ذلك

اصل نسخہ میں "ونحو ذلك" کی جگہ پر "ونحو قلت" رقم تھا۔ مولانا نے اسے تحریف قرار دیا اور متن میں اسی تصحیح کی "ونحو ذلك" اپنی اس تصحیح کے لئے مولانا نے تدریب الراوی کا حوالہ دیا۔

۲۔ ج ۱ ص ۱۰۴۔ وشذ الحاكم فاشترط عدم الانقطاع، واختلف فيه هل يسمى خبراً أم لا؟ إلخ

ہندوستانی نسخہ میں "واختلفه" اور مصری نسخہ میں "احتلافه" تھا۔ مولانا نے صرف لفظوں میں کہا "كلاهما تحريف" یعنی دونوں تحریف ہے، صحیح اور سیاق عبارت کا تقاضہ "اختلف" ہے، چنانچہ متن میں "اختلف" ہی نقل فرمایا۔

۳۔ ج ۱ ص ۳۹۹۔ عن أبي القاسم الأبدوسي إلخ

مولانا اعظمی اس پر وضاحتی حاشیہ لگاتے ہیں کہ ابدوس جرجان کا ایک گاؤں ہے، جیسا کہ تذکرۃ الحفاظ میں ہے، ذہبی نے بھی ابوالقاسم راوی کا تذکرہ کیا ہے، سمعانی نے اس نسبت کو نظر انداز کیا ہے اور معلق نے اس پر کوئی استدراک نہیں کیا ہے۔

تلخیص خواتم جامع الاصول

ابوالسعادات مبارک معروف بابن اثیر جزری (۵۴۴ھ-۶۰۶ھ) کی تصنیفات میں سے ایک مشہور ترین تصنیف "جامع الاصول من احادیث الرسول" ہے۔ ابن اثیر نے اس کتاب میں صحاح ستہ کی حدیثوں کو جمع کیا، غریب الفاظ کی تشریح کی اور مشکلات کو بھی ضبط کیا ہے۔ راویان حدیث کے ناموں اور دوسرے متعلقات فن بھی بیان فرمائے، اس لحاظ سے یہ گویا صحاح ستہ کی شرح ہے۔[۱]

اس کتاب کے تین رکن ہیں، پہلا مبادی، دوسرا مقاصد اور تیسرا رکن خواتم ہے۔ پہلا رکن پانچ ابواب پر منقسم ہے۔[۲] اور تیسرا رکن "خواتم" تین فنون پر مشتمل ہے، فن اول احادیث مجہولہ کے سلسلہ میں ہے، اس رکن میں صحاح ستہ کے راویوں کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔

اس مفصل و مطول مجموعۂ حدیث کے انتقاء اور اختصار بھی لکھے گئے۔ مطبوعات نول کشور کی فہرست میں "جامع الاصول" کی دو جلدوں میں تلخیص "تیسیر الوصول الی احادیث جامع الاصول" کے نام سے ملتی ہے۔ یہ تلخیص علامہ ابن الدیبع الشیبانی متوفی ۹۴۴ھ نے کی ہے۔[۳]

ہندوستان کے مایۂ ناز محدث اور قاطع بدعت علامہ محدث محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ جن کا تذکرہ "مجمع بحار الانوار" کے ذیل میں آچکا ہے، نے جامع الاصول کے رکن "خواتم" کے اس حصہ کی تلخیص کی ہے جس میں صحاح ستہ کے

۱۔ عجالۂ نافعہ ص ۲ شاہ عبد العزیز

۲۔ جامع الاصول ۱/۱ ابن اثیر جزری

۳۔ تحقیقی مقالات ص ۲۴۳ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

راویوں کا تذکرہ ہے۔ نیز شیخ نے اس حصہ میں مشتبہ ناموں میں آنے والے راویوں کے
کنیت، انساب، القاب اور انساب وغیرہ سے بحث کی ہے۔

طاہر پٹنی نے اس حصہ کا انتخاب اور تلخیص کر کے اس کو مفید سے مفید تر بنا دیا۔ خاص کر اس طالب علم کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے جو طوالت سے اکتا جائے اور تفصیل سے گھبرا جائے۔ رجال پر یہ ایک نادر کتاب تھی لیکن اب تک صرف دو چار مخطوطات کی ہی زینت بنی ہوئی تھی، اس کی طباعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ اہل علم اس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے۔

۱۳۹۳ھ م ۱۹۷۳ء میں مولانا اعظمی کا سفر حج ہوا، وہاں مولانا کی ملاقات جناب محمد نورولی سے ہوئی جو محدث پٹنی کے خاندان کے تھے۔ جناب محمد نورولی[1] نے مولانا اعظمی سے طاہر پٹنی کی اس کتاب کا تذکرہ کیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کی تحقیق فرمادیں تاکہ اس کو منظر عام پر لایا جائے۔ مولانا کی بھی دلی خواہش تھی کہ محدث پٹنی کی اس کتاب کی طباعت ہو جاتی تو اسماء رجال پر ایک اور عمدہ کتاب کا اضافہ ہو جاتا چنانچہ مولانا اس کام کو کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

مخطوطات | وطن واپسی پر مولانا نے اس کتاب کی تحقیق شروع کی، مختلف کتب خانوں سے اس کے نسخے حاصل کیے۔ تحقیق و تعلیق کے وقت مولانا اعظمی کے سامنے رضا لائبریری رام پور کا نسخہ تھا۔[2] اس کے علاوہ خدا بخش لائبریری پٹنہ، دار العلوم

---

[1] شیخ محمد عبد اللہ نورولی ابھی حال ہی میں ۲۰ ذیقعدہ ۱۴۲۳ھ کو انتقال کر گئے۔ بہت علم دوست آدمی تھے، مجمع بحار الانوار اور مندرجہ بالا کتاب تلخیص جامع الاصول اپنے نفقہ پر شائع کرائیں۔ (المآثر ج ۱۲ ش ۴ ص ۸۶)

[2] اس کتب خانہ کا آغاز رام پور والی ریاست نواب فیض اللہ خاں کی ذاتی لائبریری سے ہوا۔ نواب رضا علی خاں کی حیثیت میں جو ۱۹۳۰ء میں حاکم ہوئے تھے، رام پور کی لائبریری کتابوں اور خصوصاً مخطوطات سے پٹ گئی، اس میں تقریباً پندرہ ہزار مخطوطے ہیں جن میں سب سے بڑی تعداد عربی =

ندوۃ العلماء کی لائبریری اور طاہر پٹنی کے وطن پٹن کے مخطوطے بھی تھے۔ خدا بخش لائبریری سے جزری کی جامع الاصول کے تیسرے رکن "خواتم" کے فن اول اور فن ثانی کے نسخے کا بھی عکس دستیاب ہو گیا تھا۔ اس نسخہ کو سب سے تقدیم حاصل رہا تھا۔

تحقیق و تعلیق مولانا الاعظمی نے سب سے پہلے خدا بخش لائبریری اور ندوۃ العلماء کے نسخوں سے جن میں اغلاط کی کثرت تھی ایک پاکیزہ نسخہ تیار کیا۔ مصادر و مراجع سے رجوع کیا اور بڑی باریک بینی سے متن کی تصحیح، تشریح یا اس سے متعلق تمام امور کو حاشیہ پر درج فرمایا۔ بہت اہم علمی نکات کے اضافے بھی کیے۔

مولانا الاعظمی کو جامع الاصول کے اس حصہ سے جو ان کو خدا بخش لائبریری سے دستیاب ہوا تھا کافی مدد ملی۔ اگرچہ اس سے استفادہ آسان نہ تھا کیونکہ اس کے حروف باریک اور کہیں کہیں پھٹے ہوئے تھے۔ مولانا نے اس نسخہ کی اہمیت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا

"لو لم ارجع الیہ لم یمکن تصحیح الکتاب"[1]

(اگر میں اس کی طرف رجوع نہ کرتا تو کتاب کی تصحیح نہ ہو پاتی۔)

مؤلف نے کتاب کے نام کی تصریح نہیں کی تھی لیکن بعض کاتبوں نے اپنے نسخے میں "تتمہ کتاب الفصول" لکھا ہے تو دوسری جانب خدا بخش لائبریری

= کی بہ نسبت تقریباً چھ ہزار مخطوطات۔ یہاں چمڑے پر لکھا ہوا قرآن کا ایک مخطوطہ ہے، جسے عام طور پر مشہور ہے کہ وہ حضرت علیؓ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ خطاطی کا موجد ابن مقلہ بغدادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید بھی محفوظ ہے۔ (کتب خانے ص ۴۹-۵۰ رضا علی عابدی)

رضا لائبریری کی افادیت اور اس کے خدمات کے سلسلے میں جناب رضا علی خاں کا نام ضروری ہے، دنیا اردو ادب کے محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر ان کا ذکر نہ کیا جائے۔

[1] تلخیص از مقدمہ جامع الاصول (ج ۱)

۸۸۹ھ درج ہے جبکہ صحیح ۹۸٦ھ ہے۔ اسی طرح اور بھی فحش غلطیاں ہیں۔

تعلیقات کے نمونے

۱۔ص ۳۲ وكتب عنه شيخه ابو القاسم الأزدي وشيخه ابو بكر الخوارزمي البرقاني الخ

اصل نسخہ اور عکسی نسخہ میں 'ابو عمرو' تھا، مولانا اعظمی یہاں چونکے کہ برقانی کی کنیت تو ابو بکر ہے، ان نسخوں میں 'ابو عمرو' کیسے لکھدیا گیا؟ تذکرۃ الحفاظ وغیرہ میں ابو بکر ہی ہے، اور خود آگے چل کر مؤلف علام بھی برقانی کی کنیت ابو بکر ہی ذکر کرتے ہیں، چنانچہ مولانا نے اس کی تصحیح کی اور 'شيخه ابو بكر' تحریر فرمایا، اور یہ جب جامع ماصوں میں دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا کہ اصلاح کی تھی۔

۲۔مولانا نے اس کتاب کے متن میں تشریحی وتوضیحی یا تعارفی اضافے بھی کئے ہیں، مثال کے طور پر ص ۷۷ پر ایک جگہ متن میں 'هو ابو عبد الرحمن جبير بن نفير الحضرمي' آیا ہے۔

مولانا اس پر اضافہ کرتے ہیں (من كبار تابعي اهل الشام ذكره الطبري في طبقات الفقهاء) یعنی ابو عبدالرحمن جبیر بن نفیر الحضرمی شام کے اجلہ تابعین میں سے ہیں، طبری نے طبقات الفقہاء میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مولانا نے اپنی عبارت کو بین القوسین رکھا ہے تاکہ ان کی عبارت اور متن میں تمیز وفرق ہو جائے۔

۳۔ص ۱۳۸ ۔هو زياد بن أبي الجعد رافع الأشجعي، وهو اخو سالم وعبيد وعبد الله، روى عن وابصة بن معبد وعمرو بن الحارث روى عنه [ابنه] رافع الخ

اصل نسخوں میں روى عنه اور رافع کے درمیان کی عبارت مٹی ہوئی تھی

مولانا اعظمی نے تہذیب التہذیب اور جامع الاصول کے حوالے سے زوی عنہ اور زائدہ کے درمیان (ابیہ) کا اضافہ فرمایا ہے ، دونوں نسخوں کے عیب سے اپنی تحقیق وتعلیق پر کوئی آنچ نہ آنے دی ، بلکہ دوسرے مراجع سے اس نقص کو دور کیا ۔

کشف الاستار عن زوائد البزار علی الکتب الستۃ

گزشتہ صفحات میں مطالب عالیہ کے ذیل میں زوائد کی اور اس سلسلہ کی کتب کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے ۔ ہم یہاں صرف "کشف الاستار عن زوائد البزار" کے بارے میں گفتگو کریں گے ۔ امام ہیثمی نے جن چھ کتب کے زوائد جمع کئے تھے ان میں سے ایک مسند بزار بھی ہے جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے ۔ ابوبکر احمد بن عبد الخالق بزار بصری متوفی ۲۹۲ھ کے تعارف میں دارقطنی فرماتے ہیں کہ :

"کان ثقۃ یخطی کثیرا ویتکل علی حفظہ"[1]

(بڑے ثقہ راوی ہیں البتہ ان سے غلطیاں بھی بہت ہوتی ہیں ، انہیں اپنے حافظہ پر اعتماد رہتا ہے ۔)

امام ہیثمی نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر سلیمان ۷۳۵ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے ۔ شیخ زین الدین عراقی کے شاگرد تھے ۔ ہیثمی شیخ عراقی کے ساتھ چمٹے رہتے تھے جہاں جہاں سماع حدیث کے لئے شیخ عراقی جاتے وہاں وہاں ہیثمی بھی جاتے ۔ احادیث کے متون کثرت سے یاد کیا کرتے تھے ۔[2]

ابن حجر فرماتے ہیں

"کان خیرا ساکنا لینا سلیم الفطرۃ شدید الانکار للمنکر ،

۱؎ تذہیب ، ج ۱ ص ۳۳۷

۲؎ طبقات الحفاظ ص ۵۳۵

مخطوطہ پر خدمات کا ذکر کرتے ہوئے حاشیہ پر درج ایک سماع نقل کرتے ہیں:

"ثم جمیع الشیخ شمس الدین الحنفی قراءۃ والجماعۃ سماعاً علی عثمان بن محمد الدیمی"[۱]

(عثمان بن محمد دیمی کے سامنے شیخ شمس الدین حنفی کی قرأت پر ایک جماعت نے سماع کیا۔)

اسی طرح ایک سماع مؤلف یا کاتب کی تقسیم کے مطابق کتاب کے نصف اول کے آخر میں اور ایک سماع کتاب کے بالکل آخر میں بھی درج ہے

یہ مخطوطہ ۹ سینٹی میٹر چوڑا اور ۲۰½ سینٹی میٹر لمبا تھا۔ ۸۳۶ ورق تھے، مشرقی خط نسخ میں ایک خوبصورت مخطوطہ تھا۔ زیادہ تر کلمات پر نقطے وغیرہ بھی لگائے گئے تھے۔ اس نسخہ کی ہیثمی کے سامنے قرأت بھی کی گئی تھی، گویا یہ ایک تصحیح شدہ نسخہ تھا۔ اس نسخہ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ نسخہ حافظ ابن حجر کے مطالعہ میں بھی رہا ہے۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں

"وقد حلی طررها فی مواضع عدیدۃ بحواش تعلیقاته التی أغلبها تعقبات علی المؤلف الهیثمی رحمه الله"[۲]

(کئی جگہ اس نسخے کے حاشئے کو اس کی (ابن حجر کی) عمدہ تعلیقات، جن میں زیادہ تر مؤلف ہیثمی پر تعقبات ہیں، سے زینت بخشی ہے۔)

اس مخطوطہ کو عالم فاضل علی بن احمد بن علی حلبی نے مؤلف کی حیات میں ۸۰۷ھ میں تحریر فرمایا تھا۔ انہوں نے اس نسخہ کو تیار کرنے میں اتنی احتیاط برتی تھی کہ کہیں کوئی حذف یا کمی نہ ہونے پائے اصل نسخہ کو من وعن نقل کر دیا۔ یہاں تک کہ

---

۱ الکشف ستار، مقدمہ، سماعات الکتاب

۲ ایضاً

جن احادیث وابواب کو ہیثمی نے کاٹ دیا تھا، انہوں نے بھی ان احادیث وابواب کو لکھ کر کاٹ دیا۔ اسی طرح سے مؤلف نے متن کی جو عبارت حاشیہ میں لکھی تھی اسے بھی انہوں نے حاشیہ میں ہی رکھا۔ اس باکمال کاتب نے فصل وکتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔ بعض مواقع پر الفاظ غریبہ کی تشریح بھی کی اور جہاں وضاحت کی ضرورت تھی وہاں توضیح بھی فرمائی۔

تصحیح وتعلیق | مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے کشف الاستار کی تحقیق وتعلیق میں مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں:

۱۔ مولانا نے سب سے پہلے حاصل شدہ نسخہ کی اپنے صاحبزادے جناب مولانا رشید احمد الاعظمی سے نقل تیار کرائی۔

۲۔ پھر مولانا نے اپنے عزیز شاگرد مولانا عبدالجبار بستوی سے مجمع الزوائد میں زوائد بزار کی احادیث کو تلاش کرنے اور جس جس حدیث پر ہیثمی نے تعلیقات لکھیں یا کلام کیا ہے، ان سب کو نقل کرنے کو کہا۔

۳۔ مولانا الاعظمی نے اول سے آخر تک اس نسخہ کا مطالعہ کیا اور کاتب کی غلطیوں کی نشاندہی فرمائی۔

۴۔ جہاں تشریح وتوضیح کی ضرورت تھی وہاں وضاحت کی۔

۵۔ اگر کہیں ہیثمی کے کلام میں تشنگی رہ گئی ہے تو اس کو مولانا نے دور کیا، اسی طرح اگر کہیں ژولیدگی ہے تو اس کی بھی توضیح فرمائی۔

۶۔ بعض مصنفین کی غلطیوں پر بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے۔

۷۔ ابن حجر نے جو تعلیقات لکھی ہیں ان کو بھی اپنی تعلیقات کے ساتھ ہی کتاب میں نقل فرمایا۔

۸۔ ہیثمی کی فروگزاشتوں کی بھی نشاندہی فرمائی اور بعض مقامات پر مولانا نے ابن حجر

۲۔ ج ۲ ص ۲۶ ح ۱۳۵۷ - عن ابی مالک قال ثنا ابو لبابة الاسلمی ان

ماله نه من تلاده ... الخ

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے "تلاد" مولانا اس کی تشریح کرتے ہیں

لسان العرب، التلاد: المال القدیم، ضد الطارف، وکذا التلاد" "تالد" صیغہ صفت

ہے اس کی ضد طارف ہے اور اسی سے "تلاد" ہے، یعنی خاندان میں قدیم زمانہ

سے اس کا ہونا۔

۳۔ ج ۲ ص ۵۶ ح ۱۱۹۵ - اس حدیث کے سلسلہ میں محشی فرماتے ہیں کہ اس کو

بزار اور طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے، اس کے سارے راوی ثقہ ہیں (۹۴)

مولانا اعظمی فرماتے ہیں "کلا" یعنی قطعاً نہیں بلکہ اس حدیث میں ایک راوی اسحاق

بن محمد الفروی ہیں جو کہ ثقہ نہیں ہیں اگرچہ بخاری نے ان کی حدیث لی ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ

امام ابوبکر بن ابی شیبہ عبداللہ بن محمد بن ابراہیم بن عثمان، ابوبکر کنیت سے معروف ہیں

ابن ابی شیبہ اہل کوفہ میں سے ہیں، ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عظمت شان،

علمی کمالات کا تمام محققین، ارباب سیر، تذکرہ نگاروں اور معاصرین نے اعتراف کیا

ہے۔ ایک طرف جلیل القدر اساتذہ جلوہ افروز ہیں تو دوسری جانب نامور محدثین

علماء کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ہم ان میں سے چند حضرات کے اسماء کے ذکر

پر اکتفا کرتے ہیں۔

شیوخ میں شریک، ہشیم، ابن المبارک، ابن عیینہ اور غندر وغیرہ ہیں

تلامذہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابوزرعہ، ابو حاتم اور بقی جیسے

۱۔ تاریخ بغداد ۱۰ / ۶۶

ائمہ فن ہیں [1] امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے پندرہ سو احادیث کی روایت کی ہے۔ [2]

ابو عبید فرماتے ہیں:

"انتهى علم الحديث إلى أربعة أبي بكر بن أبي شيبة وهو أسردهم له وابن معين وهو أجمعهم له، وابن المديني وهو أعلمهم به وأحمد بن حنبل وهو أفقههم فيه" [3]

(علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہوگیا ابوبکر بن ابی شیبہ حسن بیان اور سلیقۂ روایت میں، ابن معین کثرت روایت میں، ابن مدینی حدیث کے صحت وسقم سے واقفیت میں اور احمد بن حنبل حدیث کے اسرار ورموز سے باخبری میں سب پر فائق تھے۔)

ابو زرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوبکر بن ابی شیبہ سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا۔ [4] ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ "كان ثقة عديم النظير" [5] مسجد رصافہ میں، جہاں آپ بیٹھ کر فرقہ معتزلہ اور جہمیہ کا رد کرتے تھے لوگوں کا زبردست مجمع ہوتا تھا جس کی تعداد تقریباً تیس ہزار سے زیادہ ہوجاتی [6] محرم ۲۳۵ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ [7]

---

[1] طبقات الحفاظ ص ۹۲

[2] تہذیب التہذیب ۲ ۶

[3] شذرات الذہب ۲ ۸۵

[4] سیر اعلام النبلاء ۱۱ ۱۲۵

[5] شذرات الذہب ۲ ۸۵

[6] تاریخ بغداد ۱۰ ۶۸

[7] طبقات الحفاظ ص ۱۹۳

"أبوبكر بن أبي شيبة أحد الأعلام وأئمة الإسلام وصاحب المصنف الذي لم يصنف أحد مثله قبله ولا بعده "[1]

(ابوبکر بن ابی شیبہ مشاہیر و ائمۂ اسلام میں سے ایک ہیں اور ایک ایسی "مصنف" کے مرتب ہیں کہ اس جیسی کتاب کسی نے نہیں لکھی، نہ اس سے پہلے اور نہ ان کے بعد۔)

ابن ابی شیبہ سے مصنف کی روایت حافظ بقی بن مخلد قرطبی متوفی ۲۷۶ھ نے کی ہے۔ اور ان سے روایت کرنے والے شیخ صالح حسن بن سعد ابوعلی متوفی ۳۳۱ھ ہیں۔ بقول علامہ زاہد الکوثری مصنف ابن ابی شیبہ احکام سے متعلق حدیث کی کتابوں میں سب سے جامع کتاب ہے۔[2]

اس کتاب میں امام ابوبکر بن ابی شیبہ نے ایک باب "هذا ما خالف به أبو حنيفة الأثر الذي جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم" قائم کیا ہے، اس باب میں جیسا کہ عنوان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ۱۲۵ مقامات کی نشاندہی کر کے یہ دعویٰ کیا کہ ان جگہوں پر امام ابوحنیفہؒ نے احادیث و آثار سے ثابت ہونے والے مسائل سے ہٹ کر اپنی علیحدہ رائے قائم کی اور حدیث کو نظر انداز کیا۔ اس باب کا پہلا مسئلہ جہاں بقول ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہ نے الگ رائے قائم کی "رجم اليهود واليهودية" اور آخری مسئلہ "هل فيما دون خمسة أوسق صدقة؟" ہے۔

ابوبکر بن ابی شیبہ کے اس دعویٰ کے رد میں کئی لوگوں نے لکھا، ان میں قابل ذکر نام حافظ محمد بن یوسف صالحی شافعی، شیخ محی الدین قرشی، علامہ قاسم بن قطلوبغا

---

[1] البدایہ والنہایہ ۱۰ ۳۲۷ ابن کثیر
[2] النکت الطریفہ ص ۳ زاہد الکوثری

کی تحقیق وتعلیق کتاب کے شایانِ شان نہیں ہوئی تھی اور تحقیق سے تعلق رکھنے والا بہت سا کام کامل طور پر نہیں برتا گیا تھا۔ شیخ عبدالحفیظ ملک عبدالحق کی بمبئی کی مطبوعہ مصنف کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی تحقیق پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

"بدون تعليق او تحقيق جدير بشان مثل هذا المصنف العظيم"[1]

(اس عظیم مصنف کے شایانِ شان تعلیق یا تحقیق سے خیر)

بعض اہل علم دوست حضرات کی خواہش تھی کہ مولانا اعظمی اس کام کو انجام دیں۔ حسن اتفاق ہے کہ ۱۳۹۹ھ میں مولانا کا حرمین جانا ہوا، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے سامنے علامہ مفتی عاشق الٰہی برنی نے یہ تجویز رکھی اور درخواست کی کہ مصنف ابن ابی شیبہ کی تحقیق فرمائیں۔ مولانا اس عظیم کتاب کی خدمت سے انکار نہ کر سکے اور اس کام کو منظوری دیتے ہوئے پیرانہ سالی اور ضعف کے باوجود مصنف کی تحقیق کا بیڑا اٹھا لیا۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں

"فنهضت به على كبر سني وتراكم العوائق من الاسقام والاشغال لاسجاح المفتي محمد عاشق الهي البرني ثم المدني اصالة عن نفسه، ووكالة عن ملك عبد الحفيظ حفظهما الله"[2]

(مفتی محمد عاشق الٰہی برنی ثم مدنی کے اصالۃ اور ملک عبدالحفیظ حفظہما اللہ کے وکالۃ اصرار پر بڑی عمر، بیماریوں، مشغولیات اور تمام طرح کی رکاوٹوں کے باوجود میں نے اس کام کو اٹھا لیا۔)

---

۱ مصنف ابن ابی شیبہ ۱/۳

۲ ایضاً ص ۳۳

مولانا نے کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد سے مصنف ابن ابی شیبہ کا نسخہ حاصل کیا۔ کویت سے ایک نسخہ استاذ ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ نے مولانا کے پاس ارسال کیا، ملتان اور حیدرآباد سے شائع ہونے والے مطبوعہ نسخے بھی آپ کے سامنے تھے۔ ان چاروں نسخوں کی مدد سے تعلیق و تحقیق کا کام شروع کیا، ان مخطوطوں میں کتب خانہ سعیدیہ سے حاصل شدہ مخطوطہ کو بنیادی نسخہ قرار دیا، ابھی مولانا نے کتاب الصلوۃ تک کی ہی تحقیق کی تھی کہ اسی دوران میں پیر جھنڈو پاکستان کا نسخہ دستیاب ہوا، اس سے بھی انہوں نے استفادہ فرمایا۔

مصنف ابن ابی شیبہ کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے مندرجہ ذیل خدمات انجام دیں

کتابت وطباعت میں الفاظ کی تصحیح فرمائی اور مصنف کا ایک صحیح کامل نسخہ تیار کیا، اصل نسخہ میں اگر کوئی چیز چھوٹ گئی ہے تو دوسرے نسخوں کی مدد سے اس میں اضافہ کیا۔ اسی طرح سے دوسرے نسخوں میں بھی سقطات کی نشاندہی فرمائی۔

۲۔ احادیث کی تخریج کی اور کتب ستہ میں وہ احادیث جہاں آئی ہیں، ان کا حوالہ دیا۔

۳۔ غیر معروف راویان حدیث پر کلام کرتے ہوئے ان کے اسماء اور کنیت وغیرہ کو بھی ذکر کیا۔

۴۔ نامانوس اور مغلق الفاظ کی بھی تشریح و توضیح کی۔

۵۔ بعض علمی مباحث اور فقہی مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔

۶۔ مؤلفین کی فروگزاشتوں پر بھی تنبیہ فرمائی

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کا یہ کارنامہ مصنف عبدالرزاق کی ہی طرح عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مولانا نے اس کی پندرہ جلدوں پر تحقیق و تحشیہ کا کام انجام دیا، مگر افسوس کہ ابھی تک مکمل طور پر طباعت کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ ان کی حیات

سند مذکور ہے شاید وہی صحیح ہے، وہ سند یہ ہے (حدثنا وكيع عن ربيع قال كرهه ابن سيرين) چنانچہ یہاں ابراہیم کا ذکر کرنا ایک بھول ہے۔

۲۔ ج ۳ ص ۲۹۶ ح ۳۵۷۷۔ بخاری نے اس حدیث کو شعبہ عن محارب کے طریق سے ذکر کیا ہے، اور پھر کہا کہ سعید بن مسروق نے اس حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متابعت کی ہے، ابن حجر فرماتے ہیں کہ سعید بن مسروق کی متابعت کو ابوعوانہ نے موصولاً ذکر کیا ہے۔

مولانا الاعظمی فرماتے ہیں کہ اس موقع پر حافظ ابن حجر کو ذہول ہوگیا کہ مصنف (ابن ابی شیبہ) نے بھی اس حدیث کو موصولاً ذکر کیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ابن ابی شیبہ کا حوالہ ضرور دیتے کیونکہ وہ ابوعوانہ سے جلیل القدر اور بلند مرتبہ امام حدیث ہیں۔

۳۔ ج:۳ ص ۹۴ ح:۴۹۹۲۔ حدثنا عفان قال: أنا همام عن قتادة عن الحسن عن سمرة الخ.

مکتبہ سعیدیہ حیدرآباد کے نسخہ میں اسناد میں (عن سمرة) پہلے اور (عن الحسن) بعد میں تھا، یعنی قتادہ نے سمرہ سے اور سمرہ نے حسن سے روایت کی، گویا یہ ایک طرح کی تحریف تھی۔

مولانا اعظمی نے اسکی تصحیح کی (عن قتادة عن الحسن عن سمرة) پیر جھنڈو پاکستان کے نسخہ میں یہ سند صحیح مذکور تھی۔

حیاۃ الصحابہ

"حیاۃ الصحابہ" حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کی ایک بہت مقبول ومعروف تصنیف ہے، مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی نے اس کی تحقیق کی اور تعلیقات وغیرہ لکھی ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے بھی اس پر تحقیقی کام کئے ہیں۔ مولانا اعظمی نے حیاۃ الصحابہ میں جن تحقیقی امور کو انجام دیا ہے، مولانا محمد الیاس بارہ بنکوی ان کا تذکرہ یوں کرتے ہیں

"التعليقات القيمة للشيخ المحدث حبيب الرحمن الأعظمي وقد عنى الشيخ بتحقيق نصوصه والتعليق عليه وتبيين معنى غريبه والتحقيق بأسماء رجاله والتصحيح لألفاظه المصحفة، وقد قام بتحقيق جميع النصوص والتعليقات الأخرى على هذا الكتاب أيضاً، بإمعان النظر من أولها إلى آخرها حرفاً حرفاً، وقد تفضل ببذل جهوده الثمينة في هذا العمل لوجه الله تعالى مع كبر سنه وكثرة مشاغله جزاه الله أحسن الجزاء وأطال بقائه ونفع جميع الأمة بعلومه"۔

۔ حیاۃ الصحابہ ص ۸

(شیخ محدث جلیل حبیب الرحمٰن الاعظمی کی بیش قیمت تعلیقات: شیخ نے اس کے (حیاۃ الصحابہ کے) نصوص کی تحقیق کی، تعلیقات لکھیں، غریب الفاظ کے معانی بیان کیے، اس کے اسماء رجال کی تحقیق کی اور جن الفاظ میں تصحیف ہوگئی تھی ان کی تصحیح کی، اس کے تمام نصوص کی تحقیق کے ساتھ ساتھ اس کتاب پر دوسری تعلیقات کی بھی شروع سے آخر تک ایک ایک حرف کی دقت نظر کے ساتھ تحقیق کی ہے، یہ ان کی کرم فرمائی ہے کہ پیرانہ سالی اور کثرت مشاغل کے باوجود اللہ کی رضا کے لئے انہوں نے اس کام میں بے پناہ کوششیں صرف کیں۔ اللہ انہیں بہترین جزاء عطا فرمائے، ان کے سایہ کو باقی رکھے اور ان کے علوم سے تمام امت کو نفع پہونچائے۔)

اس کتاب پر مولانا اعظمی کی تعلیقات اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ مولانا کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ حیاۃ الصحابہ کا یہ ایڈیشن ملت پریس دودھ پورعلی گڑھ سے چھپ کر شائع ہوا۔

استدراکات

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی جب بھی کسی تحقیق، تصنیف، کتاب یا
کسی مضمون کا مطالعہ فرماتے تو دوران مطالعہ ان کا تحقیقی تجزیہ بھی کرتے چلتے، کتابوں
کے اوراق پر سرسری نگاہ ڈالنا ان کی عادت نہ تھی، جہاں بھی انہیں محقق یا مصنف کی
بات سے اتفاق نہیں ہوتا یا پھر کہیں تشریح و توضیح میں کوئی تشنگی رہ گئی ہو، تو مولانا وہیں
رک کر کتاب پر حاشیہ لکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی ذاتی کتابوں اور رسالوں پر ان
کی تحریریں کثرت سے دیکھنے کو ملتی ہیں، جن کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ محققین یا مؤلفین، جن کو مولانا کی تحقیقی صلاحیت کا
اندازہ بخوبی تھا، اپنی کتابیں نظر ثانی کے لئے مولانا کے پاس ارسال کرتے۔ مولانا
جہاں تصحیح کی ضرورت محسوس کرتے وہاں تصحیح کرا دیتے یا فروگزاشتوں کی نشاندہی
فرما دیتے۔ مولانا کے استدراکات کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا
ہے کہ نامور محققین نے ان استدراکات کو جگہ جگہ اپنی کتابوں میں تحسین اور شکریہ کے
الفاظ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قلمی مسودات میں محفوظ، کتابوں میں درج، کاغذوں میں بکھرے ہوئے یہ
جواہر پارے آہستہ آہستہ مجلہ "المآثر" کے واسطے سے ڈاکٹر مسعود احمد کی جمع و ترتیب
کے ساتھ منظر عام پر آئے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبد العزیز مطر کی تحقیق کے ساتھ قاہرہ
سے چھپنے والی ابو حفص عمر بن خلف بن مکی کی کتاب "تثقیف اللسان و تلقیح الجنان"،
تہذیب التہذیب ابن حجر مطبوعہ حیدر آباد، شرح ترمذی تحفۃ الاحوذی عبد الرحمٰن
مبارکپوری، "تعجیل المنفعۃ" حافظ ابن حجر مطبوعہ حیدر آباد، ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی تحقیق
کے ساتھ شائع ہونے والی امام بخاری کے استاذ ابو الحسن علی بن عبد اللہ بن جعفر کی

تصنیف "الاصل" شیخ ابوغدہ کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئے، اسی طرح علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب "الرفع والتکمیل"، شیخ مرتضیٰ زبیدی بلگرامی کی مشہور کتاب "تاج العروس من جواہر القاموس" مطبوعہ کویت، شیخ ابوغدہ کی تحقیق سے شائع ہوئے، ان علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی کتاب "الاجوبۃ الفاضلۃ للاسئلۃ العشرۃ الکاملۃ" جیسی اہم ترین تصنیفات وتالیفات پر جو اہل علم کے لئے مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا اعظمی نے استدراکات اور حاشیے تحریر کیے۔

مولانا کے ان استدراکات[1] کو جو شرح مسند احمد پر ہیں شہرت ودوام حاصل ہوئی۔ اسی طرح سے "الالبانی شذوذہ واخطاؤہ" جو مولانا کی ایک مستقل تصنیف ہے، شیخ البانی کی گرفت اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی وجہ سے کافی مقبول ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ استدراکات وحواشی اس قدر ہیں کہ ان کا احصاء واحاطہ اس محدود اقتباسات مقالہ میں ممکن نظر نہیں آتا، ان سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھنا مقالہ کے نقص کو مشیر ہوگا، اس لئے اب ہم کچھ کتابوں سے مولانا کے چند استدراکات کے نمونے پیش کرتے ہیں

شرح مسند امام احمد بن حنبل

حضرت امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ-۲۴۱ھ) ایسے جلیل القدر محدث فقیہ اور امام ہیں جنکی عظمت اور جلالت علمی کے سامنے دنیا سرنگوں ہے۔ آپ کی وہ حیثیت ہے کہ اگر اسلامی تاریخ میں آپ کے کارناموں کا تذکرہ جلی حروف میں نہ ہو تو سے

---

[1] استدرک علیہ القول اصلح خطاہ، او اکمل نقصہ، او ازال عنہ لبسا (المعجم الوسیط) یعنی استدراک کے معنی غلطی کی اصلاح، کمی کو پورا کرنے یا اشتباہ کے دور کرنے کے ہیں۔

ناکمل اور ناقابل اعتبار تصور کیا جائے گا۔ ان کی ایک اور کتاب آپ کی تصنیف [illegible] بھی ہے، جو مسانید میں سب سے مشہور اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔

امام احمد بن حنبل نے ۲۰۰ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں مسند کی تصنیف شروع کی تھی۔[1] مسند میں تیس ہزار احادیث ہیں، تقریباً ایک سو صحابہ کی روایات [illegible] ہیں۔[2] ابن اثیر کے بقول ترتیب اور حسن روایت میں مسند امام احمد بن حنبل کا مقابلہ نہیں ہے۔[3] امام احمد بن حنبل کو اپنی اس مسند کی جامعیت پر اس قدر اعتماد [illegible] آپ نے فرمایا کہ جب بھی مسلمانوں میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔[4]

مسند امام احمد بن حنبل پہلی مرتبہ ۱۳۱۳ھ میں مصر سے طبع ہو کر شائع ہوئی [illegible] ۱۳۶۵ھ میں دوسری بار اس کی طباعت مصر سے ہوئی۔ اب یہ کتاب عصر حاضر [illegible] زمانہ محدث شیخ احمد محمد شاکر کی تحقیق و تعلیق سے مزین تھی۔ شیخ نے مسند کی احادیث [illegible] تخریج، الفاظ کی توضیح اور رجال پر کلام کیا ہے۔ استفادہ کو مزید آسان بنانے کے لئے چودہ طرح کی فہرستیں علیحدہ علیحدہ مرتب کیں، ان میں ایک بخاری کے طرز پر ابواب کی ترتیب کے مطابق احادیث کی فہرست بھی ہے۔ اس طرح علامہ احمد محمد شاکر نے اپنی قابل قدر کوششوں سے حدیث کی عظیم خدمت انجام دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں قبر میں [illegible] دے۔ آمین۔

شیخ شاکر جب مسند احمد کی تحقیق میں مصروف تھے اور مسند کی [illegible] حدیث [illegible]

---

1 مسند احمد ۱/۲۰ (مطبوعہ بیروت)

2 طبقات شافعیہ ۲/۲۹

3 تدریب الراوی ص ۳۹

4 طبقات شافعیہ ۱/۲۸

5 اس کے چھ مصادر حیدرآباد سے نواب میر محبوب علی خاں نے [illegible] (ترجمان الاسلام [illegible])

جو ان پر بھی آ چکی تھیں، تو ان کے وفورِ علم نے انہیں ان کی اپنی ہی فروگذاشتوں پر متنبہ کیا اور ان کی اصلاح کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔ چنانچہ علامہ نے مسند کی تیسری جلد میں ''الاستدراک والتعقیب'' کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت پچھلی دو جلدوں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں ان کی اصلاح کی اور استدراکات لکھے

علامہ شاکر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان کی بلند ہمتی و عالی ظرفی نے انہیں مجبور کیا کہ پوری دنیا کو اپنی اس تحقیق و تعلیق میں نقص و کمی کی تلاش کی دعوت دیں۔ یہ دعوت خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں

''ثم إني أتوقع أن يعنى إخواني علماء الحديث في أقطار الأرض بأن يرسلوا إلي كل ما يجدون من ملاحظة أو استدراك أو تعقيب، أو بحث في أحاديث المسند''

(اطرافِ عالم کے علماء حدیث سے امید رکھتا ہوں کہ مسند کی احادیث کی تحقیق کے سلسلہ میں اگر کہیں کوئی استدراک، تعقیب یا بحث پائیں تو انہیں میرے پاس ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں گے۔)

دوسری جانب جب مولانا حبیب الرحمن اعظمی، جنہیں حدیث کی کتابوں کا شوق رہتا تھا، کو محدث شاکر کی تحقیق کردہ مسند کا علم ہوا تو مولانا نے اسے حاصل کر کے اپنے تحقیقی مزاج کے مطابق مطالعہ شروع کیا، جوں جوں مطالعہ کا سلسلہ جاری رہا ویسے ویسے شارح کی فروگذاشتیں مولانا کے سامنے ابھر کر آتے گئیں۔ مولانا نے ایک ڈائری بنائی اور اس میں ان استدراکات اور ملاحظات کو نوٹ کرنا شروع کیا۔ لیکن مولانا پس و پیش میں رہے کہ ان استدراکات کے بارے میں شیخ کو مطلع کریں کہ نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیخ برا مان جائیں۔ لیکن جب تیسری جلد میں شیخ احمد شاکر کی

۱ مسند احمد ۳/۲۶۵

دولت مستدرک پر نظر پڑی تو مولانا نے اسی وقت ان جمع کردہ مستدرکات کو مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ یہ مستدرکات شیخ کے پاس مصر بھیج دیے گئے۔

علامہ شاکر تک جب یہ استدراکات پہونچے تو گویا منہ مانگی مراد پوری ہو گئی۔ ان ملاحظات وغیرہ کو انہوں نے آنکھوں سے لگایا اور مسند احمد کی پندرہویں جلد میں انہیں شائع کر کے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ علم و تحقیق اور فضل میں عرب و عجم، ابیض و اسود اور قرب و بعد کی کوئی حیثیت نہیں، جو صاحب فضل ہے چاہے دنیا کے کسی گوشہ میں ہو، صاحب فضل ہی رہے گا۔ شیخ احمد محمد شاکر ان استدراکات کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں

"ثم جاءني كتاب من أخ عالم كريم، لم يكن لي شرف معرفته من قبل، وقد عرفت من كتابه فضله وعلمه وتحققه بالبحث الدقيق وكتابه هذا مؤرخ ٢٦ ذي القعدة سنة ١٣٧٥ وطواه على استدراكات وتعقبات دقيقة، من الجزء الأول الى الجزء الثامن وهذا الأخ العلامة هو الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي خادم الحديث وفاءً لموعدي وسروراً بما جاء في أبحاثه الدقيقة سقت نص كلامه في الاستدراك بالحرف الواحد"[1]

(پھر میرے پاس ایک معزز عالم کا خط آیا جن سے پہلے مجھے ان سے شرف تعارف حاصل نہ تھا، اور اب مجھے انکے خط سے انکے فضل، علم اور دقیق بحثوں میں انکی تحقیق کا اندازہ ہو گیا ہے۔ یہ خط مؤرخہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۷۵ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس خط میں مسند احمد کی جلد اول سے جلد ہشتم تک

---

1. مسند احمد ۵ ۲۵۲-۲۵

وطوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے مختصر ترین استدراکات پر ہی اکتفا کیا گیا۔ شیخ احمد محمد شاکر نے جگہ جگہ آپ کے نوٹ و ریمارکس کی "صواب"، "توجیہ جید"، "تحقیق جید"، "تحقیق بدیع ممتاز" وغیرہ کے الفاظ میں تحسین فرمائی۔

مولانا کے ان استدراکات نے علمی دنیا میں اور خاص طور پر اسلامی ممالک کے محدثین و محققین کے درمیان دھوم مچا دی تھی۔ یہ استدراکات آپ کا تعارف اور شناخت بن گئے تھے[1] وہی محدث جس نے احمد شاکر پر استدراکات لکھے تھے وہی ہندی عالم جس نے احمد شاکر کی گرفت کی تھی، وہی شخص جس نے مسند کی طباعت کے کئی برس بعد اس کی تحقیق میں فروگزاشتوں پر تنبیہ کی تھی ایسے تھے وہ تذکار جو اس دور میں مولانا اعظمی کی تعریف و تعارف میں اپنائے جاتے تھے۔

کچھ اسی طرح کے انداز میں شیخ ابو غدہ مولانا اعظمی کا تعارف کرتے ہیں

"العلامة الكبير المحقق المحدث مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، الذي عرفه علماء بلاد الشام ومصر والمغرب وغيرها من تحقيقاته واستدراكاته النادرة الغالية على العلامة الشيخ أحمد محمد شاكر رحمه الله تعالى في تحقيقه لكتاب "مسند أحمد"."

(علامہ کبیر، محقق، محدث، مولانا شیخ حبیب الرحمن اعظمی، جنہیں شام، مصر، مغرب وغیرہ ممالک کے علماء نے ان کی تحقیقات اور "مسند احمد" کی تحقیق میں علامہ شیخ احمد محمد شاکر پر ان کے قیمتی و نادر استدراکات کے حوالے سے جانا۔)

---

[1] مجمع علمی عربی جز ۴ ج ۳۸ ص ۶۸۸ (اکتوبر ۱۹۶۳ء)

تا ۔ تحقیق میں مولانا کی عقلی نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے ۔

۱۔ البانی اپنی کتاب ضعیفہ ۲/ ۱۶۲ میں "تصدق بأنوار من الأقط" میں انوار کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ "نور" کی جمع ہے جسکے معنی پھول کے ہیں۔

مولانا الاعظمی فرماتے ہیں: درست "بأثوار من الأقط" ہے۔ اثوار ثور کی جمع ہے، جسکے معنی پنیر کے ایک ٹکڑے کے ہیں، جیسا کہ نہایہ ۱/ ۱۲۳ میں ہے۔ چنانچہ حدیث کا مطلب ہوگا پنیر کے چند ٹکڑے صدقہ کرے۔

۲۔ البانی صحیحہ ۳/ ۱۸۸ میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "هذا تحقيق استفدناه من تحقيقات الأئمة" یعنی ہماری یہ تحقیق بڑے بڑے ائمہ کی تحقیق سے مستفاد ہے۔

مولانا الاعظمی ریمارک لگاتے ہیں کہ ایسا وہی کہہ سکتا ہے جس کا دائرہ علم محدود ہوگا، کیونکہ ان سے پہلے یہ تحقیق محدث الہند شیخ نیموی اپنی کتاب "التعلیق الحسن" میں پیش کر چکے ہیں۔ ابواب المیاہ حدیث وقوع الرجیع فی الماء ملاحظہ ہو۔

۳۔ البانی فرماتے ہیں کہ حدیث اگر "روي" یا "يروى" یا "يذكر" مجہول کے صیغے سے روایت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حدیث ان کے نزدیک ضعیف ہے۔

مولانا الاعظمی البانی کے اس قاعدہ کلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "وهذا زعم فاسد واعتقاد ظاهر البطلان" (یہ ایک غلط خیال ہے جس کی کوئی بنیاد بھی نہیں اور اس کو صحیح سمجھنا صراحتاً باطل ہے۔) کئی حدیثیں ایسی ہیں جن میں یہ مجہول کے صیغے استعمال ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حدیث صحیح اور قوی ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی شک و ریب نہیں۔ پھر مولانا نے شواہد پیش کیے۔

۔ ترمذی فرماتے ہیں: روي عن النبي ﷺ أنه قال: ويل للأعقاب الخ

۱ الالبانی شذوذہ واخطاؤہ ۱۰

منذری نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا کہ ترمذی نے حسن حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح البانی نے کہا ہے اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

۲۔ مولانا نے دوسری دلیل دی کہ ترمذی فرماتے ہیں "هذا اصح من حديث شريك، لأنه قد روي من غير وجه" یعنی یہ حدیث شریک کی حدیث سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ ایک سے زائد طریق سے مروی ہے۔[1]

ہم نے صرف دو دلیلوں کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا ہے ورنہ مولانا نے ۲۳ شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ محض مجہول کے تفرد سے کوئی حدیث ضعیف نہیں ہو جاتی ہے۔

۴۔ البانی صحیحہ ۳/۳۵ میں فرماتے ہیں کہ "وعلى ذلك فلا يجوز التسمي بعز الدين، ومحيي الدين، وناصر الدين" (اسی بناء پر عز الدین، محی الدین اور ناصر الدین نام رکھنا جائز نہیں ہے۔)

مولانا اعظمی نے البانی کی اس عبارت پر یہ ریمارک لگایا کہ وہ اپنا نام تو خود ناصر الدین ہی بتاتے ہیں، مجھ کو نہیں پتہ کہ انہوں نے اپنے لئے اس کو کیسے جائز سمجھا۔

۵۔ البانی صحیحہ ۳/۲۳ میں لکھتے ہیں "في عشرين ربيع الآخر"

مولانا اعظمی نے گرفت کی کہ یہ غلط ہے۔ درست "في عشري ربيع الآخر" یا "في العشرين من ربيع الآخر" ہے۔[2]

ہمیں چند مثالوں کے پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، ورنہ بات طویل ہو جائے گی۔ یہ کتاب پہلے ارشد سلفی کے نام سے طبع ہوئی تھی، مولانا نے یہ کتاب انہیں املا کرائی تھی۔ بعد میں کتاب کی استنادی خاطر لوگوں کے اصرار پر آپ نے اپنے نام کو ظاہر فرمایا۔ "البانی شذوذہ واخطاؤہ" پہلی دفعہ ہندوستان میں، پھر

---

[1] الالبانی شذوذہ واخطاؤہ ۱/۱۱

[2] ایضاً ۳/۲۴

بیروت میں اور تیسری دفعہ ۱۹۸۴ء میں "دار العروبہ للنشر والتوزیع" کویت سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ مولانا بدر الحسن قاسمی مقیم کویت کے ۲/۲/۱۹۸۵ء کے ایک مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں

"یہاں دار العروبہ للنشر والتوزیع نے 'الالبانی اخطاؤہ وشذوذہ' (کذا) کو بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا اور معرض الکتاب عربی میں بہت فروخت ہوئی۔"

الرفع والتکمیل

فقیہ امت حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (۱۲۶۴ھ ۱۳۰۴ھ) کی شخصیت ہند و بیرون ہند کی ایک بے مثال علمی شخصیت تھی۔ آپ نے مختصر سی زندگی میں گراں قدر تحقیقی و علمی کارنامے انجام دیے، فقہ و حدیث کے محقق وقت شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت فرنگی محلی کی ایک مشہور تصنیف "الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل" ہے علامہ شیخ ابوغدہ کی تحقیق، تخریج اور تعلیقات سے مزین یہ کتاب تین مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ اسکا پہلا ایڈیشن حلب سے ۱۳۸۳ھ م ۱۹۶۳ء اور دو ایڈیشن بیروت سے ۱۳۸۹ھ م ۱۹۶۸ء اور ۱۴۰۷ھ م ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئے۔

"الرفع والتکمیل" کے پہلے دو ایڈیشن پر بھی مولانا اعظمی کے استدراکات ہیں، جنکی تصحیح شیخ ابوغدہ نے تیسرے ایڈیشن میں کر لی تھی۔ استدراکات کی چند مثالیں تیسرے ایڈیشن کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہیں

۱۔ الرفع والتکمیل ص ۲۲۸ پر ایک عبارت ہے۔ "ومن ثم لم يقبل قول أبي حاتم في حق (موسى بن هلال العبدي)"

۱۔ حیات ص ۳۳

شیخ ابوغدہ نے "ابو حاتم" پر یہ حاشیہ تحریر فرمایا:

"وقع في الاصلين: (ومن ثم لم يقبل قول الدار قطني)، وهو خطأ نشأ عن سبق نظر من الطابع لاول مرة، ثم استمر في الطبعة الثانية، وصوابه ما أثبته، صوبه لي من الهند شيخنا العلامة المحدث الجليل الناقد حبيب الرحمن الأعظمي جزاه الله خيراً وقد جاء كما صوبته في "الجرح والتعديل" لابن ابي حاتم ۳/۱/ ۲۹۰"

(پہلے دو ایڈیشن میں "ومن ثم لم يقبل قول الدار قطني" (دار قطنی کا قول مقبول نہیں) ہے۔ یہ پہلی مرتبہ طابع کی سبقت نظر کے سبب ہوا، پھر یہی غلطی دوسرے ایڈیشن میں بھی باقی رہی، جانکہ صحیح وہ ہے جسے میں نے متن میں ذکر کیا ہے۔ یہ تصحیح ہندوستان سے ہمارے شیخ علامہ محدث جلیل ناقد حبیب الرحمن اعظمی نے کی۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ ابن ابی حاتم کی "الجرح والتعدیل" ۳/ ۱/ ۲۹۰ میں بھی یہی ہے جو انہوں نے تصحیح کی۔)

۳۔ "الرفع والتکمیل" ص ۳۵۰ پر ایک عبارت ہے "وقال في ترجمة احمد بن سعيد بن عقدة، الخ"

شیخ ابوغدہ اس پر حاشیہ لگا کر لکھتے ہیں:

"وقع في الاصلين: (احمد بن شعيب) وهو تحريف صوابه (احمد بن سعيد بن عقدة)، وترجمته في الميزان ۱/ ۱۳۶ وكنت غفلت عن هذا التحريف في الطبعة الاولى، فنبهني إليه مشكوراً من الهند شيخنا العلامة المحدث

لکبیر مولانا حبیب الرحمن الأعظمي فجزاه الله عني وعن العلم والسنة ورجالها خيراً"

(اصلین میں (احمد بن شعیب) ہے، یہ ایک تحریف ہے۔ صحیح (احمد بن سعید بن عقدہ) ہے۔ میزان ۱/۶۳ میں ان کا تذکرہ ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اس تحریف پر میری نگاہ نہیں گئی، ہندوستان کے ہمارے فاضل محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس جانب میری توجہ مبذول کرائی۔ ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ اللہ ان کو میری طرف سے، علم و فن کی طرف سے، حدیث اور رجال حدیث کی جانب سے جزائے خیر سے نوازے۔)

۳- امام بخاری کی اصطلاح "فیہ نظر" کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے امام بخاری کی کیا مراد ہوتی ہے؟ کبار محققین اس بابت مختلف رائے رکھتے ہیں۔ امام بخاری کی مراد حافظ ذہبی کے نزدیک متہم راوی اور حافظ عراقی کے نزدیک متروک الحدیث راوی ہے۔[1]

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی حافظ ذہبی اور حافظ عراقی کے اس موقف پر نقد کرتے ہیں، اور حیرت و استعجاب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں

"لا ينقضي عجبي حين أقرأ كلام العراقي والذهبي هذا أن البخاري لا يقول (فيه نظر) إلا فيمن يتهمه غالباً ثم أرى أئمة هذا الشأن لا يعبأون بهذا، فيوثقون من قال فيه البخاري (فيه نظر) أو يدخلونه في الصحيح"[2]

(عراقی اور ذہبی کے اس قول کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ امام بخاری

---

[1] الرفع والتکمیل ص ۳۸۸ اور ۳۰۳ ایڈیشن ۱۹۹۶ء

[2] ایضاً ص ۳۸۹

(فیہ نظر) کہہ کر اکثر متہم راوی ہی مراد لیتے ہیں، پھر میں محدثین کو دیکھتا ہوں کہ کسی کو ان پرواہ نہیں کرتے ہیں، چنانچہ جنکے بارے میں بخاری نے فیہ نظر کہا ہے وہ انکی توثیق کرتے ہیں یا انکو اپنی صحیح میں جگہ دیتے ہیں۔)

پھر ائمہ نے جہاں جہاں بخاری کے "فیہ نظر" کے ہوتے راوی کی توثیق کی ہے، یا اپنی صحیح میں ان کا ذکر کیا ہے، مولانا اعظمی نے ان کو بطور شواہد پیش کیا، نمونہ کے طور پر گیارہ شواہد پیش کیے جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ تمام بن نجیح بخاری نے ان کے بارے میں (فیہ نظر) کہا ہے، اور ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے، بزار نے ایک جگہ انہیں صالح الحدیث کہا، بخاری نے خود وقت رکوع حضرت عمر بن عبد العزیز کے رفع یدین کے سلسلہ میں ایک موقوف معلق ذکر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ بخاری کے یہاں خود وہ راوی متروک نہیں، ورنہ کیا بزار اور ترمذی کے یہاں۔

۲۔ ثعلبہ بن یزید حمانی بخاری نے ان کے بارے میں کہا (في حديثه نظر، لا يتابع في حديثه) نسائی نے کہا ثقہ ہیں، ابن عدی نے کہا کہ میں نے ان کی کوئی منکر حدیث نہیں دیکھی، حافظ ابن حجر کے بقول وہ صدوق شیعی ہیں۔

۳۔ جعدہ مخزومی بخاری نے ان کے بارے میں کہا (لا نعرف له إلا هذا الحديث، وفيه نظر) اور ترمذی نے ان سے روایت کی ہے حافظ ابن حجر نے ان کو مقبول کہا، ابن حجر ایسے ہی راوی کے بارے میں فرماتے ہیں جن سے چند حدیثیں مروی ہوں، بہر حال اس سے اس راوی کا متروک الحدیث ہونا ثابت نہ ہو سکا۔

۴۔ جمیع بن عمیر التیمی بخاری نے فرمایا (في احاديثه نظر) اور ابو حاتم نے کہا "محله الصدق"، "صالح الحديث" ساجی نے صدوق کہا، عجلی نے "تابعي ثقة" لکھا، ابن حجر فرماتے ہیں کہ "صدوق يخطئ، ويتشيع ورمي له

الاربعة" یعنی وہ صدوق ہیں، خطا کر جاتے ہیں، ان کے یہاں تشیع [illegible]، سنن اربعہ میں ان سے روایتیں لی گئی ہیں۔ ترمذی نے اپنی سنن میں مناقب ابی بکر صدیق کے ضمن میں ان کی حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

۵- حبیب بن سالم بخاری نے ان کے بارے میں کہا "فیه نظر" ابن عدی نے ان ہی کے بارے میں کہا "ليس في متون احاديثه حديث منكر، بل قد اضطرب في أسانيد ما يروى عنه" یعنی متون احادیث میں کوئی منکر حدیث نہیں ہے، بلکہ ان سے مروی روایت کی اسانید میں اضطراب ہے۔

آجری نے ابوداؤد سے نقل کیا کہ وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو "الثقات" میں ذکر کیا ہے، مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ ابن حجر نے کہا لا بأس به

۶- حشرج بن نباتہ بخاری نے ان کے بارے میں کہا "فیه نظر" اور یہ بھی کہا "ارجو" یعنی معلق التاریخ میں تعلیقا ہے کہ امام بخاری کا قول ہے "ارجو انه لا بأس به" ہے، اور تہذیب التہذیب میں ہے، قال البخاري في "تاريخه" "ارجو ان يكون صالحا"، ابوحاتم نے کہا لا بأس به

۷- رشدین بن داود الصنعانی بخاری نے کہا "فیه نظر"، لیکن یحییٰ بن معین نے ان کی توثیق کی اور فرمایا: "لا بأس به ثقة" دحیم نے کہا کہ وہ میرے نزدیک ثقہ ہیں، ابن حبان نے "الثقات" میں ذکر کیا ہے۔ نسائی نے ان سے روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے ان کے بارے میں کہا "صدوق له أوهام"

۸- سلیمان بن داؤد الخولانی بخاری نے کہا "فیه نظر" اور ابوزرعہ، ابوحاتم، عثمان بن سعید اور حفاظ کی ایک جماعت نے ان کی تعریف کی ہے، ابن حجر نے کہا "لا ريب في انه صدوق" ان کے صدوق ہونے میں کوئی شک نہیں۔

۹- مصعد بن ناجیہ بخاری نے کہا "فیہ نظر"۔ یہ صحابی ہیں، ابن حجر نے "تہذیب التہذیب" اور "الاصابۃ" میں ان کا ذکر کیا ہے۔

۱۰- حارث بن حبیب المدنی الانصاری بخاری نے کہا "فیہ نظر" سہیل بن ... نے ان سے روایت نقل کی ہے، ابن عدی نے لکھا "أرجو أنه لا بأس به" ابن حبان نے "الثقات" میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور ہیثمی نے مجمع الزوائد ۵: ۲۰ میں انکی توثیق کی ہے۔

۱۱- عبدالرحمن بن سلمان الرعینی بخاری نے کہا "فیہ نظر" ابن یونس نے ان کی توثیق کی، ابوحاتم نے کہا "ما رأيت من حديثه منكراً، وهو صالح الحديث" مجھے ان کی کوئی منکر حدیث نہیں ملی، وہ صالح الحدیث ہیں۔ "وله عند مسلم في مبيت ابن عباس عند ميمونة" (مسلم میں بھی ان کی ایک روایت ہے، حضرت میمونہ کے یہاں ابن عباس کے رات گزارنے کے سلسلہ میں) نسائی نے کہا ليس به بأس، جیسا کہ تہذیب التہذیب ۶: ۱۸۸ میں ہے۔ ابن حجر نے کہا لا بأس به، بخاری نے ان کو "الضعفاء" میں داخل کیا ہے، اس پر ابوحاتم نے "يحول من هناك" لکھا یعنی ان کو ضعفاء سے منتقل کیا جانا چاہئے۔

مولانا کی پیش کردہ مثالوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تائیدی شواہد و مثالیں آتی گئیں اور انہیں وہ بڑی روانی سے قلم بند کرتے چلے گئے۔ اس موقع پر تحقیق و نقد میں مولانا کے علم کی پختگی کے ساتھ ساتھ ان کے کامل تحفظ کا بھی مظاہرہ ہوتا ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنے موقف کے سلسلہ میں ان دلائل کے پیش کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ قول فیصل بھی سنایا

"الصواب عندي أن ما قاله العراقي ليس بمطرد ولا صحيح على إطلاقه، بل كثيراً ما يقوله البخاري ولا يوافقه

عليه الجهابذة وكثيرا ما يقوله ويريد به إسنادا خاصا وكثيرا ما يقوله ولا يعني الراوي، بل حديث الراوي"!

(ترمذی کے قول کی حیثیت کسی قاعدہ کلیہ کی نہیں ہے، اور نہ ہی یہ بات علی الاطلاق صحیح ہے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ترمذی نے جو بات کہی ہے دوسرے جہابذۂ فن اس کی موافقت نہیں کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسا کہہ کر ترمذی کوئی خاص سند مراد لیتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے راوی نہیں بلکہ راوی کی حدیث مراد ہوتی ہے۔)

شیخ ابو غدہ نے مولانا اعظمی کے اس مختصر نقد پر اس انداز میں داد تحسین دی

"وقد أيقظ حفظه الله وأمتع به إلى موضوع من العلم هام جدا، كان مأخوذا بالتسليم والمتابعة من العلماء، فجزاه الله تعالى خيرا عن السنة وعلومها"[2]

(مولانا نے اللہ ان کی حفاظت فرمائے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے، ایک بہت ہی اہم علمی مسئلے پر تنبیہ کی، جو علماء کے یہاں مسلم و متداول ہے۔ اللہ ان کو حدیث اور علوم حدیث کی جانب سے اس خدمت پر بہترین جزاء سے نوازے۔)

---

۱ دیکھئے کتاب الرفع والتکمیل ص ۳۸۸-۳۹۱ اور تو عرفی حول حدیث مصنفہ ناظر احمد تھانوی، تحقیق شیخ ابو غدہ ص ۲۵۳-۲۵۷ میں دیکھی جا سکتی ہے۔
۲ الرفع والتکمیل ص ۳۹۱ و تو عرفی حول حدیث ص ۲۵۷

تحفۃ الاحوذی

مشہور وجلیل القدر محدث امام ترمذی کے آفاق شہرت یافتہ مجموعہ حدیث "جامع ترمذی" کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں ایک شرح "تحفۃ الاحوذی" کے نام سے ہے۔ یہ شرح معروف عالم دین مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری نے لکھی۔ اس شرح کو ایک امتیازی حیثیت وخصوصیت حاصل ہے، ترمذی شریف کے حل میں اس کو ایک مرجع شمار کیا جاتا ہے۔

"تحفۃ الاحوذی" پر بھی مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے استدراکات کیے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں۔ تحفۃ الاحوذی پر مولانا اعظمی کے استدراکات ان کے اپنے نسخہ میں ہیں یہ نسخہ دہلی کا چھپا ہوا ہے۔ مولانا مسعود احمد اعظمی ان استدراکات کو "مجلہ المآثر" کے صفحات پر منتقل کر رہے ہیں۔ اب تک تحفۃ الاحوذی پر استدراکات کی ۹ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ ہم یہاں المآثر کے حوالہ سے ان میں سے چند استدراکات نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

۱- استدراک نمبر ۹ ص ۳۵ امام ترمذی فرماتے ہیں: "وقد روى زائدة بن قدامة وغير واحد عن خالد بن علقمة عن عبد خير" یعنی اس حدیث کو زائدہ بن قدامہ اور کئی لوگوں نے خالد بن علقمہ سے روایت کیا ہے۔

مولانا مبارکپوری لکھتے ہیں "اخرج حديث قدامة عن خالد بن علقمة" مولانا اعظمی نے (صح) کی علامت لگا کر حاشیہ لکھا ہے "زائدۃ بن قدامہ ہے"، یعنی اس حدیث کو روایت کرنے والے قدامہ نہیں بلکہ زائدہ ہیں۔ شارح نے غلطی سے زائدہ بن قدامہ کے بجائے قدامہ سمجھ لیا ہے۔

۲- استدراک نمبر ۱۲ ص ۸۱- باب الوضوء مما غيرت النار، امام ترمذی

جیسا کہ لکھتے ہیں "وفی الباب عن أم حبیبة وام سلمة"

مولانا مبارکپوری نے ام حبیبہ وراں کے علاوہ دیگر صحابہ کرام کی حدیث کی تخریج کی ہے کہ ان صحابی کی حدیث فلاں کتاب میں مذکور ہے لیکن حضرت ام سلمہ کی حدیث کے بارے میں خاموش ہیں۔ مولانا اعظمی حضرت ام حبیبہ کی حدیث جہاں ختم ہوتی ہے، وہاں یہ علامت ( ) لگا کر حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں "واما حدیث ام سلمة فاخرجه ابن ابی شیبة والطحاوی" یعنی ام سلمہ کی حدیث کی تخریج ابن ابی شیبہ اور امام طحاوی نے کی ہے۔

۲۔ استدراک نمبر ۳۔ ج ا ص ۱۸۳ عن ابی سعید قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا سمعتم النداء فقولوا مثل ما یقول المؤذن

یعنی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم لوگ اذان سنو تم بھی اسی طرح کہو جس طرح مؤذن کہتا ہے۔ امام ترمذی نے اس کو نقل کرکے لکھا "وفی الباب عن ابی رافع وابی هریرة وام حبیبة وعبد الله بن عمرو وعبد الله بن ربیعة الخ"

حضرت عبد اللہ بن ربیعہ کی حدیث کی بابت مولانا عبد الرحمن مبارکپوری نے لکھا "لم أقف علیه" (میں اس سے واقف نہیں)

مولانا اعظمی نے فرمایا "قلت حدیث عبد الله بن ربیعه اخرجه النسائی فی باب اذان الراعی من الصغری، وفی عمل الیوم واللیلة من الکبری" یعنی حضرت عبد اللہ بن ربیعہ کی اس حدیث کو امام نسائی نے سنن صغریٰ (مجتبیٰ) کے باب اذان الراعی میں اور سنن کبریٰ کے عمل الیوم واللیلة میں روایت کیا ہے۔

۳۔ استدراک نمبر ۵۲ ج ا ص ۲۴۳ پر یہ باب ہے "ما جاء فی الانصراف عن یمینه وعن یساره" یعنی (نماز کے بعد) دائیں اور بائیں رخ کرنے کے بارے

میں جو حدیث وارد ہوئی ہے اس کا باب۔ امام ترمذی نے حضرت سمرہ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضرت ﷺ ہماری امامت فرماتے تھے تو آپ دائیں اور بائیں طرف گھومتے تھے۔ اس حدیث کی تخریج کے بعد امام ترمذی نے لکھا "وفي الباب عن عبد الله بن مسعود وأنس وعبد الله بن عمرو وأبي هريرة" اس باب میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، انسؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور ابوہریرہؓ کی حدیثیں ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کی بابت مولانا مبارکپوری نے لکھا ہے "اما حديث أبي هريرة فلم أقف على من أخرجه" حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث مجھے علم نہیں ہوسکا کہ اس کی تخریج کس نے کی ہے

مولانا اعظمی نے حاشیہ میں لکھا "أخرجه هق في (ج ۲ ص ۲۹۵) وأخرجه عبد الرزاق في مصنفه" یعنی اس کی تخریج بیہقی نے سنن کبریٰ جلد ۲ ص ۲۹۵ پر کی ہے اور امام عبدالرزاق نے مصنف میں بھی روایت کیا ہے۔

۱۰۵۔ استدراک نمبر ۶۳ ج ۱ ص ۲۸۳ "باب في الصلوة إلى الراحلة" یعنی اس باب میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اونٹ یا اونٹنی کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی۔ نیز آپ ﷺ اپنی اونٹنی پر نماز پڑھتے تھے جس طرف وہ چلتی تھی۔

اس باب میں امام ترمذی نے کسی اور صحابی کی حدیث کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے، جہاں امام ترمذی کی عبارت ختم ہوتی ہے وہیں پر علامہ شاکر نے حاشیہ میں لکھا "وفي الباب عن عبادة أخرجه ابن أبي شيبة" یعنی اس باب میں عبادہ سے روایت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے۔

؎ مندرجہ بالا استدراکات الآثار ق ۰ ش ۴ ص ۳۶، ج ۱ ش ص ۱۰، ج ۲ ش ۱ ص ۱۹، ج ۲ ش ۴ ص ۵۲، ج ۲ ش ۳ ص ۵۵ سے ماخوذ ہیں۔

اسماء الرجال

اسلام کی پرشکوہ عمارت دو محکم بنیادوں پر قائم ہے، ایک قرآن مجید، دوسری حدیث شریف۔ حدیث نبوی کلام الٰہی کی تفسیر بھی ہے اور اس کے اجمال کی تفصیل بھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا بالکل اسی طرح اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ارشادات، عادات و اطوار اور آپ کی حیات سے متعلق ہر ایک چھوٹی بڑی بات کی حفاظت کا انتظام فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے اس شمع ہدایت کے لئے ایسے پروانے پیدا کئے کہ تاریخ عالم و تاریخ اقوام آج تک ایسے جاں نثاروں اور وفا شعاروں کی کوئی مثال پیش نہ کر سکی۔ حضور اکرم ﷺ کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے ایک ایک حرف کو سننے اور یاد رکھنے کے لئے جھپٹ پڑتے تھے۔ خود حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ جتنی باتیں آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنتا یاد رکھنے کے لئے ان کو قلمبند کر لیتا تھا، قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرماتے ہوں گے' اس لئے حدیث نہ لکھو، میں ان کے کہنے سے رک گیا اور آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ تم لکھو اور اپنے دہن مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عمرو کے اس بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے والی ایک ایک چیز کی حفاظت میں کس قدر اہتمام برتا گیا ہے، اس اثر سے اس گوشہ پر بھی واضح روشنی پڑتی ہے کہ عہد نبوی سے ہی

۱۔ نصرۃ الحدیث ص ۶ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

کتابت حدیث کا سلسلہ جاری تھا، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور رجال حدیث ہی نے پوری امانت و دیانت کے ساتھ احادیث رسول اور کلام نبی کی حفاظت اور نگہداشت کی، اور جب احادیث و آثار کے ذخیرے پوری دنیا میں بکھر گئے، مدون و مرتب شکل میں منظر عام پر آگئے تو پھر ان صحابہ، تابعین اور محدثین کے حالات زندگی بھی مرتب کئے گئے، جنہوں نے روایتیں نقل کی تھیں تاکہ ان کے حالات اور زندگی کے نقوش و خطوط سے ان کی صداقت و امانت اور دیانت خود بخود آشکار ہو جائے اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے کہ ان کی نقل کردہ روایات و آثار میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ رجال (رواۃ) پر اس قدر کتابیں تصنیف کی گئیں کہ اس موضوع نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی، یہ علم رجال کیا ہے؟ مشہور محدث و محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں

"وكان من أجلّ ما اهتموا به علم رجال الحديث، فدوّنوا فيه واستقصوا استقصاءً عجيباً، حتى يكاد يقال لم يفتهم من الرواة راوٍ ثقة كان أو ضعيفاً إلا ذكروه، بما وصل إليه علمهم. فأحسنوا وأجادوا، وتعبوا وأفادوا، فجاء من بعدهم فرأى كل من يمر به من الرواة مذكوراً مترجماً بما يكشف عن حاله جرحاً أو تعديلاً"[1]

(جن علوم کے ساتھ اہل علم حضرات نے بہت زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا، ان میں سے ایک علم رجال حدیث تھا، انہوں نے اس کو مدون کیا اور حیرت انگیز طور پر اس کا احاطہ کیا، حتی کہ کہا جانے لگا کہ جہاں تک ان کے

---

[1] لسان المیزان، ابن حجر عسقلانی، تحقیق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت لبنان ۲۰۰۲ء

علم کی رسائی تھی کوئی بھی راوی خواہ ثقہ ہو یا ضعیف ایسا نہیں ہے جس کا ذکر
انہوں نے نہ کیا ہو، ان حضرات نے بہترین کارنامے انجام دیے، خود
مشقت اٹھائی اور دوسروں کو فائدہ پہونچایا، چنانچہ ان کے بعد کے لوگوں
کے سامنے جو بھی راوی آیا انہوں نے اس کو کتابوں کے اندر اس قدر
مذکور اور متعارف پایا کہ جس سے اس راوی کے حالات کی بہ لحاظ جرح یا
تعدیل اطلاع مل جاتی ہے۔)

علم رجال الحدیث کے ذیل میں راویوں پر جرح و تعدیل کی جاتی ہے اور اس سے متعلق تمام چیزوں سے بحث کی جاتی ہے تاکہ کذاب، ضعیف، عادل اور ثقہ راویوں سے خود بخود چھٹ جائیں۔ اس علم کو معرض وجود میں لانے کا سہرا مسلمانوں کے سر جاتا ہے، اس سے پہلے اس فن کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ مشہور رومانی مستشرق اسپرنگر کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ سابقہ اور موجودہ اقوام عالم میں کسی قوم نے بھی علم اسماء رجال میں ایسے کارنامے انجام نہیں دیے جیسے کہ مسلمانوں نے پانچ لاکھ افراد کے حالات پر مشتمل اس اہم اور عظیم ترین علم کے سلسلہ میں انجام دیے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فن یا علم ہو جس کو نقد و جرح میں وہ مقام بلند حاصل ہو جو فن رجال کو حاصل ہے۔

حدیث سے متعلق تمام علوم و فنون پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی بڑی گہری نظر تھی لیکن ان علوم میں بھی علم رجال میں آپ کو اختصاص حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ حدیث کی تحقیق و تعلیق میں رواۃ و رجال کے بارے میں آپ کی تحریر و تحقیقات ایسے مقامات پر دیکھنے میں آتی ہیں، جہاں محشی جیسے محقق خاموش نظر آتے ہیں۔ رجال کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے میں مولانا کو خاص مہارت حاصل ہے۔

۱؎ الرسالۃ المحمدیہ ص ۴۴ بحوالہ علم رجال الحدیث ص ۱۸-۹، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۹ علامہ شبلی

رجال کی واقفیت کوئی آسان کام نہیں، اس فن میں ملکہ پیدا کرنے کے لئے نہ جانے کتنے علوم میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تاریخ، جغرافیائی حالات وغیرہ تمام موضوعات پر اس میدان کے شہسوار کی نظر رہتی ہے۔

اس فن میں مولانا الاعظمی کی آراء کو ان کے معاصر علماء حدیث بڑی اہمیت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، علم رجال میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی اندو پاک میں مولانا اعظمی سے بڑھ کر کسی کو نہیں مانتے، مولانا اکبرآبادی لکھتے ہیں کہ

"مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے بڑھ کر فن حدیث واسماء الرجال کا محقق و بصر میرے نزدیک آج ہندو پاک میں کوئی نہیں ہے۔"[۱]

اس علم میں مولانا الاعظمی کی حذاقت و مہارت کو دیکھتے ہوئے مولانا اعجاز احمد اعظمی مدیر مجلہ المآثر نے بھی کچھ اسی طرح کی رائے ظاہر کی ہے، لکھتے ہیں

"یہ مشکل ترین کام ہے، کیونکہ ایک نام ونسب کے متعدد راوی اسماء الرجال کی کتابوں میں ملتے ہیں، ان میں یہ متعین کرنا کہ یہ فلاں راوی ہے، بے حد مشکل ہے، مگر یہی مشکل حضرت محدث کبیر کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسان کر دی تھی۔"[۲]

چنانچہ اب ہم تعلیقات وحواشی میں سے رجال سے متعلق مولانا کی تحقیق و تنقید کے چند نمونے پیش کرتے ہیں، ویسے تو گزشتہ صفحات میں تعلیقات کے نمونوں میں رجال کے بارے میں مولانا کی آرا پیش کی گئی ہیں، لیکن اس فن میں مولانا کے اختصاص کی وجہ سے یہاں اس کی چند مثالیں مزید پیش کی جا رہی ہیں، تاکہ قاری کو خود بھی اندازہ ہو جائے۔

---

[۱] صدیق اکبر ص ۲۷ مولانا سعید احمد اکبرآبادی

[۲] المآثر خاص اشاعت ۲، ص ۴۰

۱۔مصنف عبد الرزاق ج ۱ ص ۳۹۶ ح ۱۵ میں "عبد الرزاق عن أبي بكر بن محمد بن أبي سبرة عن يحيى بن سعيد" ہے۔

مصنف کے اصل نسخہ میں اسناد اس طرح تھی "عبد الرزاق عن أبي بكر بن محمد بن أبي ميسرة"

مولانا اعظمی نے اس کی تصحیح کی اور متن میں 'أبي ميسرة' کے بجائے 'أبي سبرة' تحریر فرمایا۔ جب مولانا کو خزانہ کا نسخہ ملا تو ان کی اس تصحیح کی تائید ہوگئی یعنی اس میں 'أبي سبرة' ہی لکھا ہوا ملا۔ مولانا نے اس راوی کا مختصر تعارف بھی کرایا کہ یہ ابوبکر بن عبد اللہ بن محمد بن ابی سبرہ ہیں، تہذیب میں ان کا ذکر ہے، یہاں دادا کی جانب منسوب ہیں، یحییٰ بن سعید انصاری سے روایت کرتے ہیں اور ان سے عبد الرزاق روایت کرتے ہیں۔

۲۔مصنف عبد الرزاق ج ۲ ص ۱۲۳ ح ۲۷۵۱۔"عبد الرزاق عن عكرمة بن عمار قال: حدثني ضمضم بن جوس"

اصل نسخہ میں 'جوس' کے بجائے 'حويصم' رقم تھا۔

مولانا نے کہا کہ یہ غلط ہے صحیح 'جوس' ہے، چنانچہ متن میں 'جوس' ہی تحریر فرمایا اور حوالہ دیا کہ یہ ضمضم بن حارث بن جوس ہیں، تہذیب میں ان کا تذکرہ ہے۔

۳۔مسند حمیدی ج ۱ ص ۱۰۲ ح ۲۰۳"حدثنا الحميدي قال ثنا عبد العزيز ابن محمد الدراوردي قال أخبرني علقمة عن أمه الخ

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے مندرجہ بالا سند پر دو جگہ حاشیے لگائے ایک 'علقمة' پر دوسرا 'عن أمه' پر پہلے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک علقمہ سے مراد علقمہ بن ابی علقمہ المدنی قاضی مدینہ ہیں، ان کے والد کا نام بلال ہے۔

دوسرے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ جامع الاصول میں 'عن أمه' کے بجائے

'عن امه' ہے، لیکن میرے نزدیک درست 'عن امه' ہے۔ مولانا علقمہ کی والدہ کا تعارف پیش کرتے ہیں کہ ان کا نام مرجانہ ہے، حضرت عائشہ سے روایت کرتی ہیں اور ان سے ان کے صاحبزادے علقمہ روایت کرتے ہیں جیسا کہ تہذیب وغیرہ میں ہے۔

مولانا اعظمی نے یہ اور اس سے پہلے والی تعلیق اپنے وجدان کی شہادت پر لکھی تھی۔ اور پھر جب طحاوی میں دیکھا تو ویسا ہی پایا جیسا کہ لکھا تھا، کیونکہ طحاوی نے اس حدیث کو ابوالزناد کے طریق سے عن علقمة ابن ابی علقمة عن امه روایت کیا ہے۔

۴۔ مسند حمیدی ج ۲ ص ۳۹۷ ح ۸۹۶ حدثنا الحميدي قال ثنا سفيان قال ثنا مسعر عن ابن القبطية الخ.

اصل نسخہ میں 'ابي العطية' تھا، جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں 'ابن القبطية' تھا، مولانا کے مطابق اصل نسخہ میں تصحیف یعنی نقطوں کا ہیر پھیر یا لفظ میں کوئی تبدیلی ہوگئی ہے۔ صحیح 'ابن القبطية' ہے۔ اس راوی کا نام عبید اللہ ہے جیسا کہ مسلم میں ہے۔

۵۔ کشف الاستار ج ۱ ص ۲۹۵ ح ۶۲۷۔ قال البزار: لا نعلمه عن أبي هريرة وحذيفة إلا بهذا الإسناد، وأبو حازم المدني سلمة، وأبو حازم الأشجعي اسمه سيتل

مولانا اعظمی نے 'سیتل' پر حاشیہ لگایا کہ شاید یہاں کوئی چوک ہوگئی ہے، اس لئے کہ ابوحازم اشجعی کا نام سلمان ہے، وہ 'عـزة' کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اور رہی بات سیتل کی تو وہ ابوحازم مولیٰ بن عباس ہیں، اس پر خوب غور کر لینا چاہئے۔

۶۔ کشف الاستار ج ۳ ص ۷ ح ۲۱۱۔ حدثنا رُبيع بن سلمة، ثنا معمر بن المثنى أبو عبيدة إلخ

ہیثمی اس حدیث پر کلام کرتے ہیں کہ طبرانی نے اس حدیث کو اپنے شیخ ربیع بن سلمہ سے روایت کیا ہے، اور میں انہیں نہیں جانتا، اس حدیث کے بقیہ

رجال حدیث ثقہ ہیں۔ (۸ ۲۸)

مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ بزار نے بھی اس حدیث کی روایت ربیع بن سعد سے کی ہے لہذا یہ کوئی مجہول راوی نہیں ہے۔

۷۔المطالب العالیہ ج ۱ص ۲۳۸ ح ۸۲۰۔ابن ربیعة بن الحارث بن عبد المطلب قال ... الخ

نسخہ مجردہ میں 'ابو ربیعہ' تھا، اسی طرح مسندہ میں بھی 'عن ابی ربیعة' تھا۔ لیکن مولانا الاعظمی نے دونوں نسخوں میں ابو ربیعہ لکھے جانے کو غلط ٹھہرایا، کیونکہ جب ابو ربیعہ مشرف بہ اسلام ہی نہیں ہوئے تھے تو حدیث کیسے روایت کرتے، چنانچہ مولانا نے اس غلطی کی تصحیح کی اور متن میں 'ابن ربیعة' تحریر فرمایا۔

۸۔المطالب العالیہ ج ۳ص ۱۵۵ ح ۳۲۲۳ یزید بن ابی حبیب، ان ابا الخیر اخبرہ ان رجلا من جهينة الخ

جہینہ کا ایک شخص کون ہے؟ مولانا اعظمی نے حاشیہ میں اس کی وضاحت کی کہ 'رجلا من جهينة' سے مراد ابو عبدالرحمن الجہنی ہیں، جیسا کہ آئندہ حدیث میں ان کا ذکر آرہا ہے۔

۹۔مصنف ابن ابی شیبہ ج ۳ ص ۳۱۳ ح ۶۳۱۵۔حدثنا ابو بکر قال حدثنا ابن نمیر عن سفیان بن سعد الخ

حیدرآباد دکن کے نسخہ میں سند اس طرح تھی 'سعد بن سعيد' اور کتب خانہ پیر جھنڈو پاکستان کے نسخہ میں 'عن سعد بن سعيد' رقم تھا۔

مولانا اعظمی نے دونوں مخطوطوں میں رقم سند کو غلط قرار دیتے ہوئے اس کی صحیح سند یوں لکھی 'حدثنا ابن نمير عن سفيان بن سعيد'

۱۰۔تلخیص تواتم جامع الاصول ص ۲۹۶۔عبید الله بن عبد الله ... هو

أبو عبد الله عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود الهذلي ولد أخي
عبد الله بن مسعود الخ

مولانا اعظمی نے 'أخي' پر حاشیہ لگایا کہ ایک 'ولد' چھوٹ گیا ہے، یعنی صحیح عبارت یہ ہے 'ولد ولد أخي عبد الله' یعنی مسعود ہذلی عبداللہ بن مسعود کے بھائی کے بیٹے نہیں بلکہ پوتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شاید پہلا 'ولد' لکھنا رہ گیا۔

نصرۃ الحدیث

اس دور پرفتن میں بہت سے نت نئے فتنے وجود میں آئے، ان فتنوں میں ایک اہم فتنہ" انکار حدیث" کا ہے ہندوستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں اور انکے رفیق چراغ علی نے حدیث کی حجیت کا انکار کیا۔ انکے بعد نظریۂ انکار حدیث عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا، اس کے بعد اسلم جیراجپوری اور غلام احمد پرویز نے اس فتنہ کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے ایک منظم نظریہ اور مکتب فکر کی شکل دی۔

بیسویں صدی کی غالباً تیسری یا چوتھی دہائی کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے ایک رسالہ "میں منکر حدیث کیوں ہوا؟" تحریر فرمایا، اپنے نام کو پردۂ خفا میں رکھتے ہوئے انہوں نے خود کو "حق گو" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ جن وساوس اور شکوک کی بنیاد پر منکرین حدیث نے حدیث کا انکار کیا تھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ ان کو یہاں ذکر کیا جائے

۱۔ اقوال وافعال نبوی ﷺ کی پیروی کا خدا نے حکم ہی نہیں دیا۔

۲۔ اقوال وافعال نبوی ﷺ قابل پیروی تو ہیں لیکن وہ محفوظ نہیں ہیں اور ان کی نقل وحکایت کا کوئی اہتمام نہیں برتا گیا ہے۔

---

۱ درس ترمذی ۲۴۰ مولانا محمد تقی عثمانی مرتبہ مولانا رشید اشرف سیفی

۴- حدیث میں بہت سی باتیں خلاف عقل ہیں اور خلاف عقل باتیں قابل تسلیم نہیں۔!
"میں منکر حدیث کیوں ہوا؟" کے مصنف "حق" نے تاریخ کو مسخ
کرکے، قرآن وحدیث کے معانی ومفاہیم میں مغالطے پیدا کرکے حدیث کو غیر معتبر
ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کی نظروں سے بھی یہ رسالہ گزرا۔
مولانا محمد بہاء الحق قاسمی امرتسری نے مولانا سے مذکورہ بالا رسالے کے محققانہ جواب
کی فرمائش کی۔ مولانا نے اس کو قبول فرمایا اور قرآن وحدیث کے دقائق میں اور
اس فتنہ کے فوری سدِ باب کے پیش نظر دو ماہ کے اندر ہی اس رسالہ کا جواب لکھ کر
مولانا بہاء الحق قاسمی کے پاس ارسال فرمادیے۔۲

مولانا الاعظمی نے اس کتاب میں از اول تا آخر بہت ہی محققانہ، محدثانہ
اور مؤرخانہ بحث کی ہے۔ سب سے پہلے "قرآن کریم اور حدیث" کا عنوان قائم
کرکے حدیث کی حیثیت وحجیت پر قرآن کی روشنی میں کلام فرمایا۔ مولانا نے قرآن
مجید سے ۲۵ شواہد پیش کیے، ان شواہد میں دو قسم کی آیتوں کا ذکر کیا۔ پہلی قسم کی
آیتوں میں جس طرح خدا، ملائکہ، کتاب اللہ اور قیامت پر ایمان لانے کا حکم ہے،
اسی طرح رسول ﷺ پر ایمان، رسالت کا اعتقاد اور آپ کے مبعوث من جانب
اللہ ہونے پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، دوسری قسم کی آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے
کہ جس طرح احکام الٰہی کا ماننا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام قرآن میں ہیں،
بالکل اسی طرح رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت بھی لازم ہے اور احکام رسول اور
آپ کے فیصلوں کو ہی حدیث کہا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں باہمی ارتباط ایسا

---

۱ نصرۃ الحدیث ص ۲۷۔۹۔

۲ حیات ص ۸۳۔

ہے کہ انکار حدیث کا لازمی نتیجہ انکار قرآن ہوگا۔

مولانا اعظمی نے "منکر حدیث کے رسالہ مذکورہ پر تفصیلی تبصرہ" کا عنوان قائم کر کے "حق گو" کے رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی غلط بیانیوں، فتنہ انگیز شگوفوں اور حدیث پر ان کی طرف سے کئے جانے والے اعتراضات کا مدلل انداز سے پوری علمی قوت کے ساتھ رد کیا اور حق و ناحق کے درمیان ایک آہنی فصیل کھڑی کر دی۔ انہوں نے "حق گو" کے چہرے سے حق گوئی کا نقاب اتار کر ان کا اصل چہرہ امت مسلمہ کو دکھا دیا۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے قرآن و حدیث اور تاریخ سے حدیث کی حقانیت اور صداقت و امانت پر دلیلوں کے انبار لگا دیئے۔ ہر سچے پکے مسلمان کے لئے قرآن و حدیث کی شہادت ہی کافی ہے، ان کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں لیکن مولانا نے اس کا بھی التزام رکھا کہ تالستائی اور گبن کے حوالے سے دلائل دیئے جائیں۔

چنانچہ مشہور روسی فلسفی تالستائی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے چند حکیمانہ اقوال زریں کا ترجمہ روسی زبان میں شائع کیا ہے۔ اسی طرح مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے تاریخ زوال روم جلد ۵، باب ۵ میں لکھا ہے:

"ہر ایک بانی مذہب کی سیرت سے اس کے تحریری مکاشفات کی تکمیل ہوتی ہے، چنانچہ (حضرت) محمد ﷺ کی حدیثیں امر حق کی جامع تعلیم اور ان کے افعال مجسم نیکی کے نمونے ہیں۔"[1]

اگر کوئی چیز بقول معترض وجود میں ہی نہیں تو اس کا ترجمہ کیسا اور گبن نے اسے کیسے جامع نصیحت قرار دیا؟

---

۱ نصرۃ الحدیث ص ۴۳

مولانا اعظمی نے اس کتاب کا نام "نصرۃ الحدیث" رکھا۔ اس کتاب کے آخر میں مولانا نے مجلہ "اہل حدیث" کے ایڈیٹر مولانا ثناء اللہ صاحب کی بھی خبر لی ہے جن کے پریس میں "حق گو" کا رسالہ "میں منکر حدیث کیوں ہو؟" طبع ہوا۔ مولانا نے اسے "تعاون علی الاثم والعدوان" قرار دیا۔ مولانا الاعظمی مولانا ثناء اللہ صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ:

"'اہلحدیث' کہلانے کے لئے تو آپ ہیں، اور حدیثوں سے مدافعت کرنے کے لئے حنفی؟"[1]

"نصرۃ الحدیث" کا پہلا ایڈیشن ۱۳۵۳ھ م ۱۹۳۴ء میں برقی پریس امرتسر سے شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۶۱ھ م ۱۹۴۲ء میں معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہوا۔ لیکن اس دوسرے ایڈیشن میں مولانا محمد ایوب صاحب ناظم مدرسہ مفتاح العلوم کی خواہش پر مولانا الاعظمی نے ایک گرانقدر مقدمہ کا بھی اضافہ فرمایا، ۵۴ صفحات پر مشتمل اس مقدمہ کی حیثیت خود مستقل ایک کتاب کی ہے، حدیث سے متعلق جتنے بھی گوشے ہوسکتے تھے مولانا نے اس مقدمہ میں سب پر روشنی ڈالی ہے، حدیث کی حجیت پر یہ مقدمہ ہی کافی ہے اصل کتاب کی تو بات چھوڑیئے۔ نصرۃ الحدیث کا تیسرا ایڈیشن ۱۴۱۳ھ م ۱۹۹۲ء میں دار المآثر الاسلامیہ مئو سے شائع ہوا، اور چوتھا ایڈیشن ۱۴۲۳ھ م ۲۰۰۲ء میں مرکز تحقیقات سے شائع ہوا۔

نصرۃ الحدیث جب منظر عام پر آئی تو علماء اور پڑھے لکھے طبقہ نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور علم و تحقیق کے لئے اسے اپنی ضرورت سمجھا۔ ملک کے معروف علمی رسائل و مجلات میں اس پر ریویو لکھے گئے، جنہیں طوالت کے اندیشہ سے یہاں نقل کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں، ہم یہاں صرف دو شخصیات کے تاثرات نقل کرنے پر

---

[1] نصرۃ الحدیث ص ۲۱۸-۹

اکتفاء کرتے ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک مکتوب میں اس کتاب پر اظہار خیال فرماتے ہیں

"جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا۔"[1]

مشہور نقاد جناب ماہر القادری ماہنامہ "فاران" میں نصرۃ الحدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

" منکرین رسالت جو وسوسے مسلمانوں کے دل میں ڈال رہے ہیں، اور جو نکتے تراش رہے ہیں، اس کتاب نے نہ صرف اسکا ازالہ کیا ہے بلکہ اس قسم کے تمام شیطانی وساوس اور منافقانہ الزامات کی جڑیں کاٹ کر رکھدی ہیں اس کتاب کا ایک ایک ورق ایمان افروز ہے۔"[2]

نصرۃ الحدیث کی افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے، یہ عربی ترجمہ موسسہ علوم القرآن بیروت نے دیوحاث مدینہ منورہ اور منار النشر والتوزیع کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔

طبقات ابن سعد اور اعتراف حقیقت

محمد بن سعد کی کتاب طبقات ابن سعد سیر وتراجم کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔ جرمنی کے پروفیسر سخاؤ (Sachaw) نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ چونکہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور پروفیسر سخاؤ بھی ایک مستشرق

[1] نصرۃ الحدیث ص ۲۲۰

[2] فاران بحوالہ نصرۃ الحدیث ص ۲۲۰

محقق تھے۔ اس نے ان کے ذریعہ طبقات ابن سعد کی تحقیق بھی۔ مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری کے نزدیک دائرۂ شک سے باہر نہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے عدم اعتبار کا اظہار ان الفاظ میں کیا

"طبقات ابن سعد اب یورپ کے عیسائیوں نے اس کو چھپوایا ہے مگر اس کی کوئی سند ہے کہ یہ نسخہ اصل تصنیف کے موافق ہے۔"[1]

مزید ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"چونکہ یہ پوری کتاب ہمیں یورپ کے واسطہ سے ملی ہے، اس کے بھروسہ پر ابن سعد کا حوالہ بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی سند متداول کتابوں سے نہ مل جائے۔"[2]

کیا مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوری کا یہ شک صحیح ہے؟ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے مولانا اعظمی سے رابطہ قائم کیا اور صحیح صورت حال دریافت کی۔ اس سلسلہ میں مولانا اکبرآبادی خود تحریر فرماتے ہیں کہ

"مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی جو اس زمانہ کے نامور محقق اور محدث ہیں، میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس بارے میں استصواب کیا تو مولانا نے تحریر فرمایا پروفیسر سخاؤ پر یہ شبہ اور بدگمانی بالکل بیجا ہے، میں نے خود طبقات کے مطبوعہ نسخہ کا مقابلہ اس کے اصل مخطوطہ کے ساتھ حرفاً حرفاً کیا ہے اور کہیں میں نے دونوں میں عدم مطابقت نہیں پائی۔"[3]

۱۔ اصح السیر ص ۲۱ مولانا ابوالبرکات داناپوری

۲۔ ایضاً

۳۔ حسن ذوالنورین ص ۲۳ مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مقدمہ معارف الحدیث

مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ نے "معارف الحدیث" کے نام سے اردو خواں طبقہ کے لئے احادیث کا ایک انتخاب مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی جلدوں میں ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی لکھتے ہیں کہ

"ناچیز مؤلف نے اپنے علمی محسن اور استاذ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے استدعا کی، ممدوح نے اس کو قبول فرمایا اور یہ مقدمہ تحریر فرمایا۔"

مولانا نے اس مقدمہ میں حدیث کی حجیت اور دین میں اس کی بنیادی اہمیت سے بحث کی ہے۔ آجکل ایک طبقہ حدیث کی حجیت و سند کا سرے سے انکار کرنے پر مصر ہے۔ اس لئے مولانا نے مقدمہ میں اس پہلو کو خاص طور پر مدنظر رکھا اور ان کے باطل خیالات کی دلائل کی روشنی میں تردید کی۔

اس مقدمہ کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ یہ انگریزی ترجمہ "The Sunnah in Islam" کے نام سے U K Islamic Academy سے چھپ کر شائع ہوا۔

ا۔ معارف الحدیث مولانا محمد منظور نعمانی

مزید خدمت حدیث

مندرجہ بالا تحقیقات کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن پر باقاعدہ نہیں لیکن بعض مقامات پر محدث اعظمی کی تعلیقات موجود ہیں۔ ان کتابوں کی ایک فہرست حیات ابوالمآثر کے حوالے سے پیش خدمت ہے

۱۔التذییل العجیب علی نہایۃ الغریب	جلال الدین سیوطی	غیر مطبوع
۲۔مسند اسحاق بن راهويه	اسحاق بن راہویہ	غیر مطبوع
۳۔مسند الإمام ابي محمد الحارث بن ابي اسامة	حارث بن ابی اسامہ	غیر مطبوع
۴۔نزهة الألباب في الألقاب	ابن حجر عسقلانی	غیر مطبوع

۵۔حواشی بر مقدمہ ابن الصلاح

یہ حواشی شیخ عبدالشکور عبدالفتاح فدا کی طلب پر تحریر فرمائے تھے۔

۶۔جزء خطبات النبی ﷺ فی حجۃ الوداع

حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی تصنیف "حجۃ الوداع و عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم" جب چھپی تو اس میں حجۃ الوداع کا خطبہ شامل نہیں تھا۔ مولانا اعظمی نے حجۃ الوداع ملاحظہ فرمانے کے بعد "جزء خطبات النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حجۃ الوداع" کا اضافہ فرمایا۔ اس جزء خطبات کی طباعت مطبع ندوۃ العلماء لکھنؤ، مکتبہ دینیات رائے ونڈ پاکستان اور مجلس علمی گجرات سے ہو چکی ہے۔

۱۔فہرست تالیفات شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی ۲۸۱-۲۹۰ سید محمد شاہد سہارنپوری

اجازتِ حدیث حاصل کرنے والے مشاہیر عرب

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی ایک بلند پایہ محدث تھے علماء اور محدثین ان سے اجازت وسند حاصل کرنا اپنے لئے باعث عزت وشرف سمجھتے۔ اجازت وسند حاصل کرنے والوں کا یہ سلسلہ ہندوستان سے عرب تک پھیلا ہوا ہے۔ چونکہ مولانا سے اجازت حدیث حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جس کا شمار کار دارد ہے، اس لئے عرب ممالک کے جن علماء یا شخصیتوں نے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی سے اجازت حدیث حاصل کی، ان میں سے چند مشاہیر وممتاز ناموں کو پیش کرنے پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے

۱- الشیخ عبد الحلیم محمود شیخ الازہر — ۲- شیخ عبدالعزیز بن عیسیٰ (مصر)

۳- شیخ عبد اللہ سراج الحلبی — ۴- الشیخ نور الدین عتر (دمشق)

۵- الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ — ۶- شیخ حسن خالد مفتی الجمہوریۃ اللبنانیۃ

۷- الشیخ عبد الستار ابوغدہ (کویت) — ۸- الشیخ علوی المالکی (مکہ مکرمہ)

۹- شیخ مہدی الہاشمی — ۱۰- الشیخ محمد عوامہ

استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ — مجلس علمی، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ

۱- الشیخ حماد الانصاری — ۲- ڈاکٹر عبداللہ الجبوری

استاذ جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ — مکتب التربیۃ العربی لدول الخلیج ریاض

۱۳- الشیخ حمدی عبد المجید (بغداد) محقق معجم الکبیر للطبرانی — ۱۴- الدکتور بشار عواد معروف (بغداد)

۱۵- شیخ ابو الیسر عابدین

۱۶- الشیخ ایمن رشدی سوید (جدہ) — ۱۷- سید صبحی السامرائی (بغداد)

☆ ☆ ☆

فقہ

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی فقہی بصیرت اہل علم و فضل کے درمیان مسلم تھی، امت کے سامنے کوئی اہم دینی مسئلہ پیش آتا تو مولانا کی طرف رجوع کرنا ضروری سمجھا جاتا، خواہ وہ بیمہ کا مسئلہ ہو یا امارت شرعیہ سے متعلق بحث ہو۔

سہارنپور میں ۱۹۴۵ء میں جب جمعیۃ علماء ہند کا کل ہند سالانہ اجلاس ہوا، تو اس میں امارت شرعیہ کی بحث بھی چھڑی، ایک طرف جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ ہندوستان میں امارت شرعیہ کا قیام چاہتی تھی اور اس سلسلہ میں اس نے پوری تیاری بھی مکمل کر لی تھی، لیکن دوسری جانب علماء سہارنپور کو اس سے سخت اختلاف تھا، دونوں کو اپنے موقف پر اصرار تھا۔ اس جلسہ کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کر رہے تھے۔ جب مولانا مدنی نے یہ صورت حال دیکھی تو ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کو آئندہ کے لئے ملتوی کر دیا۔ اور متفقہ طور پر یہ تجویز پاس کرا لی کہ جب بھی مجلس عاملہ کے سامنے کوئی فقہی مسئلہ پیش ہو تو مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے استصواب کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ مولانا اعظمی اس اجلاس میں موجود بھی نہیں تھے۔[1]

۱۹۶۴ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے متفقہ طور پر ایک تحریر مرتب کی تھی، جس میں بیمہ کے جواز کا رجحان تھا۔ یہ تحریر مولانا اعظمی کے پاس تصویب کے لئے بھیجی گئی، مولانا نے اس تحریر کا تنقیدی جائزہ لیا اور جواز سے متعلق جو

---

[1] ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء، ص ٦

شواہد پیش کیے گئے تھے، انہیں ناقابل قبول قرار دیتے ہوئے یہ کوتاہ بتایا اور مختصر نوٹ کے ساتھ یہ تحریر واپس کردی۔ علماء اور مفتیان کرام نے مولانا کے اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور اپنے فیصلے سے رجوع کرلیا۔

مولانا اعظمی حنفی فقیہ تھے اپنے مسلک میں بہت پختہ اور غیر متزلزل تھے۔ مولانا کی فقہی بصیرت پر علماء وفقہاء کے اعتماد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوسکتی ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم کا منصب خالی ہوا اور اس منصب جلیل کے شایان شان مفتی جلیل کی تلاش شروع ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم کی نگاہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی پر جا لگی، مجلس نے آپ کے نام کی تجویز پاس کی اور یہ طے ہوا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحب مئو جائیں گے۔

چنانچہ مولانا مدنی اور قاری طیب صاحب مولانا اعظمی کے یہاں تشریف لے گئے اور مولانا کے سامنے اپنا مقصد سفر رکھا، لیکن مفتاح العلوم کے ارباب اہتمام اور مئو کے عوام کو اسکی بھنک لگ گئی اور وہ اس پر راضی نہ ہوئے کہ مولانا اعظمی اس سے جدا ہوں البتہ مولانا نے ان دونوں بزرگوں سے معذرت فرمالی۔[2]

اسیر ادروی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ

> "ہندوستان کی ان دو مایہ ناز شخصیتوں نے مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کے عظیم منصب کی پیشکش کر کے اس حقیقت کا اظہار فرمادیا کہ عہد حاضر میں مولانا اعظمی جیسا کوئی فقیہ اور صاحب بصیرت ہندوستان کی

---

[1] الماثر ج ۳ ش ۲ بحوالہ سیرت اور اسکا شرعی حکم ص ۹، ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۵

[2] محدث اعظمی نمبر ص ۱۶۰، ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۸-۹، حیات ابو المآثر ص ۱۹۹ - ۲۰۳، دارالعلوم حبیب نمبر ص ۵۴ - ۱۵۵، زندگی کا علمی سفر ص ۴۳

مرز میں پر نہیں ہے۔(۱)

آئندہ صفحات میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی فقہی خدمات پیش کی جارہی ہیں۔

الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ

طلقات ثلاث کے وقوع کا مسئلہ فقہی مباحث میں ایک اہم اختلافی مسئلہ ہے۔ یعنی کوئی شخص اگر ایک مجلس میں تین طلاقیں دے تو وہ تین کی تینوں واقع ہوجائیں گی یا ایک؟ اہل حدیث (غیر مقلدین) کا مسلک یہ ہے کہ ایک طلاق واقع ہوگی۔ لیکن احناف بلکہ جمہور ائمہ تین طلاق کے وقوع کے قائل ہیں۔ بڑے ادب کے ساتھ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ موجودہ دور میں یہ مسئلہ طلاق اختلافی سے نزاعی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اہلحدیث حضرات نے اس مسئلہ پر خوب دعوت بحث دی، اور مناظرے کی مجالس گرم کیں۔ ضرورت تھی کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس مسئلہ کی صاف ستھری شکل پیش کی جائے' تاکہ حلال وحرام کی حد بندی ہوسکے اور امت ابتلاء وآزمائش سے محفوظ رہ سکے۔

غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ بنارس میں ایک حنفی المسلک نے اپنی زوجہ کو تین طلاقیں دیں، اسکے بعد حنفی عالم سے اس بابت مسئلہ دریافت کیا، حنفی عالم نے جواب دیا کہ رجعت جائز نہیں، پھر اہلحدیث عالم کے پاس گیا اور ان سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ رجعت جائز ہے، چنانچہ اس نے رجعت کرلی۔ ان عالم صاحب نے باقاعدہ اہلحدیث مفتی کا فتوی بھی پیش کیا۔ بنارس کے حنفی حضرات نے اس فتوے کو مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے پاس بھیجا اور نفس مسئلہ

۱۔ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۹

حقیقت حال دریافت کی۔

مولانا الاعظمی نے نفس مسئلہ کی تحقیق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پیش کی جو ہمارے سامنے "الاعلام المرفوعۃ فی حکم الطلقات المجموعۃ" کے عنوان سے موجود ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں تین ابواب قائم کئے ہیں، پہلے باب میں یہ ثابت کیا کہ یک مجلس میں تین طلاقیں خواہ وہ یک ہی لفظ سے ہوں یا متعدد الفاظ سے واقع ہو جاتی ہیں اور رجعت شرعاً ممکن نہیں۔

مولانا الاعظمی نے آٹھ حدیثیں پیش کیں جنکی رو سے یک مجلس تین طلاقیں دینے پر تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔ مولانا ان احادیث پر ہونے والی جرح کا دفعیہ بھی کرتے چلتے ہیں، اور حدیث کی قوت وصحت پر مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس باب میں ائمہ اربعہ، امام اوزاعی، امام ثوری، امام اسحق، امام بخاری بلکہ جمہور صحابہ، تابعین وجمہور ائمہ سلف وخلف کا اس مسئلہ پر اجماع ثابت کیا ہے۔ مولانا کی پیش کردہ حدیثوں میں سے ایک حدیث درج کی جاتی ہے۔

امام شافعی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور دار قطنی وغیرہ نے حضرت رکانہؓ سے روایت کیا ہے

"انہ طلق امرأتہ البتۃ فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ما أردت قال واحدۃ قال آللہ قال آللہ قال ھو علی ما اردت"

یعنی حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو لفظ "بتۃ" کے ساتھ طلاق دی اسکے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور نے دریافت فرمایا کہ اس لفظ سے تم نے کیا ارادہ کیا انہوں نے کہا ایک طلاق کا آپ نے کہا بخدا؟ انہوں نے کہا بخدا آپ نے فرمایا کہ جو تم نے ارادہ کیا وہی ہے۔ اس حدیث کے دوسرے طریق میں

ہے کہ آپ نے ان سے تین بار قسم لی۔

اس حدیث کو پیش کرنے کے بعد مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ

"رکانہ سے بار بار قسم دے کر یہ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اللہ ما اردت الا واحدۃ خدا کی قسم کھا کر کہو کہ ایک کے سوا اور کچھ ارادہ نہیں کیا ہے یہ سوال تو جب ہی درست ہو سکتا ہے جب ایک کا ارادہ کرنے سے ایک اور تین کا ارادہ کرنے سے تین واقع ہوں اور اگر دونوں صورتوں میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہو تو ایک اور تین میں سے ایک کی تعیین کرنا بے معنی بات ہوگی وحاشا جناب ﷺ عن ذلک۔"[1]

ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حافظ ابن حجر، ابن معین اور انکے علاوہ اور بھی کئی ائمہ جرح و تعدیل نے مندرجہ بالا حدیث کی تحسین و تصحیح اور اسکے رواۃ کی توثیق کی ہے۔ مولانا اعظمی نے ان ائمہ کی تصریحات کو نقل کیا ہے۔

دوسرے باب میں جو لوگ ایک مجلس میں تین طلاق کو رجعی قرار دیتے ہیں، مولانا نے انکے دلائل کا جائزہ لیا اور غیر مقلدین کی طرف سے پیش کی جانے والی حدیثوں کی اس مفہوم پر کلام کرتے ہوئے انہیں ناقابل استدلال ثابت کیا۔ مولانا نے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، یہ بحث اختصار کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

اہلحدیث حضرات جن دو حدیثوں کی بنیاد پر ایک مجلس کی تین طلاقوں کو رجعی قرار دیتے ہیں وہ یہ ہیں

پہلی حدیث ابوالصہباء نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی کے ابتدا میں تین طلاق ایک تھی، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا

---

[1] الاعلام المرفوعہ ص ۱۸

کہ ہاں لیکن جب لوگوں نے بکثرت طلاق دینا شروع کی تو حضرت عمرؓ نے تینوں کو
نافذ کر دیا۔ (مسلم شریف)

مولانا اعظمی کے بقول یہ حدیث ناقابل استدلال ہے کیونکہ۔

۱- یہ روایت وہم وغلط ہے، چنانچہ محدث ابن عبدالبر نے فرمایا "ھذہ الروایۃ وھم وغلط" یعنی یہ روایت وہم وغلط ہے۔ (الجوہر النقی ص ۱۱۳)

۲- یہ روایت شاذ و منکر ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبل اور بیہقی کے مطابق ابن عباسؓ کے جملہ شاگرد اسکے خلاف روایت کرتے ہیں۔ (نیل الاوطار ۶، ۵۷، علام الموقعین ۲/۲۶، فتح الباری ص ۲۹۱)

۳- علامہ ابن العربی مالکی نے کہا کہ اس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔ پس وہ اجماع پر کیسے ترجیح پا سکتی ہے۔ (فتح الباری ۹ ۲۹۱)

۴- امام شافعی و نووی کے مطابق یہ حکم منسوخ ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۹۱)

۵- اس روایت کا مدار طاؤس پر ہے اور انکی نسبت علامہ ابو جعفر بن النحاس نے "الناسخ والمنسوخ" میں لکھا ہے کہ طاؤس اگرچہ مرد صالح ہیں مگر ابن عباسؓ سے انکی روایتیں منکر و نامقبول ہیں۔

۶- روایت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے خود اسکا جواب دے دیا ہے کہ کبھی کسی وجہ سے ایسا ہوتا تھا لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کے خلاف پر اجماع ہو گیا۔

۷- علامہ قرطبی کے مطابق یہ روایت مضطرب ہے۔ (فتح الباری ۹/۲۹۲)

۸- قابل توجہ ہے کہ طاؤس نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے اور خود ابن عباسؓ نے اسکے خلاف فتوے دیے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ یہ روایت یا تو کسی راوی کا وہم ہے یا پھر منسوخ ہے۔ اس

حدیث پر کلام کرتے ہوئے اخیر میں مولانا لکھتے ہیں کہ یہ وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے تینوں کو نافذ کیا اور اسکا اعلان فرمایا تو کسی صحابی نے نہ ٹوکا، کسی نے مخالفت نہ کی کسی نے بتایا کہ یہ عہد نبوی و عہد صدیقی کے خلاف ہے۔

دوسری حدیث حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر بہت پچھتائے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ تم نے کتنی طلاق دی ہے، انہوں نے کہا تین۔ آپ نے پوچھا کہ ایک ہی مجلس میں؟ کہا ہاں" آپ نے فرمایا کہ وہ ایک ہی ہے اگر تمہارا جی چاہے تو رجعت کر لو۔

مندرجہ بالا حدیث کے بارے میں مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ

"کسی محدث نے مسند احمد والی حدیث کی تصحیح یا تحسین نہیں کی ہے بلکہ محدثین نے اسکو حد درجہ کمزور بتایا ہے۔"

مولانا کے اس دعوے کی دلیل ملاحظہ ہو

۱۔ حافظ ابن حجر نے "تلخیص" میں اس حدیث کو ذکر کر کے فرمایا **وھو معلول** ایضاً" یعنی مسند احمد والی حدیث بھی بہت مجروح ضعیف ہے۔ (ص ۳۱۹)

۲۔ حافظ ذہبی نے بھی اس کو داؤد بن الحصین کے مناکیر میں شمار کیا

۳۔ رجال اسناد میں محمد بن اسحٰق ہیں، حافظ ذہبی نے انکے بارے میں محدثین کی سخت ترین جرحیں نقل کر کے اپنا فیصلہ لکھا کہ انکے حافظہ میں کچھ خرابی ضرور ہے اور جس چیز کے روایت کرنے میں وہ تنہا ہوں وہ منکر ہے۔

حضرت رکانہؓ کے واقعۂ طلاق میں دو روایتیں ہیں ایک وہ جسکو حضرت رکانہؓ نے خود روایت کیا۔ جس میں یہ صراحت ہے کہ انہوں نے لفظ "البتہ" کے ذریعہ طلاق دی۔

مولانا اعظمی نے اس حدیث کو اپنے موقف کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے جس میں ذکر ہے کہ

حضرت رکانہؓ نے تین طلاقیں دیں۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ دونوں روایتوں میں کون کامل طور پر صحیح اور قابل ترجیح ہے حضرت رکانہؓ کی حدیث یا روایت ابن عباسؓ؟

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے حضرت رکانہؓ کی "البتہ" والی روایت کی ترجیح کے سلسلہ میں ائمہ وحفاظ حدیث کی آراء نقل کی ہیں، ان میں سے صرف دو پیش خدمت ہیں

١۔ امام ترمذی یا امام بخاری نے فرمایا کہ **اصحها أنه طلقها البتة وأن الثلاث ذكرت فيه على المعنى** " یعنی صحیح تر بات یہ کہ رکانہؓ نے لفظ "بتۃ" سے طلاق دی اور تین کا ذکر روایت بالمعنی ہے۔ ابن القیم نے زاد المعاد اور مولانا شمس الحق صاحب اہلحدیث نے تعلیق مغنی میں ذکر کیا ہے۔

٢۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں مسند احمد کی یہ حدیث ذکر کر کے ابوداؤد کا کلام نقل کیا اور اسکی تائید کی۔ انکے الفاظ یہ ہیں "ان اباداؤد رجح ان رکانة انما طلق امراته البتة كما اخرجه هو من طريق ال بيته وهو تعليل قوي" یعنی ابوداؤد نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اسکے سوا کوئی اور بات نہیں کہ رکانہؓ نے اپنی بیوی کو لفظ "بتۃ" سے طلاق دی جیسا کہ انہوں نے خود رکانہؓ کے اہل بیت سے روایت کی ہے اور یہ قوی تعلیل ہے۔ (فتح الباری ج ٩ ص ٢٩)۔

باب سوم میں اہل حدیث حضرات کی غلط بیانیوں کی نشاندہی فرمائی محقق عصر کے اس قول پر کہ حضرت علیؓ وابن مسعودؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، زبیرؓ و جابرؓ اور دیگر بڑے بڑے صحابہ ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی کہتے تھے، مولانا اعظمی کہتے ہیں کہ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ایسی صریح غلط بیانی کی جرأت لوگوں کو کیونکر ہوئی، جبکہ فریق مخالف کے امام متبوع علامہ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان

١۔ الاعلام المرفوعہ ص ۳۳-۳۰

(ص ۱۷۹) میں صاف طور پر لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے سوا اور کسی صحابی سے اس قول کی نقل صحیح ہم کو معلوم نہیں۔

مولانا نے اسی باب میں اس پر بھی بحث کی کہ حضرت عمرؓ کا امضائے ثلاث یعنی تین طلاقوں کا نافذ کرنا ان کی اپنی ذاتی رائے کی بنا پر نہ تھا ورنہ ہی وہ سیاسی تعزیری حکم تھا بلکہ سارے صحابہ اس کے ساتھ تھے، سبھی کی تائید اور موافقت تھی۔ آگے چل کر مولانا نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب روایت پر کلام کرکے اسے غیر معتبر ثابت کیا اور اسکے خلاف حضرت ابن عباسؓ کا فتویٰ نقل فرمایا۔ مولانا نے آثار صحابہ بھی نقل کئے اور ان کی روشنی میں تین طلاق کے وقوع کو ہی صحیح قرار دیا۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا اعظمی نے وقوع طلاق کے سلسلہ میں صحابہ کے مزید فتاویٰ و آثار جمع کئے تھے، گرچہ اس مسودہ کی تبییض مولانا کی حیات میں ہی ہوگئی تھی لیکن شاید کچھ مصالح کے پیش نظر اگلی اشاعت اعلام مرفوعہ کے ساتھ نہ ہوئی تھی۔ جدید ایڈیشن میں ادارہ نے اس اہم تکمیلی مواد کو بھی ملحق کرکے شائع کیا۔ نیز کتاب کے آخر میں تابعین کے فتاویٰ پیش کیے گئے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کی اس کتاب کو دیکھ کر اس کے اختصار، اور زیر بحث مسئلہ سے متعلق تمام گوشوں سے واقفیت اور ان پر مضبوط گرفت، فریق مخالف کے دلائل کی کمزوریوں سے باخبری وغیرہ تمام چیزوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سب سے اہم اور قابل داد بات تو یہ ہے کہ اتنے اہم اور مشکل مسئلہ کو اور اس زبان میں اتنی سہولت سے بیان کیا گیا ہے کہ قاری کے سامنے مسئلہ کی پوری نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

"اعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ" کو دیوبند کے علماء و فن نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ مسلم شریف کے درس کے دوران جب حضرت عبداللہ

۱۔ اعلام مرفوعہ ص ۴۱

بن عباسؓ کی وہ حدیث تھی جس کو اہل حدیث حضرات بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ طلب سے فرماتے

"اس حدیث کی بہترین توضیح وتشریح کے لئے مولوی حبیب الرحمٰن اعظمی کی اعلام مرفوعہ دیکھو، اس سے بہتر توضیح کسی نے نہیں کی، یا یہ فرمایا کہ اس سے بہتر توضیح میں بھی نہیں کر سکتا۔"[1]

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کتاب کی توصیف میں فرماتے ہیں کہ

"اردو خواں حضرات کے لئے آسانی ہوگی کہ اس مسئلہ پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا رسالہ "الاعلام المرفوعہ فی حکم الطلقات المجموعہ" ملاحظہ فرمائیں جو اس موضوع پر سلجھا ہوا اور پر مغز رسالہ ہے۔"[2]

دیوبند سے شائع ہونے والا ایک قدیم علمی رسالہ "قاسم العلوم" اعلام مرفوعہ پر تبصرہ کرتا ہے

"مولانا موصوف نے جن کی علمی ومذہبی کاوشوں نے بہت سے مسائل کو حل کیا ہے اس مسئلہ پر احادیث وآثار صحیحہ سے بدلائل قویہ کلام کرکے اوسکو واضح وبرہن کردیا ہے۔"[3]

اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، یہ رسالہ مجلہ "اعدل" گوجرانوالہ ۱۹۳۳ء کے چار شماروں میں بھی قسط وار شائع ہوا، اسکا تیسرا ایڈیشن جو راقم الحروف کے پیش نظر ہے ۱۹۹۹ء میں دارالمآثر الاسلامیہ مئو سے شائع ہوا۔

---

[1] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۸۳، حیات ص ۵۳۹

[2] تاریخ دعوت وعزیمت ۲ ص ۵۲، مطبوعہ معارف اعظم گڈھ طبع اول ۱۹۵۷ء۔ بعد کے ایڈیشن میں یہ اقتباس محذوف ہے۔

[3] قاسم العلوم ج ۲ ش ۳ ص ۳۹

الازہار المربوعۃ فی رد الآثار المتبوعۃ

اعلام مرفوعہ جب منظر عام پر آئی تو مئو اور بنارس کے اہلحدیث علماء کے باہمی اشتراک (Collaboration) سے اسکا جواب دیا گیا۔ مسلم اہلحدیث گزٹ میں 'اعلام' کے رد میں لکھا گیا۔ مولانا عبداللہ شائق نے "الآثار المتبوعۃ والاحکام المشروعۃ لرد لاعلام المرفوعۃ" کے نام سے یک مفصل کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں انہوں نے محدث عصر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے موقف کا رد فرمایا اور بڑے پرزور انداز سے مجلس واحد میں دی گئی تین طلاقوں کو حکماً ایک طلاق مانتے ہوئے رجعت کو جائز ٹھہرایا۔

اہلحدیث عالم نے اپنے موقف کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا اور مولانا اعظمی کا رد کیا۔ اہلحدیث عالم نے "اعلام مرفوعہ" کے جواب "آثار متبوعہ" میں سخت انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ مؤلف آثار اپنی کتاب کی ابتداء ہی میں صفحہ تین پر تحریر فرماتے ہیں

> "ہر شخص کو اپنے مسائل کی چھان بنان (کذا) اور اسکی اشاعت کا حق ہے لیکن یہ اسی وقت تک محمود ہے جب تک مسائلہ (کذا) مسئلہ کی صورت میں رہے اور اگر اس سے مقصود نام ونمود اور ہنگامہ آرائی ہو تو یہی فعل انتہائی مذموم ہو جاتا ہے۔ مؤلف نے اسی دوسری صورت کو اختیار کر کے بلا وجہ فتنۂ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے۔"

اسی صفحہ میں آگے مؤلف آثار مزید لکھتے ہیں:

> "اپنے ہمنواؤں سے وہ دل آزار، شر انگیز نوٹ لکھوایا گیا کہ انسانیت کبریٰ لرزہ براندام ہو گئی۔"[۱]

۱۔ الآثار المتبوعۃ ص ۳ بحوالہ الازہار المربوعۃ حصہ اول ص ۸

۱۲ رصفر ۱۳۵۲ھ کو عبد اللہ شاکق نے اپنی کتاب "آثار متبوعہ" کی ایک کاپی مؤلف اعلام مرفوعہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے پاس ارسال کی۔ مولانا نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اسکا جواب لکھنا شروع کیا، چھ ماہ میں مولانا کا جوابی رسالہ تیار ہو گیا۔ مولانا نے اسکو "ازہار المربوعہ فی رد آثار المتبوعہ" کے نام سے موسوم کیا۔

یہ رسالہ تین اجزاء میں منقسم ہے۔ باب اول میں وقوع ثلاث مجموعہ کے دلائل پر مجیب کے اعتراضات کا جواب ہے، باب دوم میں اعلام مرفوعہ کے دوسرے باب جس میں غیر مقلدین کے دلائل پر بحث کی گئی ہے، کے متعلق مجیب کے اعتراضات و اشکالات کا مفصل جواب ہے، باب سوم میں آثار متبوعہ کے تیسرے باب کا جواب ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی تمہید میں لکھتے ہیں کہ:

۱- چونکہ صاحب آثار نے بزعم خویش ہم کو ہمارے مسلمات سے جواب دینے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم نے بھی اسکا التزام کیا ہے۔

۲- بہت سے جوابات بنابر مسلمات مجیب صرف الزاماً ہیں انکا جواب دیا جائے تو ذرا سوچ سمجھ کر۔

۳- مجیب نے جن مباحث کو لیا ہے میں نے بھی انہیں پر اقتصار کیا ہے۔[۱]

"ازہار المربوعہ" میں مولانا پہلے "اعلام" کی عبارت پیش کرتے ہیں، پھر اس کے بعد اس پر مؤلف آثار کے اشکالات نقل کرتے ہیں اور پھر جواب دیتے ہیں۔ اعلام مرفوعہ پر ہونے والے ایک ایک اعتراض کا مولانا نے جواب دیا اور حنفی نقطۂ نظر کو روایت و درایت کے مطابق قرار دیا۔

"ازہار المربوعہ" میں احادیث و آثار پر بحث کی گئی اور فقہی نقطۂ نظر سے بھی

۱؎ الازہار المربوعہ ص ۲

سے شکایات کے جواب دیے گئے۔ اسکے ساتھ ساتھ الزامی اور منطقی جواب کا بھی
اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ کہیں کہیں ہم مناظرانہ لب ولہجہ کی جھلک بھی پاتے ہیں۔
عبداللہ شائق نے "آثار متبوعہ" میں سخت انداز تحریر اختیار کیا تھا جیسا کہ پہلے عرض کیا
جاچکا ہے۔ اور یہ کتاب "ازہار مربوعہ" اسکے جواب میں ہے، اس لئے مولانا کے
بھی انداز نگارش میں کہیں کہیں تلخی کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ مولانا اعظمی نے بڑی
صاف گوئی سے اسکا اعتراف کرتے ہوئے اظہار افسوس بھی کیا ہے، لکھتے ہیں کہ

> "مجھے افسوس ہے کہ بعض بعض مقامات میں "تلخ نوائی" کا اثر بھی آپ
> پائیں (کذا) گے، مگر آثار متبوعہ کو سامنے رکھنے کے بعد آپ خود بخود
> مجھے معذور تصور فرمائیں گے۔"[1]

تین طلاقوں کے ایک وقت وقوع کے مسئلہ پر "ازہار مربوعہ" ایک تحقیقی،
تنقیدی اور جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کی حیثیت تحقیقی تو اس طریقے سے ہے کہ
طلاق ثلاث مجموعہ کے موضوع پر جتنے دلائل ہو سکتے تھے ان کی پوری جانچ پرکھ کے بعد
یہ رسالہ لکھا گیا۔ اور تنقیدی بایں طور کہ ان دلائل پر ہونے والے اعتراضات یا ایک
مجلس تین طلاقوں کے ایک طلاق مراد لینے میں فریق مخالف کی طرف سے پیش کئے
جانے والے دلائل وشواہد کا اس کتاب میں تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا اور پھر اصل نقطہ نظر کو
حدیث و درایت کے قریب پایا گیا۔

یہ کتاب حجم کے بڑے ہونے کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم ہے، اسکا پہلا
حصہ ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے، حصہ اول وکٹوریہ سٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوا اور دوسرا
حصہ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔

"ازہار مربوعہ" پر علامہ سید سلیمان ندوی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر

---

[1] ازہار المربوعہ ص ۲

فرماتے ہیں

''اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیت سابق شیخ ازہر بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ ''البحث فی التطبیقات الشرعیۃ'' لکھا ہے۔''[1]

احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اہل بہ لغیر اللہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ واتباعہ اجمعین

چونکہ نذر لغیر اللہ کے مسئلہ میں بعض اشخاص نے بہت الجھاؤ پیدا کردیا ہے اس لئے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات از راہ کرم ایسی وضاحت سے ارشاد فرمایئے کہ الجھن دور ہو جائے۔

(۱) ما اہل بہ لغیر اللہ کی صحیح تفسیر کیا ہے؟ (۲) اولیاء کرام کے نام پر نذروں کا کیا حکم ہے؟

یہ ہیں وہ سوالات جن کے جواب میں رسالہ ''احکام النذر لاولیاء اللہ وتفسیر ما اہل بہ لغیر اللہ'' معرض وجود میں آیا جس کے مصنف مولانا حبیب الرحمن اعظمی ہیں۔ اس کتابچہ میں مندرجہ ذیل مباحث ہیں

۱۔ ما اہل بہ لغیر اللہ کی مدلل تفسیر وتشریح۔

۲۔ اولیاء اللہ کے نام پر مروجہ نذروں کے احکام شرعی کا بیان۔

۳۔ بدعت نواز مصنفین کے موقف کا مدلل رد۔

مضامین اور عنوانات کے لحاظ سے اس رسالہ کی حیثیت سہ رخی ہے۔ تفسیر، فقہ اور مناظرہ۔ چونکہ نذور اولیاء اللہ کی حمایت میں لکھنے والے مولانا سید محمد عبدی

[1] معارف ج ۳۹ عدد ۵ ص ۳۹۶

پنجاب کی کتاب "ارشاد الحق" کا اس رسالہ میں جواب دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں کہیں کہیں مناظرانہ اسلوب نگارش اور طرز ادا بھی اپنایا گیا، اس سے بعض تذکرہ نگاروں نے اس رسالہ کو مناظرہ کی شق میں رکھا ہے۔ لیکن ہم اس کتاب کا تعارف "فقہ" کے ضمن میں پیش کرتے ہیں، کیونکہ مولانا اعظمی کا فقہی رنگ اس کتاب میں غالب نظر آتا ہے۔

مولانا نے "ما اہل بہ لغیر اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ

"جملہ مفسرین نے ما اہل بہ لغیر اللہ کے حرام ہونے کی علت تقرب غیر خدا سمجھی ہے اور اس فقرے کا مؤدیٰ سب کے نزدیک یہ ہے کہ جس جانور کے خون بہانے سے غیر خدا کے ساتھ تقرب کا قصد کیا گیا ہو۔"[1]

مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں کئی شواہد پیش کئے، یہاں پر ان میں سے صرف دو کو نقل کیا جاتا ہے

(۱) ابن کثیر، خطیب شربینی، صاحب روح البیان اور فخر الدین رازی وغیرہم نے اس آیت کی تفسیر کے تحت ذکر کیا کہ کوئی مسلمان بقصد تقرب غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ جزئیہ اس مقام پر اسی وقت چسپاں ہو سکتا ہے، جب ما اہل بہ لغیر اللہ کی یہی مراد ہو کہ جو تقرب غیر خدا کے لئے ذبح کیا گیا ہو۔

(۲) علامہ شیخ زادہ نے حاشیہ بیضاوی میں لکھا کہ وما اہل بہ لغیر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ جو صنم وطاغوت کے لئے ذبح کیا گیا ہو۔ اور اسی سے متصل مزید لکھتے ہیں کہ جو مسلمان بہ نیت تقرب غیر خدا کوئی جانور ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور اس کا ذبیحہ مردار کے حکم میں ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے مولانا اعظمی کا موقف یہ ہے کہ مخلوق کے واسطے نذر ماننا

۱۔ ما اہل بہ لغیر اللہ (الفرقان بریلی شوال و ذیقعدہ ۵۹ھ ص ۸۲)

جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے جائز نہیں ہے۔ بزرگان و اولیاء کے نام کی نذریں انکے تقرب و تعظیم کے مقصد سے مانی جاتی ہیں تو ان کی حرمت میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مولانا نے شامی، درمختار، بحر الرائق عالمگیری سے عبارتیں اور اقتباسات پیش کر کے اپنے موقف و دلائل کو ثابت کیا ہے۔ اور بالآخر اسی نتیجہ پر پہونچے کہ جو جانور بقصد تقرب غیر خدا ذبح کیا جائے چاہے ذبح کے وقت خدا ہی کا نام کیوں نہ لیا جائے وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے۔

مولانا نے نذر اولیاء کو جائز قرار دینے والے "ارشاد الحق" کے مصنف کی تضاد بیانی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اسکی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید "صراط مستقیم" میں اولیاء کے بارے میں عوام کے عقائد کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ

"بعض لوگ خدا کو اور بزرگوں کو تقرب و رضا جوئی کے برابر مرتبہ میں رکھتے ہیں بعض لوگ بزرگوں کی رضا جوئی مقدم رکھتے ہیں اور بعض ان کو مستقل و جہت روا جان کر خدا سے التجا کرنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"[1]

سید امیر علوی نے "ارشاد الحق" صفحہ ۴ میں مولانا اسمٰعیل شہید کی اس تحریر کو مسلمانوں کے ساتھ بدگمانی و بدظنی قرار دیا۔ اس پر مولانا اعظمی نے "ارشاد الحق" صفحہ ۷ کی ایک عبارت پیش کی جس میں واضح طور پر مولانا سید امیر علوی نے خود اقرار کیا ہے کہ بعض لوگ بزرگوں کو مستقل بالذات، خدا کا ساجھی اور معبود حقیقی بھی سمجھتے ہیں۔ مولانا اعظمی 'ارشاد الحق' سے یہ عبارت "بے شبہ بعض جاہل اس قسم سے نذر مانتے ہیں۔"[2] نقل کر کے سید امیر علوی کے پہلے بیان کی تردید کی

---

[1] صراط مستقیم ص ۵۷ بحوالہ الفرقان شوال و ذوالقعدہ ۱۳۵۹ھ ص ۸۰
[2] ارشاد الحق ص ۵ بحوالہ احکام النذر لاولیاء اللہ (الفرقان شوال و ذوالقعدہ ۱۳۵۹ھ ص ۸۹)

انہیں کی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔

یہاں مولانا نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ حضرت شہید اور سید امیر علوی کی عبارتوں کے مفہوم باوجود یکہ ایک ہیں لیکن صرف اس لئے کہ یہ صحیح بات حضرت شہید کے قلم سے نکلی اس لئے اہل بدعت کو قبول نہیں، ورنہ سے بدگمانی قرار دیا گیا۔ مولانا نے سید میر علوی کی ایسی کئی متضاد بیانوں کو نقل کیا ہے کہ ایک جگہ جس چیز کا انکار کرتے ہیں خود دوسری جگہ اسی کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا الاعظمی نے نذر اولیاء سے متعلق اہل بدعت کے دلیل حوالوں کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔

مولانا نے اس رسالہ میں نذر اولیاء کے اقسام اور اسکی شکلوں کو ذکر کیا، اسی کے ساتھ ساتھ اشیاء نذر کا بھی حکم بیان فرمایا اور نذر سے متعلق مستند حوالوں سے متفرق مسائل بھی جمع کئے ہیں۔ اور ان بدعت نواز مصنفین پر سخت تنقید کی ہے جو نذر اولیاء کے سلسلہ میں صاف اور پاکیزہ موقف نہیں اختیار کرتے اور مغالطے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اس رسالہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ "نذر اولیاء" کے سلسلہ میں مستند فقہی مراجع در مختار، شامی، بحر الرائق اور عالمگیری کے فتاوی اور تفسیر میں علامہ قونوی، ابن کثیر، علامہ شیخ زادہ، صاحب روح البیان اور فخر الدین رازی کی تفاسیر کو سامنے رکھکر بہت مدلل انداز میں اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ نذر سے متعلق تمام جزئیوں کو اس پندرہ صفحے کے مختصر رسالہ میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا اعظمی نے اس مسئلہ کی پیچیدگیوں اور گتھیوں کو بڑے سیقہ سے سلجھایا ہے اور اسکی ایک صاف ستھری شکل ناظرین یا قارئین کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ رسالہ مجلہ الفرقان بریلی بابت ماہ شوال ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ میں شائع ہوا۔

رکعات تراویح

رکعات تراویح کی تعداد تقریباً ڈیڑھ دو سو برس سے امت مسلمہ کے درمیان اختلافی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ حنفیہ نیز مذاہب ثلثہ اور دیگر مذاہب متبعین بیس رکعت تراویح کے قائل ہیں۔ ایک طبقہ جسے اہل حدیث یا غیر مقلد کہتے ہیں رکعات تراویح کو آٹھ تک محدود رکھنے پر مصر ہے، دونوں جانب سے پی ایچ ڈی تحقیقات پیش کی گئیں۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا، اور ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ انکے مطابق ساڑھے بارہ سو برس تک تمام مسلمانان اہل سنت بیس رکعت ہی کو سنت اور قابل عمل سمجھتے رہے۔ ساڑھے بارہ سو برس کے بعد فرقہ اہل حدیث نے یہ جدید انکشاف کیا۔ مولانا نے اس رسالہ میں احادیث و آثار، تعامل صحابہ اور تاریخ سے، خود شہادت سے ثابت کیا کہ تراویح کی رکعات بیس ہیں۔

اپنے موقف کے سلسلہ میں صحابہ، تابعین، اور ائمہ کے عمل کا ذکر کیا کہ مکہ معظمہ میں حضرت عطا بن رباح کے زمانہ تک بیس پر عمل تھا، نافع بن عمر کے بیان کے مطابق ابن ابی ملیکہ ہم کو رمضان میں بیس رکعات پڑھاتے تھے۔ امام شافعی کے بموجب بیس پر عمل تھا، عبداللہ بن مسعود بھی بیس ہی پڑھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ ائمہ اربعہ، مالک، شافعی، اور امام احمد رحمہم اللہ کی کتب فقہیہ میں سے کسی میں بھی آٹھ کا ثبوت نہیں ملتا" ان ائمہ کے علاوہ سفیان ثوری اور داؤد ظاہری کے یہاں بھی آٹھ پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بیس پر ہی عمل ہوا۔ مولانا بڑے وثوق کے ساتھ باندازِ تحدی فرماتے ہیں کہ

"آٹھ پر عمل در آمد کی تصریح کہیں بھی نہیں دکھائی جا سکتی اور اس کا گھٹیے۔

ضعیف ثبوت بھی پیش نہیں کیا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ سائب بن یزید کا وہ اثر پیش کیا جا سکتا ہے جس میں مذکور ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔[1]

اس کے بعد مولانا اعظمی سائب بن یزید کے اس اثر میں داخلی شہادات کی بنیاد پر اضطراب ثابت کر کے اس اثر کو ناقابل ثبوت قرار دیتے ہیں۔ مولانا اعظمی نے "بیس رکعت پر اجماع کی بحث" کا عنوان قائم کر کے عہد فاروقی میں بیس پر اجماع کے ثبوت کو مولانا عبدالرحمن مبارکپوری کے باطل قرار دینے پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔

مولانا اعظمی نے اس اجماع کو دلائل سے ثابت کیا اور ائمہ کے اقوال نقل کیے، مثلاً حافظ ابن عبدالبر مالکی جو اہل حدیث کے یہاں بڑے محقق مانے جاتے ہیں، نے بھی بیس پر عمل کا ذکر کیا ہے، امام نووی شافعی نے لکھا "ثم استقر الأمر على عشرين فإنه المتوارث" (پھر بیس پر عمل قرار پایا، اس لیے کہ وہی سلف سے خلف تک برابر چلا آرہا ہے۔) ابن قدامہ حنبلی نے مغنی میں لکھا "وهذا كالإجماع" (یہ مثل اجماع کے ہے) ابن حجر مکی شافعی نے لکھا "ولكن أجمعت الصحابة على أن التراويح عشرون ركعة" یعنی صحابہ نے اجماع کیا ہے کہ تراویح کی بیس رکعتیں ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ کو بھی یہ تسلیم ہے کہ "وهو الذي يعمل به أكثر المسلمين" (اسی پر اکثر مسلمانوں کا عمل ہے۔)[2]

پھر آخر میں مولانا نے "خاتمہ" کا عنوان قائم کر کے اپنی تحقیق کی روشنی میں ثابت ہونے والے مسائل کو نمبروار شمار کیا ہے۔

---

۱ رکعات تراویح ص ۲-۷

۲ ایضاً ص ۹۲

۱۔ عہد فاروقی سے لے کر اب سے کچھ پہلے تک، اس پوری مدت میں اگر بعض افرا
دی بیس سے کم کے قائل بھی ہوئے تو اس پر کسی مسجد میں عمل ہونے کا ثبوت نہیں
۲۔ حضرت عمرؓ کے حکم یا انکی رضا مندی سے بیس رکعات کا ثبوت ایسا پختہ ہے کہ
مصنف کو انکار کی گنجائش نہیں۔
۳۔ آنحضرت ﷺ کی طرف بیس رکعت پڑھنے کی نسبت بے اصل نہیں ہے۔ نواب
صدیق حسن خاں صاحب کی تحقیق میں حدیث صحیح سے ثابت ہے کہ آپ رمضان میں
آٹھ رکعتوں سے زیادہ پڑھتے تھے۔
۴۔ بیس کی روایت پر اہلحدیث حضرات جو جرح و قدح کرتے ہیں اصول حدیث بلکہ
انکے مسلمات کے رو سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔

احناف کی طرف سے اردو زبان میں رکعات تراویح میں اس جیسی تحقیقی
کتاب جس میں محدثانہ وفقیہانہ دونوں بحثیں ہوں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ
کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اسکے کئی ایڈیشن نکل چکے پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں
معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہوا، اسکا تیسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں "المجمع
العلمی" مئو سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ہی راقم الحروف کے پیش نظر ہے، اس میں
"ضمیمہ رکعات تراویح" بھی ہے، یہ ضمیمہ دراصل اہلحدیث کی جانب سے رکعات
تراویح پر کیے گئے اعتراضات کا جواب ہے۔ یہ جواب مولانا عبد الجبار کی قاسمی کے
نام سے شائع ہوا تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی ایک مکتوب میں اس کتاب
پر اظہار خیال فرماتے ہیں کہ

"میں نے رسالہ مذکورہ کو ابتدا سے آخیر تک مطالعہ کیا ہے، حضرت مؤلف
ممدوح کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں،
جنھوں نے ان مدعیوں کے خرمن ہائے تزویر پر صواعق محرقہ برسا کر

نیست و نابود کر دیا ہے۔"[۱]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی برہان میں رکعات تراویح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"نفس موضوع پر جو بحث کی گئی ہے وہ تو بڑی جامع اور فاضلانہ ہے ہی اسکے علاوہ ضمناً بھی اصول جرح و تعدیل اور نقد حدیث سے متعلق بعض بڑی کارآمد اور مفید باتیں آگئی ہیں۔"[۲]

عامر عثمانی نے اس کتاب پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرمایا

"مولانا اعظمی نے مسلک حنفی کے احقاق کا حق ادا کر دیا ہے۔"[۳]

قاضی اطہر مبارکپوری کے بقول یہ کتاب اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی اور لاثانی کتاب ہے۔[۴]

رکعات تراویح مذیل

جب رکعات تراویح منظر عام پر آئی تو اہلحدیث حضرات (غیر مقلدین) کی جانب سے اسکا جواب دیا گیا۔ اس جوابی کتاب کا نام "انوار مصابیح" تھا۔ اس میں احناف کے خلاف سخت انداز تحریر اختیار کیا گیا اور دل آزار باتیں لکھی گئیں، جو سنجیدہ علمی بحث میں کسی طرح مناسب نہ تھیں، بلکہ اس طرح کی تحریریں عوام کو دین و مذہب سے قریب کرنے کے بجائے دور کرنے میں زیادہ زود اثر ثابت ہوتی ہیں۔ احناف

---

۱ حیات ص ۲۸۱

۲ برہان ج ۳۹ ش ۵ ص ۳۸۱-۳۸۲

۳ تجلی اکتوبر ۱۹۶۳ ص ۵۲

۴ برہان ج ۳ ش ۵ ص ۴۸

کے خلاف "انوار مصابیح" کے جارحانہ تیور کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔

"یہ تنگ نظری جو صرف حلقۂ دیوبند کے ضدی مولویوں ہی میں پائی جاتی ہے۔"

"کاش مہتمم دار العلوم یہ فساد انگیز مشغلہ چھوڑ دیتے۔"

"حنفی مذہب بھی کیسا یتیم مذہب ہے کہ اس غریب کا سہارا یا تو کوئی ضعیف حدیث ہے یا کمزور توجیہ۔"[1]

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی جنہوں نے رکعات تراویح تحریر فرمائی تھی، ایک بار پھر اٹھے اور "انوار مصابیح" کے رد میں ۳۳۴ صفحات کی ایک کتاب تصنیف کر دی۔ مولانا اعظمی نے اس کتاب میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ رکعات تراویح کی عبارت کو ہو بہو متن میں رکھا، اور اس پر "انوار مصابیح" کے مصنف کے جو اعتراضات و اشکالات تھے، ان کا جواب ذیل (حاشیہ) میں دیا۔ یہ طریقہ بہتر و [illegible] ہے۔

"رکعات تراویح مذیل" موضوع، مواد، دلائل و شواہد کے اعتبار سے ایک کامیاب کتاب ہے، رکعات تراویح کے سلسلہ میں احناف پر غیر مقلدین کی طرف سے جو اعتراضات اور دل آزار باتیں کی جاتی ہیں، یہ کتاب ان کا شافی جواب ہے۔
مولانا ماہر القادری نے اس کتاب کے بارے میں یہ تاثر دیا:

"جہاں تک کتاب کے عمومی تاثر کا تعلق ہے اس میں متانت، تہذیب اور شائستگی پائی جاتی ہے، فریق ثانی کی دلیلوں کو بڑی قوت کے ساتھ توڑا ہے، اور رمضان کی تراویح میں رکعات کی تعداد کے مسئلہ کو اس قدر وضاحت سے سلجھا کر بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ آئینہ کی طرح روشن و مجلی ہو گیا ہے۔"[2]

---

[1] انوار مصابیح بحوالہ رکعات تراویح مذیل ص ۱۰

[2] ماہر القادری کے تبصرے ص ۵۲ مرتبہ طالب ہاشمی

چونکہ "انوار مصابیح" کا لہجہ و اسلوب تحریر جارحانہ تھا اس نے مولانا کے مزاج میں بھی فطری طور پر تلخی کے کچھ آثار ہیں، اور مناظرانہ رنگ غالب نظر آتا ہے، یہاں اس کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اس کتاب کے سرورق پر مصنف کا نام مولانا عبد الباری قاسمی لکھا ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر مسعود احمد کے مطابق یہ کتاب بھی مولانا اعظمی کی ہی تصنیف کردہ ہے، جو مولانا عبد الباری صاحب کے نام سے شائع ہوئی تھی۔[1]

رکعات تراویح مذیل پہلی مرتبہ ۱۳۷۹ھ م ۱۹۶۰ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

رہبر حجاج

حج کے مسائل و احکام سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، انہیں میں ایک کتاب 'رہبر حجاج' ہے۔ یہ کتاب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی تصنیف کردہ ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں حج کے مسائل و احکام مستند مراجع کے حوالے سے ذکر کیے ہیں، حج و زیارت میں جو آداب مسنون ہیں، اور جو امور غیر مسنون یا غیر شرعی ہیں، ان کا ذکر اس میں سہل و شستہ پیرائے میں کیا گیا ہے، اسکے ساتھ ساتھ اس میں مختصرا بحث بھی ہے۔

"تنبیہات" عنوان کے تحت مولانا اعظمی نے بہت سے اہم امور کی جانب توجہ دلائی ہے، مثال کے طور پر رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان معلمین جو دعا پڑھاتے ہیں، اسکے بارے میں مولانا نے لکھا کہ نہ ان دعاؤں کا پڑھنا ضروری ہے، نہ جس طریقے سے معلمین دعا پڑھاتے ہیں وہ کوئی اچھا طریقہ ہے، جو دعا یاد ہو حاجی خشوع و خضوع سے پڑھتا ہوا طواف کرے۔

---

1. حیات ص ۲۷

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ از ابتدا تا انتہا زبان سہل ہے مسئلہ مذکورہ
قاری کے سامنے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی افادیت واہمیت اور مقبولیت
کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ
کتاب ۱۳۸۲ھ م ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

بیمہ اور اسکا شرعی حکم

س دور کی دنیا میں انسان نے جیسے جیسے ترقی کی، اسکی خواہشات میں
اضافہ ہوتا گیا، جنکی تکمیل کے لئے اسے دولت وثروت کی کمی محسوس ہونے لگی
کمی کو پورا کرنے کے لئے اور زیادہ سے زیادہ زرو زمین کے حصول کے لئے اس
نے فطری وغیر فطری طریقے اپنائے، حالانکہ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ
انسان کی خواہشات اسکی موت کے ساتھ ہی ختم ہو سکتی ہیں، اس سے پہلے اس
سیلاب کے تھمنے کی امید نہیں۔

دور کی منفعت کے عصری وسائل میں ایک اہم وسیلہ "بیمہ" بھی ہے۔ اس
دور میں کم ہی ایسے خوش نصیب ہیں جو اسکے دام فریب سے محفوظ ہیں۔ شیخ عبداللہ
ناصح علوان کے مطابق ایک شخص کا خیال ہے کہ اسکی جان یا مال کو خطرہ درپیش ہے
اور وہ اس خطرہ کے اثرات ونتائج کو دور یا کم کرنے کے لئے ایسے لوگوں سے معاہدہ
کرتا ہے جو حادثہ پیش آنے پر اسکی تلافی کی ضمانت لیتے ہیں، اس ضمانت کے لئے
یک مشت یا قسطوں میں معاوضہ ادا کرتا ہے۔

چنانچہ جب وہ شخص کسی حادثہ کا شکار ہوتا ہے تو یہ معاہدہ کرنے والے لوگ
کچھ اضافہ کے ساتھ اس شخص کی رقم اسکو واپس کرتے ہیں، اسی مفہوم ومعنی کو بیمہ کہ

ہوتا ہے۔ بیمہ کا آغاز قرون وسطیٰ میں (۱۶۹۸ء) میں لائیڈز نامی شخص کے ایک مشہور قہوہ خانے میں ہوا۔[1]

اسلامی شریعت کی رو سے انشورنس جائز ہے یا ناجائز، فقہاء کے درمیان مختلف فیہ بحث ہے۔ بعض علماء اسکے جواز کے قائل ہیں جیسے استاذ مصطفیٰ زرقاء، استاذ عبدالرحمن عیسیٰ، استاذ محمد یوسف موسیٰ اور استاذ علی خفیف، انکے علاوہ بعض ہندوستانی علماء کے یہاں بھی جواز کا رجحان پایا جاتا ہے۔

بیمہ کو حرام قرار دینے والے فقہاء میں اہم نام علامہ شیخ محمد بخیت المطیعی حنفی، علامہ محمد ابوزہرہ، ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ، شیخ عبداللہ ناصح علوان اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ کے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم فقہاء میں زیادہ تر عدم جواز کے ہی قائل ہیں۔

۱۹۶۳ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ملک وملت کے حالات کے پیش نظر بیمہ سے متعلق مسائل کا از سر نو جائزہ لیا۔ مجلس کے علماء ومفتیوں کا رجحان بیمہ کے جواز کا تھا۔ چنانچہ مجلس کی طرف سے مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بیمہ کے جواز سے متعلق دلائل وامکانات کو جمع کر کے ایک مفصل تحریر مرتب کی اور اس مرتب کردہ مقالہ کو نظر ثانی کے لیے مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی خدمت میں پیش کیا۔[2]

مولانا اعظمی نے اس مفصل مقالہ کو بغور پڑھا اور اس پر ایک نوٹ تیار کیا، مولانا نے اس تحریر میں ۲۱ جگہوں پر گرفت کی، بیمہ کے جواز سے متعلق جمع کردہ شواہد میں ہونے والے تسامحات اور غلطیوں کی نشاندہی فرمائی، اصول فقہ کی رو سے فقہاء کی

۱۔ اسلام میں بیمہ کا حکم، از شیخ عبداللہ ناصح علوان، مترجم: [illegible] مسعود احمد، ص ۲۹-۳۰ (مجلہ [illegible]
بیمہ اور مسئلہ شرعی حکم۔ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی)

۲۔ المآثر شمارہ ۲ ج ۳ [illegible] بیمہ اور مسئلہ شرعی حکم ص ۹، [illegible] جون/جنوری تا جون ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۶

مراد و معنی کی تعیین و تخصیص کی، بیمہ کے جواز کے سلسلہ میں جن فقہاء کا حوالہ دیا گیا تھا ان کا دلائل کے ساتھ رد فرمایا، خلاصہ یہ کہ مولانا بیمہ کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کے یہاں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔

جناب مولانا تقی امینی کا مضمون تو بہت مفصل ہے، اس لئے طوالت کے خوف سے نقل کرنے سے گریز کیا جاتا ہے، اور اس موقع پر مولانا کے لکھے ہوئے نوٹ سے صرف دو چار نکات پیش کئے جاتے ہیں، مولانا کی تحریر سے ہی مولانا تقی امینی کے مضمون پر بھی روشنی پڑ جائے گی، مولانا فرماتے ہیں۔

۱ پس اندازی کے رجحان کو فطری کہہ کر ظاہر کرنا کہ وہ تمام تر محمود رجحان ہے، میں اس سے متفق نہیں ہوں، فطرت بیمہ کا تقاضا وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی قولی و عملی تعلیمات سے ثابت ہوتی ہے، جو حریصانہ پس اندازی اور مسرفانہ انفاق کے درمیان ایک نہایت معتدل رجحان ہے، اور جس میں پس اندازی سے زیادہ انفاق کا عنصر نمایاں ہے۔

۲ بیمہ کا اہم مقصد اثاثہ جمع کر کے مستقبل کے غیر متوقع حادثات وخطرات کا مقابلہ کرنا ہے، یہ بات عایۃ الغایت کی حد تک تو کسی درجہ میں صحیح لیکن بیمہ کی اولین غرض وہ ہوتی ہے جو "بیمہ کی قسموں" کے عنوان کے تحت مذکور ہے، یعنی مال یا اطراف کے امکانی نقصان کی تلافی۔

۳- دار الاسلام و دار الحرب کی بحث کو حل کی بنیاد بنانا مناسب ہو یا نہ ہو، سوال یہ ہے کہ بیمہ اگر ربوی معاملہ یا قماری ہے تو دونوں جگہ اسکا حکم یکساں ہے یا الگ الگ؟

۴- من ضمن عن آخر خراجہ کا ترجمہ صحیح نہیں ہے، لہذا جو نتیجہ اس سے نکالا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اسکا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ جو خراج کسی پر واجب ہے یا جو نوائب "وقتی ٹیکس" اس پر عائد ہوتے ہیں، یا جو قیمت اسکے ذمہ ہو، اسکی ضمانت کوئی

سے تو جائز ہے۔ اس عبارت کی شرح اور تواتب وغیرہ کی تحقیق کے لئے ہدایہ (۳/۰۹) کی طرف رجوع کیجئے۔[1]

مولانا نے اپنے اس نوٹ کے ساتھ ایک مکتوب بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کو ارسال فرمایا تھا، اس خط کی ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں

"محبی فاضل! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بیمہ والی تحریر پر اپنے نوٹ بھیج رہا ہوں، میں نے پہلا خط صرف اس لئے لکھا تھا کہ مجھے اطمینان ہو جائے کہ اظہار اختلاف، دلگیری پیدا ہونے کا سبب نہ بنے گا۔ باقی رہا قبول کرنا، تو کل کیا، آپ ایک بات بھی قبول نہ کیجئے، میں برا نہ مانوں گا" [2]

بیمہ پر مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کا یہ نوٹ تحقیق کی دنیا میں ایک مستقل اضافہ ہے، بیمہ کے جواز و عدم جواز کے بارے میں علماء کی آراء کا ایک عمدہ تجزیہ ہے مولانا کی اس تحریر کی حیثیت ایک نوٹ اور بیمارک کی نہ رہ کر بیمہ کے موضوع پر مستقل ایک مختصر تحقیقی رسالہ کی ہوگئی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے فقہ کے اصول و اصطلاحات پر مولانا کی گہری نظر کا علم ہوتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے جو بحث کی ہے وہ زیادہ تر اصول اور اصطلاحات کی تعیین اور تخصیص کی ہی بنیاد پر کی اور ایک حتمی فیصلہ پر پہنچے کہ بیمہ ناجائز ہے۔[3]

---

[1] بیمہ اور اس کا شرعی حکم ص ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۳۲

[2] "بیمہ اور اس کا شرعی حکم" میں مولانا کے مکتوب کو مولانا علی میاں کے نام لکھا گیا ہے، لیکن سرپرست ادارہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور ڈاکٹر مسعود احمد سے زبانی گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ یہ خط دراصل مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کے نام لکھا گیا تھا لیکن رسالہ کی طباعت کے وقت اس کی طرف توجہ نہ ہو سکی

[3] بیمہ اور اس کا شرعی حکم ص ۱۱

بیمہ کے موضوع پر ایک تحقیقی رسالہ 'حکم الاسلام فی التامین' ہے، جس کے مصنف ایک شامی عالم عبداللہ ناصح علوان ہیں۔ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی نے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ 'المجمع العلمی' مئو نے ۲۰۰۲ء میں بیمہ کے موضوع پر مولانا اعظمی کی اس تحریر اور شیخ علوان کے رسالہ کو ایک ساتھ 'بیمہ اور اس کا شرعی حکم' کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ ۹۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

دارالاسلام اوردارالحرب

مغل حکمراں جب مغلوب ہوگئے اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو ہندوستان کی حیثیت شرعی کے بارے میں کچھ سوالات اٹھنے لگے کہ اب یہ پہلے کی طرح دار الاسلام رہا یا دار الحرب؟ اسی کشمکش کے عالم میں شاہ عبدالعزیزؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتوی دیا۔ شاہ صاحب کا یہ فتوی سیاسی نقطۂ نظر سے بہت مفید ثابت ہوا، اس فتوی نے انگریز دشمنی اور اس ملک سے ان کے انخلا میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہمارا مقصود یہاں اس فتوی سے فقہی نقطۂ نظر سے بحث کرنا ہے سیاسی پہلو سے اس کا جائزہ لینا نہیں۔

چونکہ انیسویں صدی میں ملک کے حالات بدل چکے تھے، حاکم قوم محکوم ہوچکی تھی اور محکوم لوگ حاکم بن بیٹھے تھے، اور بیسویں صدی میں ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا؛ اس لئے لامحالہ اس تبدیلی کے ساتھ مسائل شرعیہ کی نوعیت میں بھی تبدیلی ایک لازمی نتیجہ تھی۔

چنانچہ اس حین علماء اور فقہاء کے درمیان ہندوستان کے دار الاسلام یا دار الحرب ہونے کی بحث کسی نہ کسی انداز میں چھڑی رہی، تا کہ اس بنیاد پر دائرۂ مسائل

اور احکام شرعیہ کی صحیح جہت درست مقرر کی جا سکے۔ اس سلسلہ میں علماء اور فقہاء میں قابل ذکر نام حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا عبدالحی، حضرت مولانا کرامت علی جونپوری، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا عبدالحی، حضرت مولانا محمد تھانوی کے ہیں۔ اور بعد کے لوگوں میں اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں میں مولانا محمد میاں، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

علماء کا ایک طبقہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتا تھا، ایک طبقہ اسکو دارالاسلام قرار دیتا تھا، اور کچھ علماء اسے دارالامان کہتے رہے۔ اپنے اپنے دلائل وشواہد بھی تھے۔ اور اس سلسلہ میں اکثر کی رائیں مضامین، فتوے یا مقالات کی شکل میں منظر عام پر آچکی تھیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے بھی اس موضوع پر ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا جو گرچہ بعض علماء کی آراء پر تنقیدی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسکے باوجود اس مقالہ کی حیثیت تحقیقی وارامد یہ نگارش جدید تجزیہ کا ہے۔ مولانا اعظمی اول بشمول امام ابوحنیفہ، قدیم فقہاء کی آراء پیش کرتے ہیں، قدیم فقہی مراجع سے اقتباسات نقل کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں دارالحرب ودارالاسلام کی حقیقی وحکمی تعریف کرتے ہیں اور ان تعریفات کی روشنی میں ہندوستان کس دار کے تحت آتا ہے اسکا فیصلہ فرماتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں

"مذکورہ بالا ارشادات کی رو سے ہندوستان کا دارالحرب ثابت ہونا ناممکن ہے، دراثی رو سے وہ بلاشک وشبہ دارالاسلام ہے۔"[1]

پیش کیے گئے دلائل کا خلاصہ جن کی بناء پر مولانا اعظمی نے ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیا یہ ہے کہ جن بلاد کے والی وحاکم غیر مسلم ہوں مگر مسلمان اس میں

[1] دارالاسلام اور دارالحرب ص ۲۸

جمعہ و جماعت قائم کرتے ہیں اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قاضی[1] بن سکتا ہو اس کو دار الحرب کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

مولانا نے محققین اور فقہاء کے دونوں موقف کو پیش کرکے انکا محاکمہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ کن بنیادوں پر بعض فقہاء نے ہندوستان کو دار الحرب کہا ہے، انکے دلائل کا تجزیہ فرمایا، خاص طور پر شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے پیش کردہ دلائل اور تحریروں میں مولانا الاعظمی کو خلجان پیش آیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی ایک تحریر کے بارے میں مولانا اظہار خیال فرماتے ہیں:

"یہ اور اسی طرح کی بعض دوسری باتیں پڑھ کر ہم کو شک ہوتا ہے کہ یہ تحریر واقعی حضرت شاہ صاحب کی ہے بھی یا نہیں، ہم کو اس میں خلجان ہے۔"[2]

مولانا الاعظمی کو ان حضرات سے سخت اختلاف ہے جو دار کی چار قسمیں قرار دیتے ہیں یعنی دار الامن اور دار العہد کو دار الاسلام اور دار الحرب کا قسیم ٹھہراتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ دار الامن اور دار العہد ایک دار (دار الحرب) کے ہی تحت آتے ہیں الگ سے کوئی قسم نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی علمی گرفت کی ہے۔ مولانا اعظمی نے دار الحرب سے ہجرت اور دار الحرب میں سود کے حکم پر بھی بحث کی اور بیمہ کے باب میں تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے فتوی کو غلط قرار دیا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے اپنے اس مضمون میں مولانا محمد

---

[1] قاضی سے مراد قاضی حقیقی ہے، قاضی خصوصات نہیں کیونکہ قضاء کی شرعی تعریف کے سلسلہ میں فتاوی عالمگیری میں ہے "والقضاء فی الشرع قول ملزم یصدر عن ولایہ عامہ" یعنی قضاء شریعت میں ایسے فیصلہ کو کہا جاتا ہے جو کسی پر ایسے شخص کی طرف سے لازم ہو جس کو ولایت عامہ حاصل ہو (فتاوی عالمگیری ۳۰۶/۳) اور ظاہر ہے کہ یہاں ہندوستان میں ولایت عامہ حاصل نہیں۔

[2] دار الاسلام اور دار الحرب ص ۳۴

میں، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی پر خاص طور سے ا
ونقد فرمائی اور ان کے موقف و دلائل کی بادلائل تردید کی۔ مولانا اعظمی کا یہ مضمون
ان کی فقہی بصیرت کا عمدہ نمونہ ہے، اگر اسے بحث وتحقیق کا مرقع کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

پہلی مرتبہ یہ رسالہ جنوری تا اکتوبر-نومبر ۱۹۶۷ء میں مجلہ ابلاغ بمبئی میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ اسکے بعد یہ رسالہ جلد ۹ شمارہ ۳ سے جلد ۱۰ شمارہ ۴ تک مجلہ المآثر کے صفحات پر شائع ہوا۔ اب یہ مقالہ 'دارالاسلام و دارالحرب' کے نام سے کتابی شکل میں المجمع العلمی مئو سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔

مولانا الاعظمی کی اس فقہی تحقیق کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ملک کے مختلف رسالوں اور مجلات میں اس پر ریویو لکھے گئے۔ عربی مجلہ الداعی میں مولانا نور عالم خلیل امینی استاد ادب دارالعلوم دیوبند 'دارالاسلام و دارالحرب' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"وقد تحدث المحدث الأعظمي كما هو شأنه في كل موضوع علمي إسلامي يعالجه بقول فصل يزيل كل لبس، ويجلي كل غموض، فهي بذلك دراسة رائعة تستحق أن تنقل ولا سيما إلى اللغة العربية."[1]

(محدث الاعظمی نے اپنے اسی انداز پر جیسا کہ ہر علمی اسلامی موضوع میں ان کی نمایاں شان ہے، اس بحث میں بھی اپنی ایک فیصلہ کن رائے قائم کی اور تمام طرح کے اوہام والتباس کو دور فرمادیا۔ چنانچہ یہ ایک اچھی شاندار علمی بحث ہے جسکا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہونا چاہئے خاص طور سے عربی زبان میں۔)

۱۔ الداعی جون ۲۰۰۳ء ص ۴۳

فقہی انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی دعوت

کویت کی وزارت اوقاف نے "الموسوعة الفقهية" (فقہی انسائیکلوپیڈیا) کی جمع و ترتیب کا کام اپنی ماتحتی میں شروع کیا تھا، معروف شیخ مصطفی احمد الزرقاء اس پروجیکٹ کے نگراں تھے، مولانا اعظمی کو بھی وزارت اوقاف کی جانب سے کویت میں قیام کرنے کی دعوت دی گئی، تاکہ مولانا انسائیکلوپیڈیا سے متعلق سپرد کی گئی ذمہ داریوں کو کویت میں ہی رہ کر انجام دے سکیں۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان متعدد خطوط حکومت کویت کی طرف سے مولانا اعظمی کے پاس بھیجے گئے، مولانا نے اپنی رضامندی بھی دے دی تھی، حکومت کویت کا دعوت نامہ تو ہمیں دستیاب نہ ہو سکا البتہ مولانا اعظمی کی آمادگی کے بعد شیخ مصطفی احمد الزرقاء کے شکریہ و شرائط کے دو خط ضرور ملتے ہیں، ایک خط ۳۰ر جون ۱۹۶۹ء کا ہے، جس کا ایک مختصر سا اقتباس ذیل میں پیش خدمت ہے

"صاحب الفضيلة الأستاذ الجليل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي المحترم

حفظه الله تعالى و دام للمسلمين نفعه

السلام عليكم

وبعد فأحمد الله تعالى إليكم راجياً من فضله أن تكونوا بخير وعافية من كل مكروه.

تلقيت الآن رسالتكم العزيزة المؤرخة في ٦/٤/١٣٨٩هـ جواباً على رسالتي الأخيرة إليكم وقد كان سروري عظيماً جداً بما تضمنته من استعدادكم للمجيء هنا للتعاون في مشروع الموسوعة بما يمكن أن

يستفاد فيه من فضيلتكم في هذا المشروع الحسن بارك
الله فيكم وقواكم وإيانا على متابعة الخدمة لهذه الشريعة
الغراء الخالدة.[1]

(عزت مآب استاذ جلیل محترم شیخ حبیب الرحمٰن اعظمی، اللہ آپ کی
حفاظت فرمائے اور جناب کے فیض وبرکات کو جاری رکھے۔ السلام علیکم
الحمدللہ بخیر ہوں، آپ کی خیریت وعافیت کا متمنی ہوں۔

میرے آخری خط کے جواب میں ۶/۴/۳۸۹ھ کو گرامی نامہ موصول ہوا،
مجھے بہت مسرت ہوئی کہ اس خط میں انسائیکلوپیڈیا کے پروجیکٹ میں
یہاں آکر آپ کے تعاون کرنے کی اطلاع ہے، اور اس وجہ سے بھی خوشی
ہوئی کہ اس عظیم پروجیکٹ میں آنجناب سے حتی الامکان استفادہ کیا جاسکے
گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں برکت عطا فرمائے، اور ہمیں اور آپ کو
اس عمدہ اور پائندہ شریعت کی خدمت جاری رکھنے کی قوت بخشے۔)

اور رجب ۳۹۰ھ/۱۲/ستمبر ۷۰ء کے ایک دوسرے مکتوب میں شیخ
مصطفیٰ الزرقاء تحریر فرماتے ہیں کہ

"وبعد فأسأل المولى أن تكون حالتكم الصحية جيدة، وأن
تكون آثار العملية الجراحية قد ولت وعاد إليكم نشاطكم
المعهود، وحينئذ أجد الفرصة سانحة لتكرار العرض على
فضيلتكم للحضور إلى الكويت والقيام بمهمة عضو في
هيئة تحرير الموسوعة، وذلك لمدة سنة مبدئيًا،
بالشروط والتعليمات المبلغة لسيادتكم سابقًا وبمرتب

۱- حیات ص۳۱۰-۳۱۱

شهري (ليس معه اي توابع أو علاوات) قدره ۳۵۰ ثلاثمائة وخمسون ديناراً كويتياً."[1]

(اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کی صحت اچھی ہو، اور آپ بیتی سے اثرات ضائع ہو چکے ہوں، اور نشاط و فرحت لوٹ آئی ہو، یہ موقع اس وقت غنیمت سمجھ رہا ہوں کہ آنجناب سے ایک بار پھر درخواست کروں کہ کویت تشریف لائیں، اور انسائیکلوپیڈیا کے ایڈیٹوریل بورڈ کے ایک ممبر کی حیثیت سے اپنے کام کو انجام دیں، یہ قیام کم از کم ایک سال کے لئے ہوگا، انہیں شرائط و ہدایات کے مطابق جو پہلے عرض کی جا چکی ہیں، اور ساتھ میں (سہولیات و لوازمات کے علاوہ) ۳۵۰ کویتی دینار کا مشاہرہ بھی ہوگا۔)

لیکن مولانا اعظمی کو بیروت کا سفر پیش آگیا، جہاں جانا ضروری تھا، اس وجہ سے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے لئے کویت نہیں جا سکے، لیکن پھر بھی گھر بیٹھے 'الموسوعۃ الفقہیۃ' کا کام کیا۔ مولانا نے 'کتاب الجنائز' لکھ کر وزارۃ الاوقاف کویت کو روانہ کیا تھا، اس کے علاوہ ''انسائیکلوپیڈیا کے متعدد مقامات پر نظر ثانی کا کام بھی کیا۔''[2]

---

[1] حیات ص ۳۱۲

[2] ایضاً ص ۳۱۲

انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں بانٹ دیا، تا کہ تم ایک دوسرے کی شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک با عزت وہ ہوگا جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہوگا۔

فقہاء وعلماء نے اس آیت کے ذیل میں انساب وکفاءت کے موضوع پر بحث وتحقیق کی ہے، کفاءت (مساوات) ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور الجھ جاتا ہے جب شادی بیاہ کا معاملہ ہوتا ہے، یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زوجین کے درمیان موافقت کے لئے کفاءت یعنی مساوات کا کیا معیار ہوگا، دیانت وتقویٰ، نسب، مال، پیشہ، ان میں سے ہر ایک چیز ملحوظ ہوگی یا کوئی ایک یا صرف دین وتقویٰ کا حق رہوگا، اور اسکے علاوہ دوسری چیزوں کا سرے سے اعتبار نہیں، ائمہ وفقہاء حضرات کی اس مسئلہ میں مختلف آراء ہیں۔

قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور ائمہ وفقہاء کے اقوال وآراء کی روشنی میں بعد کے محققین اور علماء نے بھی اس موضوع پر بحث کی ہے اور اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ ۱۳۵۱ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی کفاءت کے مسئلہ پر قلم اٹھایا اور نہایات الارب فی غایات النسب' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس پر تقریظ لکھی ہے، یہ تقریظ 'وصل السبب فی فصل النسب' کے عنوان سے ہے۔ اس رسالہ کو مفتی محمد شفیع صاحب نے کس پس منظر میں تحریر فرمایا، خود بیان فرماتے ہیں کہ

"پہلا مرض (تفاخر بالانساب) اور دوسرا مرض (انتساب الی غیر الانساب) ان دونوں کا مرض در حقیقت ایک ہی مرض تھا کہ اصل کمالات اور حقیقی فضائل کو چھوڑ کر نسب کے پیچھے پڑ گئے، اور سب سے زیادہ اہم اور اعلیٰ فضیلت کو نسب کو سمجھے ایک تیسرا طبقہ وہ ہے جو سرے سے تفاضل انساب ہی کو مٹانا چاہتا ہے کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور اسکا نام مساوات اسلام رکھا ہے آخر الذکر مسئلہ مساوات کے متعلق اطراف ملک سے سوالات کثرت سے ہوئے نکاح شادی کے معاملات میں کفاءت کے باب کو ان حضرات نے بالکل چھوڑ دینا چاہا اور مساوات اسلام کے سچے اور صحیح عنوان کا معنون یہ غلط صورت بنادی اس لئے خیال ہوا کہ اس بحث کو ایک مستقل رسالہ کی صورت میں لکھ دیا جائے۔" [1]

مفتی صاحب نے اس رسالہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جزو اول مساوات اسلام کی حقیقت اور پیشوں میں تفاضل، جزو دوم التفاخر بالانساب، جزو سوم الانتساب الی غیر الانساب۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے نزدیک مساوات کی حقیقت یہ ہے کہ زمان و مکان اور اجناس و اصناف کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون بنایا جائے، اور اس قانون کی تنفیذ میں اعلیٰ ادنیٰ اونچ نیچ ذات پات کا امتیاز نہ برتا جائے، نہ یہ کہ قانون ہی یہ مہمل بنایا جائے کہ گدھا اور گھوڑا برابر ہوں۔ [2]

انساب اور پیشوں کے باہمی تفاضل سے متعلق مفتی صاحب کی تحقیق یہ ہے

---

[1] کہاوت اور نسب فی غایت النسب ص ۳
[2] ایضاً ص ۸

کہ عزت وذلت ایک عرفی ہے اور ایک شرعی، شرعی عزت کا مدار اللہ کے نزدیک صرف
تقویٰ اور اتباعِ شریعت ہے، ذات پات کی اونچ نیچ، خاندان و قوم کا تفاوت اس
جگہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے "ان اکرمکم عند اللہ
اتقاکم" احادیث بھی وارد ہیں کہ اللہ کے نزدیک فضیلت کا مدار تقویٰ ہے، مرد اگر
عورت سے افضل ہے تو اسی وقت ہے جب اسکو تقویٰ کی دولت حاصل ہو، عرب کو عجم
سادات (بنی ہاشم) کو دوسرے عرب پر اور تمام عجم پر اگر فضیلت حاصل ہوگی تو صرف
اور صرف تقویٰ و دیانت کی بنیاد پر ہوگی، اور جہاں تک عرفی عزت کی بات ہے تو ان
تمام چیزوں کا تفاضل معتبر ہے[1]

مفتی صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں آگے چل کر احادیث و آثار اور
اقوال فقہاء وغیرہ پیش کیے ہیں۔ یہاں اس رسالہ پر تبصرہ و تعارف مقصود نہیں اس
لئے اسکی تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔

پھر ہندوستان کے ایک مشہور عالم نے مذکورۃ الصدر آیت کی تفسیر میں ایک
مستقل رسالہ تحریر فرمایا، اور اس آیت کے ذیل میں کفاءت کے موضوع پر کلام کرتے
ہوئے نسبی تفاضل پر بھی بحث کی، فاضل مصنف کی تحقیق کا نتیجہ بھی وہی تھا جو حضرت
مفتی محمد شفیع صاحب کی بحث و تحقیق کا تھا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ نے بھی کفاءت کی شرعی حیثیت سے
بحث کی، اور اس موضوع پر لکھے گئے دونوں رسالوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہر دو
محققین کے موقف کی تردید کی۔

مولانا اعظمی نے اولاً آیت شریفہ کے پہلے فقرہ "یا ایھا الناس انا
خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ" کی تفسیر میں لکھا کہ یہ فقرہ نسبی مساوات پر دلالت کرتا

---

[1] نہایات الارب فی غایات النسب ص ۱۵، ۱۶

ہے، کہ جب سارے نسان ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا ہوئے تو کسی کو کسی نسب کے لحاظ سے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مولانا نے اپنی تائید کے سلسلہ میں امام بغوی، علامہ خازن، خطیب شربینی، بیضاوی، امام نسفی علامہ زمخشری اور علامہ عیسی وغیرہ کی تصریحات درج کیں۔

آیت کے دوسرے فقرہ ' وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا " کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خاندان وقبائل کی تقسیم اس لئے نہیں کی کہ اسکے بندے اسکو شرافت کا معیار قرار دے لیں، بلکہ یہ تقسیم تو صرف اس لئے ہے کہ اسکے ذریعہ شناخت اور پہچان ہو سکے، مثلاً دو شخص ہیں ایک ہی نام کے، اور ان کے باپ کا نام بھی ایک ہی ہے، تو ایک کو اموی اور دوسرے کو قرشی کہہ کر دونوں میں تمیز کیا جا سکے۔ مولانا نے دلیل میں علامہ زمخشری کی عبارت پیش کی۔ اور تیسرے فقرہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کو شرافت، عزت اور فضیلت کا معیار قرار دیا۔[1]

نسبی مساوات اور ذات پات کی اونچ نیچ کی تردید میں مولانا اعظمی اس آیت کے شان نزول کو بھی بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عرب قبیلہ بنو بیاضہ سے فرمایا کہ ابو ہند کا (جو بنو بیاضہ کے غلام اور پچھنا لگانے کا پیشہ کرتے تھے) اپنے خاندان میں نکاح کر دو بنو بیاضہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہم اپنی لڑکیوں کو اپنے غلاموں سے بیاہ دیں، تب یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

مولانا اعظمی کی رائے یہ ہے کہ ساری برادریاں ایک ماں باپ سے پیدا ہوئی ہیں، اس لئے نسباً تو ان میں کوئی تفاوت نہیں، البتہ جن برادریوں نے علمی و عملی کمالات سے خود کو آراستہ کر لیا ہے وہ کسبا دوسری برادریوں سے اعلیٰ ہیں۔[2]

---

[1] انساب و کفاءات کی شرعی حیثیت ص ۷ [2] ایضاً ص ۲۳

مولانا تمثیل کے ذریعہ شعوب وقبائل کے مفہوم کو اس طرح سمجھاتے ہیں

"بہرحال انسانوں کا نسب ایک ہے، ہاں اس نسب میں بہت سی شاخیں، پھر شاخوں میں دوسری شاخیں پیدا ہوتی گئی ہیں، انہیں شاخوں اور شاخوں کی شاخوں کو قرآن کریم میں شعوب وقبائل سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اسکی مثال بعینہ درخت کی ہے کہ اس کا تنا ایک ہوتا ہے، اسی ایک تنا سے کئی شاخیں پھوٹتی ہیں، پھر ان شاخوں میں بھی کئی کئی شاخیں نکل آتی ہیں، پس جس طرح اس درخت کے جتنے پھل یا پھول یا پتیاں ہیں وہ پہچان کے لئے یوں کہے جائیں گے کہ یہ پھل فلاں شاخ کا ہے، اور یہ فلاں شاخ کا، پھر بھی وہ سب ایک درخت کے ہیں۔"[1]

کفاءت کے سلسلہ میں مولانا اعظمی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جمہور علماء اسلام کے نزدیک دین کے ساتھ نسب میں بھی کفاءت کا اعتبار ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ نسبی کفاءت کا اعتبار عرب یعنی اولاد قحطان اور اولاد اسماعیل تک ہی مخصوص ہے، عجمی نسل کے لوگوں میں اس کفاءت کا مطلق اعتبار نہیں ہے۔ پھر آگے چل کر اس سلسلہ میں مولانا نے دلائل وشواہد دیئے، اور لکھا کہ

"فقہاء حنفیہ نے تصریح کی ہے کہ غیر عربی برادریوں میں نسبی کفاءت کا اعتبار نہیں ہے۔"[2]

"فقہ میں جولاہے اور دھنئے سے کون مراد ہے؟" کا عنوان قائم کرکے مولانا اعظمی نے مسئلہ کفاءت کے اس رخ کی جانب بھی توجہ فرمائی کہ جولاہے اور دھنیے فقہی اصطلاح میں کس کو کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ فقہ میں جولاہا اور دھنیے سے مراد وہی

---

[1] انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت ص ۴۴

[2] ایضاً ص ۵۵

ہوسکتا ہے، جو خود یہ پیشہ کر رہا ہے، جو شخص یہ پیشہ چھوڑ چکا ہے، قدیم زمانے میں کبھی اسکے خاندان میں یہ پیشے ہوتے تھے تو ایسے شخص کو کوئی غیر پیشہ ور عجمی تو موقعہ خوشی سے جولاہہ یا دھنیا قرار دے کر اپنا غیر کفو نہیں کہہ سکتی۔

پیشہ کے اعتبار سے کفاءت کے بارے میں مولانا اعظمی سرخسی کی ایک مبسوط عبارت پیش کرتے ہیں، جسکا خلاصہ یہ ہے کہ

۱- امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک پیشہ میں کفاءت معتبر نہیں، امام ابویوسف کے نزدیک پیشہ کے لحاظ سے کفاءت کا اعتبار ہے۔

۲- پیشہ اور نسب کی حیثیت میں فرق ہے مثلاً اگر کوئی آدمی خسیس پیشہ اختیار کرتا ہے تو خسیس کہلائے گا، اور اگر اس پیشہ کو چھوڑ کر کوئی اچھا پیشہ اختیار کرتا ہے تو کمی خست اور دنائت دور ہو جائے گی، برخلاف نسب کے کہ اس میں یہ صورت نہیں چلے گی، اسکا جو نسب ہے وہ نسب رہے گا۔

۳- اسی طرح یہ حدیث نقل کی جاتی ہے کہ سارے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں بجز جولاہے اور حجام کے، اس حدیث کے بارے میں امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ناقابل اعتبار حدیث ہے۔

بالغہ لڑکی اپنا نکاح غیر کفو میں کرلے تو نکاح صحیح ہوگا یا نہیں؟ ولی کی رضامندی کے بغیر اگر بالغہ لڑکی نے اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا تو اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں، حسن بن زیاد کی روایت کی بناء پر اس صورت میں نکاح صحیح نہیں ہوگا، لیکن ظاہر روایۃ کی بناء پر نکاح صحیح ہے، اب دونوں میں مفتیٰ بہ قول کون ہے؟

مولانا اعظمی فرماتے ہیں کہ:

"تحقیقی بات یہ ہے کہ مشائخ نے دونوں روایتوں پر فتوے دیے ہیں۔"[۱]

---

[۱] نسب و کفاءت کی شرعی حیثیت ص ۲۴

مولانا نے ان دونوں روایتوں میں ترجیح کی کوشش کی ہے، اور ظاہر الروایہ کو چند وجوہ ترجیح سے راجح قرار دیا ہے۔

آخر میں مولانا اعظمی نے "ہندوستانی شرفاء کے شجرہائے نسب" کا عنوان قائم کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا نے ہندوستان کے مشہور خاندانوں کے شجروں سے بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں جو غلط انتساب ہیں یا جو مشتبہ اطلاعات ہیں، ان کو واشگاف کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ مولانا اعظمی نے تحریر فرمایا کہ ہندوستان کے اکثر فاروقی حضرات اپنے کو حضرت ابراہیم بن ادہم کی ولادت سے بتاتے ہیں، حالانکہ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ ان کے نسب کے بارے میں "ترجیح محدثین کے قول کو ہے۔" یعنی یہ کہ ابراہیم ادہم حضرت فاروق کی اولاد میں تو درکنار وہ قریشی بھی نہیں ہیں بلکہ عجلی یا تمیمی ہیں۔[1]

مولانا اعظمی نے ان شجروں کے بابت جو کچھ لکھا ہے، دلیل وشہادت کی روشنی میں لکھا ہے۔ وفاء الوفاء، نزہۃ الخواطر، تاریخ ظفر آباد، استاذ خلص، نفحات الانس، مرآۃ الانساب، اصول المقصود، طبقات ابن سعد وغیرہ کے حوالے دیے گئے ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی یہ کتاب انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت کی تعیین کے سلسلہ میں بہت مدلل کتاب ہے، جس وقت مولانا نے یہ کتاب تحریر فرمائی اس وقت ان کی عمر بتیس یا کچھ زائد رہی ہوگی، کیونکہ حضرت مفتی محمد

---

[1] حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ابراہیم بن ادہم کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "چار روایتیں ابراہیم بن ادہم کے بارے میں جمع ہو گئیں، فاروقی، عجلی، تمیمی، سید، پانچواں شبہ یہ ہے کہ ابراہیم بن ادہم بہت سے ہوئے ہیں واللہ اعلم یہ فاروقی کون سے ابراہیم بن ادہم کی طرف منسوب ہیں، مجھے تو جب سے یہ روایات معلوم ہوئی ہیں تو اس ہوئے نسب کو سلام کرتا ہوں اور نہ میں اپنے آپ کو فاروقی لکھتا ہوں ہاں اس قدر تو محقق ہے کہ جو لوگ فاروقی کہلاتے ہیں یہ اولاد ہیں۔" (حقیقت عبادت ص ٢٦٦)

شفیع صاحب کی نہایات الارب فی غایات النسب کا سنہ اشاعت ۱۳۵۱ھ ہے، کچھ بعد ہی مولانا نے یہ کتاب لکھی ہوگی اور مولانا کا سن ولادت ۱۳۱۹ھ ہے، چنانچہ ان کی عمر بتیس تینتیس کے قریب رہی ہوگی۔

مولانا اعظمی کی ذہانت اور قوت استعداد کو دیکھتے ہوئے عمر کی اس منزل پر "انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت" جیسی کتاب کا لکھا جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ انہوں نے ۲۹ برس کی عمر میں ہی حدیث کا وہ کام کر دکھایا تھا کہ جس نے فن کے امام کو چونکا دیا تھا۔

بہرکیف مولانا نے اپنے موقف کو قرآن وسنت اور فقہ کی روشنی میں پیش کیا، اور نسب وکفاءت کے سلسلہ میں اردو زبان میں ایک قیمتی کتاب تصنیف کی، انہوں نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ اسلام میں نسبی تفاضل، ذات پات کی اونچ نیچ کوئی چیز نہیں ہے، اگر فضیلت و برتری کا کوئی مدار ہے تو وہ تقویٰ ہے انساب کو کوئی افضلیت نہیں حاصل ہے، البتہ علم وعمل اور تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے کسب کوئی برتر ہوسکتا ہے۔ کتاب کے حواشی بھی بہت اہم اور معلومات آفریں ہیں۔

کتاب کا عنوان یا نام حضرت مولانا اعظمی کا تجویز کردہ نہیں ہے، بلکہ اس کا نام مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو نے تجویز کیا ہے۔ ادارہ نے اسی کتاب کے صفحہ ۵ کی ایک تحریر سے اس نام کو اخذ کیا ہے، وہ تحریر یہ ہے

"میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنیوالے، حق بات کا اعلان کرنے والے، اور انساب وکفاءت پر شرعی حیثیت سے روشنی ڈالنے والے عربی النسل بزرگ" [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا نے جس انداز سے اس موضوع پر بحث

[1] انساب وکفاءت کی شرعی حیثیت ص ۱۳

تحقیق کی ہے، وہ واقعی قابل تعریف ہے، انہوں نے خیر القرون کے اسلامی معاشرہ کی جس طرح منظر کشی کی ہے، اور اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان مساوات و عدم امتیاز کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ مولانا جیسے محقق کا ہی حصہ تھا۔

چونکہ یہ کتاب دو رسالوں کے رد میں لکھی گئی تھی جو اسی موضوع یعنی کفاءت وغیرہ پر منظر عام پر آئے تھے، اور جن کے انداز تحریر سے سواد اعظم کی دل آزاری ہوئی تھی، اس لئے اس میں بھی بعض مقامات پر تلخی کے اثرات پائے جاتے ہیں اور انداز تحریر میں کہیں کہیں شدت آگئی ہے۔

یہ کتاب ۱۴۲۰ھ م ۱۹۹۹ء میں المجمع العلمی، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو سے شائع ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاید مولانا اعظمی کا ارادہ اس کتاب کو شائع کرنے کا نہ تھا، اس لئے اس دور میں شائع نہیں ہوئی، اور جب مولانا کے زمانہ میں یہ کتاب شائع نہیں ہوئی تو اب اس زمانہ میں اس کی اشاعت نہیں ہونی چاہئے تھی۔

ممکن ہے کہ مولانا کو یہ خیال ہو کہ اس وقت کتاب کی اشاعت اس لئے مناسب نہیں ہے کہ برادرانہ چپقلش نہ پیدا ہو جائے، اور بحث ومباحثہ کا دروازہ نہ کھل جائے لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ مولانا کی بہت سی چیزیں ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہیں، مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو آہستہ آہستہ مولانا کی تحقیقات کو شائع کر رہا ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔

ردالملام عن وجہ تحقیق الکلام

امام کے پیچھے مقتدی کے قرأت (قرأت خلف الامام) کے مسئلہ پر مشہور اہلحدیث عالم مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری نے تحقیق الکلام کے نام سے ایک

کتاب تصنیف کی تھی، یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع اور نہایت محقق بھی ہوتی ہے، مولانا مبارکپوری نے اس میں بہت شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے انہوں نے اپنی کتاب کے دو حصے کیے ہیں، پہلے حصے میں اپنے مسلک کو دلائل سے مدلل کیا، اس پر ہونے والے اعتراضات وایرادات کا دفعیہ کیا، اور دوسرے حصے میں حنفیہ کے دلائل کا تجزیہ کیا اور انکا جواب دیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے کاغذات میں ایک تحریر دستیاب ہوئی، یہ تحریر دراصل مولانا مبارکپوری کی کتاب 'تحقیق الکلام' کا جواب تھی، یہ تحریر ۱۳۳۳ھ کی لکھی ہوئی تھی۔ مولانا اعظمی ۱۳۳۰ھ میں فارغ ہوئے اور ۱۳۳۳ھ میں 'تحقیق الکلام' کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، لیکن مولانا یہ کتاب مکمل نہ کر سکے۔ البتہ یہ کتاب ناقص ہی سہی مولانا اعظمی کے قلمی مسودات میں محفوظ تھی۔ مولانا کی یہ نامکمل کتاب احباب اور اہل علم کی خواہش پر مجلہ 'المآثر' میں 'حدر الظلام عن وجه تحقیق الکلام' کے نام سے قسط وار شائع ہو رہی ہے، اب تک اس کی چار قسطیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

مولانا اعظمی نے جواب میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا، جس ترتیب پر مولانا مبارکپوری نے اپنی کتاب تصنیف کی تھی، یعنی انہوں نے بھی دو حصے کیے پہلے حصہ میں احناف کے دلائل ذکر کیے اور فریق مخالف کے اعتراضات کے جوابات دیے۔ اور دوسرے حصے میں 'تحقیق الکلام' کے پہلے حصہ پر کلام کیا۔ مولانا نے محدثانہ رنگ میں قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری نے احناف کے جن دلائل کو روایۃً یا مضمون حدیث پر کلام کر کے مشتبہ اور ناقابل قبول قرار دیا تھا، مولانا اعظمی نے اصول حدیث، مضمون حدیث اور متن حدیث کی رو سے ان دلائل کو مضبوط ترین اور مستحکم دلائل قرار دیا۔ اصول حدیث سے مولانا مبارکپوری کے انحراف کرنے پر ان کی گرفت کی اور اپنی اس تنقید پر اصولیین اور نقاد حدیث کی

آراء پیش کیں۔

مولانا نے آیت شریفہ "واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون" (اعراف) سے استدلال کیا، اور اس آیت کے سبب نزول کو بیان کیا، متن قرآن و الفاظ حدیث سے کیا مراد ہوگی اور کسی آیت کا سبب نزول کیوں معلوم کیا جاتا ہے، ان تمام پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"کسی آیت کا سبب نزول معلوم کرنے کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے آیت کی مراد سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آیت کا حکم اسی سبب نزول کے ساتھ خاص ہے، صرف علمائے حنفیہ ہی نے نہیں بلکہ محققین شافعیہ و مالکیہ نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ آیت یا حدیث کا سبب کوئی خاص چیز ہو، لیکن الفاظ آیت و حدیث عام ہوں تو وہ الفاظ جن جن صورتوں کو شامل ہونگے، ان سب پر آیت یا حدیث کا حکم نافذ ہوگا۔"[1]

مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں علامہ ابن عربی مالکی کی احکام القرآن، علامہ سیوطی شافعی کی اتقان اور فتح الباری کا حوالہ دیا ہے۔ بہرحال یہ رسالہ نہایت ہی محققانہ و محدثانہ انداز میں لکھا گیا ہے، اگر یہ کتاب مکمل ہوتی تو حنفیہ کے لئے قرأت خلف الامام کے موضوع پر اہم کتاب ہوتی، تاہم جو کچھ مواد سردست اس میں ہے، وہ بہت ہی اہم اور کارآمد ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی یہ کتاب مجلہ المآثر ج ۲ ش ۴، ج ۳ ش ۱، ۲، ۳ میں قسط وار شائع ہوئی ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

---

[1] المآثر ج ۳ ش ۲ ص ۳۱-۳۲

فتاوی

مولانا الاعظمی معتبر فقیہ و مفتی سمجھے جاتے تھے اس لئے کوئی بھی اہم مسئلہ ہو اس کی طرف رجوع کیا جاتا، رویت ہلال کے مسئلہ پر قرب و جوار کے علاقوں میں ان کا فیصلہ آخری فیصلہ مانا جاتا۔ دور دراز علاقوں سے لوگ اپنے مسئلہ کا حل پوچھتے۔ مولانا کے ارد گرد دینی مسائل پوچھنے والوں کی ایک بھیڑ جمع رہتی، اطراف ملک سے استفتاء آتے اور مولانا اعظمی ان کا تحریری جواب دیتے، استفتاء کا جواب لکھنا ان کے معمول (Routine) میں تھا۔

مولانا اعظمی کے نام ہمیں بہت سے ایسے خطوط ملتے ہیں، جن میں اہل علم حضرات فقہی مسائل میں کسی رائے معلوم کرتے نظر آتے ہیں، یا اپنی رائے کی صحت و عدم صحت پر مولانا کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

مولانا کے فتاوی کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے، اور ان کی حفاظت کا اہتمام بھی حتی الامکان کیا جاتا، لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ مولانا اعظمی کے علمی سرمایہ پر دو حادثے گذرے، انہوں نے لکڑی کے ایک صندوق میں اپنے کاغذات اور مسودات رکھے تھے، لیکن جب کچھ عرصہ بعد صندوق کھولا گیا تو سارے کاغذات دیمک کی نذر ہو چکے تھے۔

اسی طرح ایک الماری میں قلمی مسودات و مخطوطات رکھے ہوئے تھے کہ ایک چنگاری صاعقۂ محرقہ ثابت ہوئی، اور علم کے بیش بہا خزینہ کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ڈاکٹر مسعود احمد کے بقول

"اس میں خدا جانے کیا کچھ ضائع ہوا ہوگا، قیاس یہ ہے کہ ان میں

مسودات و مخطوطات کے علاوہ آپ کے فتووں کا ذخیرہ بھی تھا۔[1]

خوش قسمتی سے مولانا اعظمی کے کچھ فتوے الحمد للہ محفوظ رہ گئے ہیں، جنہیں المآثر نے شائع بھی کیا ہے، یہاں مجلہ المآثر (ج ۲ ش ۱) کے حوالے سے صرف ایک فتوی ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے

سوال: ایک عورت کا شوہر لاپتہ ہو گیا مثلاً پانچ برس اس طرح پر کہ تلاش کرنے پر بھی پتہ نہیں چلتا، اب وہ عورت کتنی مدت انتظار گذارنے کے بعد نکاح ثانیہ کرے گی۔ اگر اس عورت کو بعد نکاح ثانیہ اولاد ہوئی اور پہلا شوہر جو مفقود تھا آیا اور اس نے اپنی بی بی کا دعوی کیا، اب وہ عورت شریعت کی رو سے کس کی ہوگی اگر پہلا شوہر ناراض رہا تو وہ عورت آخرت میں قابل بخشش ہوگی یا نہیں۔ جواب مع حوالہ کتاب سے مطلع فرماویں گے۔

جواب: ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ (کذا) کے قول میں مفقود کی بیوی کو اس وقت تک انتظار کرنا چاہئے جب تک اس کے شوہر کے ہم عمر لوگ مر نہ جائیں اور اس کو نوے سال کی مدت کے ساتھ مقدر کیا ہے، لیکن امام مالک کے قول میں چار برس گزرنے کے بعد عورت چار مہینہ دس دن عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے اور ہمارے علماء نے بھی بوقت ضرورت اس قول پر فتوی دینے کی اجازت دی ہے۔ لو افتی به فی موضع الضرورة لا بأس به. (شامی ج ۳ ص ۳۴۰)

اگر مفتی موضع ضرورت میں اس قول پر فتوی دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

[1] حیات ص ۲۹۱

اگر اتنی مدت کے بعد کسی عورت نے نکاح کرلیا اور بچے پیدا ہوئے،
پھر پہلا شوہر آگیا تو اولاد دوسرے شوہر کی قرار دی جائے گی اور بیوی
پہلے شوہر کی طرف رجوع کرے گی۔ ان زوجته له والأولاد للثاني
ج:۲ص ۳۴۲ بیشک بیوی پہلے شوہر کی ہوگی اور اولاد دوسرے شوہر کی۔
پس معلوم ہوا کہ پہلے شوہر کی واپسی کے بعد دوسرے کے پاس رہنا
عورت کو جائز نہیں گنہگار ہوگی، یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ چار برس سے
پہلے اگر نکاح کیا ہے تو نکاح ناجائز ہے۔

ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی مد
جمادی الاخری ۱۳۷۰ھ

فقہی مضامین ومقالات

جن مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ومقالات میں مولانا فقہی مباحث ہے، ان کی ایک اجمالی فہرست حیات ابوالمآثر، مجلہ المآثر اور مختلف رسائل کے حوالے سے پیش کی جارہی ہے:

۱- اسلامی پرسنل لاء میں باب کفو (المآثر ج ۸ ش ۱ محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۰ھ)

۲- تبصرہ بر حقیقۃ الفقہ

۳- تحقیق حکم الطلقات الثلاث

۴- تصویر لکھنے سے نہی کی حکمت

۵- تطہیر الجنجسین بجواب تکفیر المبتدعین

۶- تعاقب بر فتوی مفتی محمود حسن

۷- تقبیل بہائمین (المآثر ج ۳ ش ۴ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ)

۸- چند مسائل فقہیہ پر شبہات اور انکا ازالہ

۹- حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل

۱۰- دلائل فرضیت جمعہ

۱۱- رمضان میں تہجد باجماعت

۱۲- رویت ہلال

۱۳- فقہ نبوی کے نوٹ

۱۴- فی التنفل بعد الوتر (المآثر مئی تا جولائی اور اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

۱۵- قتل مرتد

۱۶- مسافت قصر

۱۷- مسئلہ اطاعت امیر اسوۂ حسین کی روشنی میں (ضیاء الاسلام ۲۲ر فروری ۱۹۳۹ء)

۱۸- مسئلہ تفویض اور ایک وکیل کا دخل در معقولات (ضیاء الاسلام ۱۹۳۹ء، ۶ قسطوں میں)

۱۹- مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ (القاسم ۲۵ر اپریل ۱۹۲۳ء)

۲۰- مسلم پرسنل لا یا اسلامی شریعت (ابلاغ مئی ۱۹۷۲ء)

۲۱- رمضان کا چاند

۲۲- الحجج القویہ علی حرمۃ سجدۃ التحیہ

۲۳- موضوعات القصص (دار العلوم ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)[1]

☆ ☆ ☆

[1] ان مضامین کے علاوہ متعدد ایسے مضامین و مقالات ہیں، جن میں مولانا عثمانی نے اہلحدیث حضرات کا رد کرتے ہوئے فقہیات بحث کی ہے۔ ان مضامین کی فہرست 'مناظرہ' کی فصل میں 'رد اہلحدیث' عنوان کے آخر میں دی گئی ہے۔

مناظرہ

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا علم مضبوط، ذہن برق رفتار، دماغ حاضر جواب اور قلم پختہ تھا۔ مولانا نے حدیث کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ انہیں خوبیوں کی رہین تھیں۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو کسی شخص کو بے باک مناظر بنا دیتی ہیں۔ مولانا الاعظمی نے سن شعور کے مدارج کو طے کرتے ہوئے ایسے وقت میں علم وفن کے دروازہ پر دستک دی جب پورے ہندوستان میں مختلف مذاہب، مسالک اور فرقوں کے درمیان مناظروں، مجادلوں اور بحث ومباحثہ کا بازار گرم تھا۔

مولانا ماحول سے متاثر ہوئے، وقت کا تقاضا دیکھا اور دین وشریعت کی حفاظت کی خاطر اس محاذ پر کمربستہ ہوگئے۔ مولانا نے تقریری تحریری دونوں طرح کے مناظرے کئے۔ تحریری مناظرے خاص طور سے شیعیت، غیر مقلدیت اور بریلویت کے خلاف ہیں۔

مولانا اعظمی نے منکرین حدیث کے خلاف بھی ایک مستقل کتاب "نصرۃ الحدیث" کے نام سے تصنیف کی، جس کا تعارف "حدیث" کے عنوان کے ذیل میں پیش کیا جاچکا ہے۔ مناظرے کی مجلسوں میں کہیں مولانا نے باقاعدہ تقریر کی تو کہیں پر آپ کی حیثیت سرپرست اور مرجع کی رہی۔ مولانا اعظمی کے ساتھ مناظرے کی مجلسوں میں اکثر مولانا عبداللطیف نعمانی بھی شریک رہا کرتے تھے۔[1]

---

[1] تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی ص ۱۶

آئندہ صفحات میں مولانا کی مناظرانہ تحریروں کو پیش کیا جارہا ہے، جو علمی، تنقیدی اور مناظرانہ نقطۂ نظر سے ایک اہم تراث ہیں۔

ردشیعیت

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے شیعیت یا رافضیت کے رد و ابطال میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، شیعیت کی بیخ کنی اور اس کے اثرات کو مٹانے میں آپ کی گرانقدر خدمات قابل ذکر ہیں۔ شیعیت کے رد میں مولانا کے کارناموں کی شہادت خود ان کی تصنیفات، رسائل اور مضامین سے ملتی ہے۔

شیعہ حضرات کے ساتھ مولانا الاعظمی کے تقریری مناظرے کا کوئی تحریری ثبوت راقم الحروف کی نگاہ سے نہیں گزرا، البتہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی جانب کے دو خط ضرور ملتے ہیں، جن کے ذریعہ مولانا سیوہاروی نے مولانا حبیب الرحمن صاحب کو انصاری شیعہ عالم کے خلاف تقریر کی دعوت دی تھی۔ شیعہ عالم نے برادری کی بنیاد پر شیعیت کی تبلیغ شروع کی تھی، چنانچہ بعض سنی اس تبلیغ سے متاثر بھی ہوئے۔ مولانا اعظمی کو سیوہارہ یا امروہہ تقریر کے لئے بلائے جانے میں ایک خاص مصلحت یہ بھی تھی کہ مولانا کا تعلق بھی اسی برادری سے تھا۔ لیکن مولانا سیوہارہ یا امروہہ تقریر کے لئے گئے یا نہیں، اس کی تصریح نہیں ملتی، ڈاکٹر مسعود احمد بھی حیات ابوالمآثر میں ان دو مکتوبوں کو نقل کرکے خاموش نظر آتے ہیں۔

امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی سے مولانا اعظمی کا خاص تعلق تھا، ہم آئندہ کسی مناسب موقع پر اس کا تذکرہ کریں گے۔ مولانا عبدالشکور صاحب کی روافض کے خلاف خدمات اور نمایاں کارناموں سے عوام وخواص بخوبی

واقف ہیں، ان کا رسالہ ''النجم'' تو ردشیعیت کے لئے ہی وقف تھا۔

چنانچہ اس کا اثر امام اہلسنت کے رفیق مولانا اعظمی پر بھی پڑا اور انہوں نے بھی شیعیت کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ مولانا اعظمی نے رد رفض وشیعیت کے خلاف متعدد رسائل مولانا فاروقی کے ہی ایماء اور فرمائش پر تصنیف فرمائے۔ چنانچہ اب ہم ردشیعیت میں مولانا کی بعض مناظرانہ تحریروں کو پیش کرتے ہیں۔

دفع المجادلہ عن آیۃ المباہلہ

شیعہ حضرات نے واقعہ مباہلہ کو ایک الگ تناظر میں دیکھا اور اس وجہ سے اسے غیر معمولی اہمیت دی، آیت مباہلہ سے حضرت علیؓ کی دیگر صحابہ پر افضلیت اور آپ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور ایک ایسا بھی دور آیا کہ بعض کے شیعہ ''عید مباہلہ'' بھی منانے لگے اور اسطرح ایک نئی عید کا اضافہ ہوگیا۔ بعض سنیوں نے بھی اس انوکھی رسم میں حصہ لیا اور اس کو قرآن وسنت کے مطابق سمجھا۔

''عید مباہلہ'' کے سد باب کے لئے مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے آیت مباہلہ کی تفسیر لکھی اور یہ واضح کیا کہ آیت مباہلہ سے صحابہ پر حضرت علیؓ کی افضلیت اور ان کے خلیفہ بلافصل ہونے کا قطعی کوئی ثبوت نہیں ملتا، جو لوگ ایسا کہتے ہیں، وہ آیت مباہلہ کے صحیح مفہوم کو مسخ کرتے ہیں۔ مولانا نے یہ بھی واضح کردیا کہ نبی کریم علیہ السلام کی قائم کردہ دو عیدوں کے سوا اور کوئی عید نہیں ہے۔

سنی عالم کی آیت مباہلہ کی اس تفسیر کا شیعی عالم مولانا اعجاز حسن بدایونی نے رد کیا اور ''برہان مجید'' کے نام سے اس کو شائع کیا۔ ان کا اصرار اسی پر رہا کہ آیت مباہلہ سے حضرت علیؓ کی صحابہ پر افضلیت اور ان کی خلافت بلافصل کا ثبوت ملتا ہے۔

ے المآثر اگست تا اکتوبر ۱۹۹۸ء ص ۸۲

فضیلت علی کو کسی صریح حدیث سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مجادلہ جس کی عبارت اور
اس پر مولانا عبدالشکور صاحب کی طرف سے مولانا اعظمی نے جو بات ہے یک ،،
نمونے پیش خدمت ہیں

۱۔ (مجادلہ) الفاظ آیت مباہلہ کے معانی یہی حضرات ہیں ان کے علاوہ اصحاب
وازواج میں سے کوئی بھی مراد نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اصحاب
وازواج میں سے کسی نے اس کا دعویٰ نہیں کیا ورنہ ان حضرات کی زبانی ان کا دعویٰ کرنا
ثابت کیا جائے۔

(دفع) اصول تفسیر سے ثابت کیجئے کہ کسی آیت کے مصداق کے لئے اس کی بھی
ضرورت ہے کہ مصداق خود دعویٰ کرے کہ میں اس آیت کا مصداق ہوں، پھر اس
تعیین دعویٰ اور تعیین مصداق میں تلازم ثابت کیجئے، اس کے بعد ہم سے یہ مطالبہ پورا
کیجئے۔ آیہ تطہیر کے متعلق بھی اہل عباء کا دعویٰ خود ان کی زبانی ایسی روایات سے
ثابت کیجئے کہ جس پر شیعہ سنی دونوں متفق ہوں۔

۲۔ (مجادلہ) دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور ختم الانبیاء نے اپنے اصحاب وازواج کو ہمراہ نہ
لے کر اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں سے کوئی مصداق آیت نہیں۔

(دفع) اول تو یہی غلط ہے کہ اور کوئی ہمراہ نہ تھا، اور اگر آپ اپنے قول پر مصر ہیں تو آپ
اپنے امام معصوم (امام باقر) کی تکذیب کر رہے ہیں۔ ثانیاً مباہلہ کا واقعہ نہیں ہوا اس
سے قبل اور وقت کسی کو ہمراہ لینے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہی مصداق آیت ہے
ہاں اگر مباہلہ ہوتا اور کوئی ساتھ نہ ہوتا تو ممکن تھا۔

۳۔ (مجادلہ) تیسری دلیل قول جابر انصاری ہے جو موقع پر حاضر تھے۔ قال جابر
انفسنا رسول الله ﷺ و علی و نساءنا فاطمة و ابناءنا الحسن
والحسین

(دفع) اولاً جابر کی طرف اس قول کی نسبت پر کلام ہے۔ ابن کثیر میں ہے ھکذا
رواه الحاكم في مستدركه (الى قوله) وقد رواه أبو داؤد الطيالسي
عن شعبة عن المغيرة عن الشعبي مرسلاً وهذا اصح۔ ثانیاً جب حضرت
جابر موقع پر حاضر تھے تو آپ نے دوسری دلیل میں یہ کیسے کہدیا کہ حضور نے اور کسی کو
ہمراہ نہ لیا ۱

"دفع المجادلہ" مناظرانہ تکنیک سے پیش ایک علمی کتاب ہے۔ زبان درجہ
تقاضائے مناظرہ کے مطابق کہیں گرم کہیں نرم ہے، لیکن اس کے باوجود آیت مباہلہ کی
تفسیر وتشریح کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس کی اہمیت اس لئے
مزید بڑھ جاتی ہے کہ یہ کتاب اس کتاب کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، جس میں
اس آیت سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کئے گئے ہیں۔

چنانچہ "دفع المجادلہ" میں آیت مباہلہ سے متعلق سنیوں پر جو اعتراضات کئے
جاتے ہیں ان کا اطمینان بخش جواب موجود ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل "دفع المجادلہ"
مطبع عمدۃ المطابع لکھنؤ میں چھپ کر "النجم" کے صفحات پر شائع ہوئی۔ "دفع المجادلہ"
شیعوں کے رد میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی غالباً پہلی تصنیف ہے، جیسا کہ اس کا
اشارہ حیات ابوالمآثر کے مصنف کے اس جملہ سے ملتا ہے۔

"آگے چل کر علامہ اعظمی نے شیعوں کے رد وابطال میں جو عظیم
الشان کارنامے انجام دیئے، یہ کتاب گویا اس کا دیباچہ ہے۔" ۲

خیر یہ پہلی تصنیف ہو یا نہ ہو، مگر ماہر فن کی تصنیف ضرور معلوم ہوتی ہے۔

۱۔ دفع المجادلہ ص ۱۹۔ ۲۰

۲۔ حیات ص ۱۵۳

تنبیہ الکاذبین بجواب تنبیہ الناصبین

اہل سنت وجماعت کی طرف سے بعض ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں جن میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ شیعوں کا ایمان قرآن پر نہیں ہے۔ اور یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اگر قرآن پر ایمان ہے تو شیعہ اسے ثابت کریں۔

جواب میں ۱۳۲۲ھ میں لاہور کے شیعی مجتہد جناب حائری صاحب نے ایک رسالہ 'موعظہ تحریف قرآن' تحریر فرمایا۔ اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآں کے محرف اہلسنت وجماعت ہیں۔ اس کے جواب میں سنیوں کے ایک مقتدر عالم جناب مولانا عبدالشکور صاحب نے رسالہ 'تنبیہ الحائرین' تحریر فرمایا۔

شیعہ جماعت کی جانب سے جناب مولانا اعجاز حسن بدایونی نے 'تنبیہ الحائرین' کا جواب 'تنبیہ الناصبین' کے نام سے تحریر کیا۔ 'تنبیہ الناصبین' سے قبل اعجاز حسن بدایونی نے قرآں سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا، جس کا رد ۱۳۴۱ھ میں 'النجم' میں بعنوان 'مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب' شائع ہوا تھا۔

شیعی عالم اعجاز حسن نے اپنی کتاب 'تنبیہ الناصبین' میں 'النجم' میں شائع مضمون اور 'تنبیہ الحائرین' مؤلفہ مولانا عبدالشکور صاحب دونوں کا جواب دیا ہے۔ اور یہی موقف اختیار کیا ہے کہ سنی حضرات قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔

پھر یہ جواب الجواب کا سلسلہ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی تک پہونچا ہے۔ انہوں نے 'تنبیہ الناصبین' کا جواب 'تنبیہ الکاذبین' تحریر فرمایا۔ مولانا الاعظمی نے اعجاز حسن بدایونی کے 'درنجف' میں شائع مضمون اور اس پر 'النجم' کے جوابی مضمون اور اس جوابی مضمون پر مولانا اعجاز حسن بدایونی کے جواب 'تنبیہ الناصبین' ان

تمام کو سامنے رکھ کر اپنا جوابی رسالہ مرتب فرمایا ہے۔

مولانا اعظمی نے "تنبیہ الکاذبین" کے ابتدائی حصہ میں اہلسنت والجماعت کے تحریف قرآن سے متعلق شیعوں کی طرف سے پیش کی جانے والی تمام تحریروں کا اجمالی رد کیا ہے۔ اور قرآن کریم کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان فرماتے ہوئے لکھا کہ ہمارے واضح عقیدۂ قرآن کی شہرت تو یہاں تک ہے کہ خود شیعہ مصنفین نے ہی اس کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

"اہل سنت مصحف عثمانی کو قرآن کامل سمجھتے ہیں اور اس کے ناقص ماننے والوں کو کافر کہتے ہیں۔ شیعوں کے قبلہ مولوی حامد حسین صاحب استقصاء الافحام مجلد اول ص ۹ میں لکھتے ہیں "مصحف عثمانی کہ اہل سنت آں را قرآن کامل اعتقاد کنند ومعتقد نقصان آں را ناقص الایمان بلکہ خارج از اسلام پندارند[1]

مولانا نے اپنے عقیدہ کے ثبوت میں قرآن مجید اور حدیث شریف سے دلائل وشواہد پیش کئے۔ اسی کے ساتھ یہ دعوی بھی کیا کہ سنیوں کی کتابوں میں تحریف قرآن کی ایک بھی روایت نہیں مل سکتی اور نہ ہی کسی سنی عالم کا قول مل سکتا ہے۔ برخلاف شیعوں کے کہ ان کے معتقد تحریف ہونے کے سلسلہ میں دلائل قاطعہ ورنا قابل انکار شواہد پیش کئے جاسکتے ہیں۔ لگے ہاتھوں مولانا نے یہ چیلنج بھی دے ڈالا کہ،

"شیعوں کے مذہب میں بھی کچھ دم ہو تو ایسے ہی دلائل اپنی حق شہادتیں سنیوں کے خلاف پیش کریں۔"[2]

[1] تنبیہ الکاذبین (نجم محرم ۱۳۵۳ھ ص ۶۱)
[2] ایضاً ص ۵۷

مولانا نے اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر تحریف قرآن سے متعلق شیعوں کی معتبر مذہبی کتابوں سے چند روایتیں بھی پیش کی ہیں، ان میں سے تین روایتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں

۱۔ تفسیر صافی میں بحوالہ تفسیر عیاشی امام باقر سے منقول ہے لولا انه زيد في القرآن ونقص ما خفي حقنا على ذي حجى (اگر قرآن میں بڑھایا یا گھٹایا نہ گیا ہوتا تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ ہوتا۔)

۲۔ بحوالہ سابق ولو قرئ القرآن كما أنزل لوجدتنا فيه مسمين (اگر قرآن اسی طرح پڑھا جائے جس طرح نازل ہوا ہے تو ہمیں تم قرآن میں ہمارے نام پاؤ گے۔)

۳۔ احتجاج طبرسی میں حضرت علیؓ سے منقول ہے انهم اثبتوا في الكتاب مالم يقله الله ليلبسوا على الخليقة (ان منافقوں نے قرآن میں وہ باتیں درج کیں جو اللہ نے نہیں فرمائی تھیں تاکہ مخلوق کو فریب دیں۔)[۱]

مولانا الاعظمی نے 'تنبیہ الناصبین' کو 'تنبیہ الحائرین' کا جواب تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے کیونکہ مولانا کے مطابق 'تنبیہ الحائرین' کے اس حصے کا جس میں شیعوں کی مذہبی کتابوں سے عقیدۂ تحریف قرآن کا ثبوت اور ان کے علماء کے اقرارات پیش کئے گئے ہیں، اس کے ایک لفظ کا بھی جواب نہیں دیا گیا ہے۔ اس میں تو صرف 'النجم' میں شائع مضمون کا جواب دیا گیا ہے۔ اور تنبیہ الحائرین کی بعض عبارتوں کا ذکر کرکے اسے 'تنبیہ الحائرین' کی بحث دوم کا جواب قرار دیا گیا اور اس کی بحث اول کے جواب کو 'تنبیہ الناصبین' کے حصہ دوم پر ٹال دیا گیا۔

لیکن افسوس کہ مولانا اعجاز حسن بدایونی کا اسی دوران انتقال ہوگیا اور اسی

۱۔ تنبیہ لکاذبین (النجم محرم ۱۳۵۲ھ ص ۵۵)

کے ساتھ 'تنبیہ الناصبین' کے دوسرے حصے کی اشاعت کی امید بھی ختم ہوگئی۔ دوسری جانب مولانا اعظمی بڑی پختگی اور پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

"تنبیہ الحائرین کی بحث اول کا جواب کسی شیعہ کے امکان میں نہیں ہے۔"[1]

جہاں تک 'تنبیہ الناصبین' کی بات ہے تو مولانا اعجاز حسن صاحب بدایونی اس کتاب میں 'النجم' یا 'تنبیہ الحائرین' کی عبارتیں نقل کرنے میں زیادہ اہتمام برتتے نظر نہیں آتے، حالانکہ کسی کا رد یا جوابی مضمون تحریر کرنے میں یہ ایک لازمی عنصر ہے اور اگر نقل بھی کرتے ہیں تو بہت سوچ سمجھ کر!

لیکن مولانا حبیب الرحمن اعظمی میں اس کا خاص اہتمام دکھتا ہے۔ انہوں نے "تنبیہ الناصبین" کے رد 'تنبیہ الکاذبین' میں اعجاز حسن بدایونی کی عبارتیں نقل کر کے جواب دیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قاری کو اس کی وسعت علم وفہم کے مطابق براہ راست اخذ معانی ومطالب کا موقع ملتا ہے۔

چونکہ اعجاز حسن بدایونی نے سخت ترین انداز تحریر اپنایا تھا (النجم کو گرگٹ کہا، فسادی کہا وغیرہ وغیرہ) اس لیے مولانا کے یہاں بھی وہ مجادلانہ اسلوب نگارش تو نہیں البتہ جوابی مضمون کی وجہ سے کہیں کہیں ترکی بہ ترکی جواب کی نوبت آگئی ہے۔ لیکن اتنا کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ 'تنبیہ الکاذبین' سنیوں پر شیعوں کے تحریف قرآن کے الزامات کا محققانہ اور مضبوط رد ہے۔ مولانا اعظمی کا یہ رسالہ 'النجم' لکھنؤ ۱۳۵۲ھ میں جلد ۱۱ شمارہ ۱، ۵، اور ۶ میں شائع ہوا۔

---

[1] تنبیہ الکاذبین (النجم محرم ۱۳۵۲ھ ص ۵۳)

ارشاد الثقلین

اہلسنت و جماعت کا عقیدہ ہے کہ صحابہ وخلفاء کی بزرگی کا قائل ہے۔ جو ان کی دینداری وتقدس کو شک کی نگاہ سے دیکھنا اور اس میں عیب نکالنا، خود ذات قدسی ﷺ کے دامن تقدس کو داغدار کرنا ہے۔

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا۔ اس میں انہوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعدد اقوال و افعال سے جو شیعہ حضرات کی معتبر کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، ثابت کیا کہ خلفاء ثلثہ کی نسبت جس تقدس و بزرگی کے اہلسنت قائل ہیں بعینہ وہی حضرت علیؓ کے اقوال و فعل سے بھی ثابت ہے۔ مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنے اس رسالہ کا نام ہی "ابوالائمہ کی تعلیم" رکھا۔

چونکہ اس رسالہ میں خلفاء راشدین کی تعظیم اور ان کے برحق ہونے کی حمایت کی گئی تھی، اس لئے شیعہ حضرات کی جانب سے اس رسالہ کا رد لکھا گیا۔ چنانچہ 'ابوالائمہ کی تعلیم' کے جواب میں امامیہ مشن کی طرف سے مولانا علی نقی صاحب نے 'اتحاد الفریقین' تحریر فرمایا۔ اس رسالہ میں انہوں نے حضرت علیؓ کی خلفاء ثلثہ سے ناراضگی کو ثابت کیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اہلسنت و جماعت کی جانب سے طفیلی رسالہ 'اتحاد الفریقین' کے جواب میں 'ارشاد الثقلین بجواب اتحاد الفریقین' تحریر فرمایا۔ مولانا نے سب سے پہلے 'اتحاد الفریقین' کے مضامین کی تلخیص پیش کی ہے، جو یہاں لفظاً نقل کی جا رہی ہے۔

حضرت امیر کی خلفائے ثلثہ سے ناراضگی اور ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے کو شیعہ

کے ساتھ علمائے اہلسنت بھی بیان کرتے ہیں۔

۲- ائمہ کے اقوال کا وہ مطلب نہیں ہے جو ابو رشتہ کی تعلیم میں ظاہر کیا گیا ہے بلکہ ان کا دوسرا مطلب ہے۔

۳- ائمہ کے افعال تقیہ پر محمول ہیں۔[1]

مولانا اعظمی نے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بحث کی ہے

(۱) شیعہ مصنف کے پہلے دعوی کی حقیقت (۲) واقعۂ نکاح ام کلثومؓ سے انکار (۳) جنگ فارس کے موقع پر حضرت علیؓ کا حضرت عمرؓ کو مشورہ دینا (۴) مشورۂ غزوۂ روم (۵) اہل حل وعقد کی بیعت سے خلیفہ وامام کا تقرر (۶) افضلیت شیخین باعتراف علی (۷) حضرت معاویہؓ کے حق میں دریدہ دہنی (۸) جناب امیرؓ کا نکو رہ اقتدا (۹) تقیہ کا جواز

ان کے علاوہ ذیلی عنوانات بھی قائم کیے گئے ہیں اور پوری تفصیل کے ساتھ زیر بحث مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولوی علی نقی لکھتے ہیں کہ حضرت امیر خلفائے ثلاثہ سے برابر ناراض رہے اور ان کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا، حضرات اہلسنت بھی اس عقیدہ میں متحد ہیں۔ شیعہ مصنف اپنے اس دعوی کے لئے دلیل کے طور پر روضۃ الصفا، عقد الفرید، ابن ابی الحدید کی شرح نہج البلاغہ سے تین عبارتیں پیش کیں۔

مولانا اعظمی کو مولانا علی نقی کے اس دعوی اور ان کے پیش کردہ دلائل میں کلام ہے۔ مولانا اعظمی کا کہنا ہے کہ ابن ابی الحدید شیعی ومعتزلی ہے لہذا اہلسنت کے مسئلہ میں اس کا نام لینا خیانت ہے، عقد الفرید کی ادبی حیثیت ہے تاریخی حیثیت سے قطعاً قابل اعتبار نہیں، روضۃ الصفا کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کسی سنی عالم نے اس

---

[1] ارشاد الخلیص (النجم شوال ۱۳۵۹ھ ص ۳)

نا معتبر تاریخ نہیں شمار کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ گروہ ولی معتبر تاریخ بھی ہو تو اس کا وہ بیان جو قرآن کی نصوص اور فریقین کی روایات صحیحہ کے خلاف ہے کسی درجہ میں لائق التفات نہیں ہو سکتا۔ مولانا اعظمی سید العلماء علی نقی پر اس سلسلہ میں ابن خلدون وغیرہ کی عبارتوں میں قطع و برید کا الزام لگاتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہاں ابن خلدون وابن اثیر کے حوالے سے آپ نے جو لکھا ہے وہ بیشک قابل توجہ ہے لیکن مجھے افسوس کے ساتھ آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے نقل عبارت میں بڑی خیانت سے کام لیا ہے، عبارت کا صرف درمیانی حصہ نقل کر دیا اور اس کا آخری حصہ جس میں صاف مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے شیخین کی خلافت کو خوشی سے تسلیم کر لیا، حذف کر دیا۔ پوری عبارت ملاحظہ ہو ثم تکلم بعد الحمد لله والثناء وهداية الناس بمحمد ﷺ وخلافة الشيخين وحسن سيرتهما وقد وجدنا عليهما ان توليا ونحن اقرب منهما الى الرسول ﷺ لكن سمحنا لهما بذالك (ابن خلدون جلد سوم ص ۷)

ترجمہ پھر حضرت علیؓ نے حمد و ثنا، اور آنحضرت ﷺ کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت پانے اور شیخین کی خلافت اور ان کے حسن سیرت کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ کہا کہ ہم شیخین کی اس بات پر رنجیدہ ہوئے کہ وہ متولی خلافت ہوئے باوجودیکہ ہم ان کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ سے زیادہ قریب تھے لیکن پھر بھی شیخین کے لئے ہم نے فیاض دلی سے اس حق کو تسلیم کیا۔"

مولانا الاعظمی نے اسی انداز پر سید العلماء علی نقی صاحب کا تعاقب کیا اور ان کی گرفت کی۔ طوالت کے اندیشہ سے 'ارشاد الثقلین' کی صرف ایک جھلک پر اکتفا کیا

۱۔ ارشاد الثقلین (الندی شوال ۱۳۵۹ھ ص ۵)

گیا ورنہ بحث تو ایسی دلچسپ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ فریقین کے مباحث کو مزید نقل کیا جائے۔ مولانا نے مندرجہ بالا عبارت کے بعد ابن خلدون کی ایک اور عبارت کا ذکر کیا جہاں شیعہ عالم نے حذف واخفاء سے کام لیا ہے۔ وہ تمام باتیں جو شیعہ عالم نے کہیں، جنکی تلخیص بھی شروع میں پیش کی گئی ہے، انہیں مولانا نے غلط، خلاف واقعہ اور بے دلیل قرار دیا۔ مولانا کا یہ رسالہ 'ارشاد الثقلین' مجلہ 'الداعی' لکھنؤ شوال، ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں قسط وار شائع ہوا۔

ابطال عزاداری

ایک شیعی عالم نے ایک رسالہ تصنیف کیا، اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تعزیہ داری اور اس کے جملہ متعلقات علماء اہلسنت کے نزدیک بھی صحیح اور درست ہیں، بلکہ کار ثواب ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کا نام ہی "عزاداری کی تاریخ اور اس کا ثبوت سنی نقطۂ نظر سے" رکھا۔

مصنف رسالہ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ایک میں عزاداری کی تاریخ اور اس کے پس منظر کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں علمائے اہلسنت کے اقوال اور تحریریں پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سنی علماء بھی اس کے قائل ہیں اور جو علماء تعزیہ داری کی مخالفت کرتے ہیں وہ سنی حنفی نہیں بلکہ وہابی ہیں۔

علماء اہلسنت کی جانب سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے "عزاداری کی تاریخ اور اس کا ثبوت سنی نقطۂ نظر سے" کے جواب میں "ابطال عزاداری" کے نام سے ایک ضخیم رسالہ تحریر فرمایا۔ مولانا نے بھی اپنے رسالہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا، پہلے حصہ میں انہوں نے شیعی رسالہ کے جزء اول کا خلاصہ پیش کیا

دلائل پر مختصر تبصرہ تحریر فرمایا، اسی حصہ میں شیعہ مؤلف کی مغالطہ آمیز تحریروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا رد بھی کیا۔ اور دوسرے حصہ میں مولانا نے تعزیہ داری کے عدم جواز کے سلسلہ میں عرب و عجم کے کبار علماء اہلسنت کے فتاوے اور تحریریں جمع کی ہیں۔

اس حصہ میں "کسی کی وفات پر گریہ و ماتم کا حکم" "سینہ کوبی وغیرہ کا حکم" "تجدید غم کے لیے مصیبت کو بالقصد یاد کرنا" "ترک زینت اور سوگ" "کیا تعزیت گریہ و بکا کا نام ہے؟" "نقش نعل شریف اور تعزیہ کا فرق" "تعزیہ کی تعظیم" جیسے عنوانات قائم کر کے تعزیہ داری سے متعلق جملہ امور کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔

اس رسالہ کا بنیادی مقصد اس چیز کی نفی کرتا ہے جس کو شیعہ عالم نے ثابت کرنا چاہا ہے یعنی تعزیہ داری کا اثبات سنی نقطہ نظر سے۔ مولانا کا ماننا ہے کہ عزاداری وغیرہ شیعہ فرقہ کی بدعت ہے اہل سنت والجماعت کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔

مولانا اعظمی کا شیعہ مؤلف پر ایک بنیادی اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے رسالہ کا نام تو "عزاداری کی تاریخ اور اس کا اثبات سنی نقطہ نظر سے" رکھتے ہیں لیکن جگہ جگہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں شیعہ مصنفین کا، مولانا نے اپنے اس دعوی کی دلیل میں صفحہ ۱۲ پر کاظم رازی، صفحہ ۱۳ پر حدائق اور دیگر صفحہ ۱۴ پر عبد اللہ زنجانی کی عبارتوں کا حوالہ دیا ہے۔[1]

شیعہ مصنف کی کچھ عبارتوں کی تلخیص اور ان پر مولانا کی تنقید و تبصرہ کی صرف ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے تاکہ فریقین کے انداز تحقیق کا کچھ اندازہ ہو سکے، شیعہ مصنف کے مطابق

۱- شہادت حسینؓ کے بعد عزاداری یعنی گریہ و ماتم کی ابتدا یزید کے گھر سے ہوئی۔ (ص ۵)

۲- حضرت حسین کی شہادت کے بعد سے تین سو برس تک عشرہ محرم میں رونے پیٹنے کی

---

[1] ابطال عزاداری (الداعی لکھنؤ جمادی الاخری [illegible] ص ۲۵)

رسم کا کہیں وجود نہ تھا، ۳۵۲ھ میں سب سے پہلے معز لدولہ دیلمی (شیعہ) نے صرف دسویں محرم کو بغداد میں حضرت کے ماتم کرنے کا حکم نافذ کیا اور اس کے بعد ۳۶۳ھ میں المعز لدین اللہ فاطمی نے مصر میں بھی حکم جاری کیا۔ (ص ۱۰-۱)

۲۔ مصر و ایران وغیرہ میں عزائے حسین صرف 'شیعان علی' سے مخصوص ہے۔ (ص ۹)

۳ ہندوستان کے سوا دنیا میں کہیں بھی تعزیے نہیں بنتے اور ہندوستان میں بھی ساتویں صدی تک اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ (ص ۳۰-۳۱) [1]

مولانا اعظمی مندرجہ بالا عبارتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے تمہیداً لکھتے ہیں

۱۔ یزید کے گھر سے اس کی ابتداء ہونے کا ذکر شیعوں کی نہایت معتبر و مستند کتابوں میں بھی ہے۔

۲۔ مولانا نے ناسخ التواریخ، مجمع، جلاء العیون کے حوالہ سے لکھا کہ خود یزید نے اپنی بیوی کو نوحہ وزاری کرنے کا حکم دیا۔

۳۔ معز الدولہ دیلمی نہایت غالی شیعہ بلکہ تبرائی رافضی تھا، جس کا شیعہ ہونا شیعی مصنفین و محققین کو بھی قبول ہے۔

۴۔ مولانا نے تاریخ الخلفاء کے حوالہ سے لکھا کہ المعز لدین اللہ جس نے مصر میں رسم ماتم کی بنیاد ڈالی تھی، ایک مجوسی النسل بے دین رافضی تھا۔ اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں

> "جس رسم کی بنیاد یزید نے ڈالی ہو اور معز الدولہ، المعز نے اس کو ترقی دی ہو ظاہر ہے کہ یک غیرت مند سنی کو اس سے جس قدر بھی نفرت ہو کم ہے، یہی وجہ ہے کہ مصر، شام اور ایران و افغانستان وغیرہ میں یہ رسم صرف شیعہ ادا کرتے ہیں۔" [2]

---

[1] ابطال عزاداری (امداد المطابع لکھنؤ) جمادی الآخری ۱۳۶۱ھ ص ۸-۱۹

[2] ایضاً ص ۲۰

حیرت ہے' حضرت حسینؓ سے محبت کا کیا یہی ثبوت ہے کہ جو رسم یزید کے گھر میں جنم لے، اسے جزو ایمان قرار دیا جائے؟ اور سنت رسول کے بجائے سنت یزید فروغ پائے' مولانا اعظمی نے عزاداری، تعزیہ سازی وغیرہ کے عدم جواز کے سلسلہ میں جن علماء و فقہاء اور مفتیان کرام کے فتاوے اور آراء جمع کئے ان کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں

(۱) شیخ ابن حجر مکی (۲) علامہ محمد طاہر پٹنی (۳) سید شریف سمہودی (۴) علامہ محمد حیات سندی ثم المدنی (۵) علامہ مقریزی (۶) شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۷) برہان الدین بخاری (۸) ابو الرجا زاہدی (۹) ملا احمد رومی (۱۰) شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (۱۱) سید احمد شہید (۱۲) مولانا الٰہی بخش (۱۳) مولانا خرم علی (۱۴) مولانا شاہ ابو الحسن نصیر آبادی (۱۵) مولانا سخاوت علی جونپوری (۱۶) مولانا محمد عباس بن ناصر علی مورخ بن علامہ فضل اللہ جائسی (۱۷) مولانا شاہ کرامت علی جونپوری (۱۸) مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی (۱۹) مولانا حکیم لطف اللہ مفسر لکھنوی (۲۰) مولانا نواب قطب الدین خاں دہلوی (۲۱) مولانا شہود الحق بہاری کا فتویٰ مع تائید مفتی سعد اللہ، مولانا ارشاد حسین رامپوری (۲۲) مولانا عبد الحی فرنگی محلی (۲۳) مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔

مندرجہ بالا علماء کی تصریحات و فتاویٰ کے بعد مولانا اعظمی نے مولانا روم کی مثنوی کے کچھ اشعار بھی پیش کئے، جن میں انہوں نے رسم ماتم کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے شیعہ عالم کے پیش کردہ بعض سنی علماء کے فتوے کا بھی ناقدانہ تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بعض علماء کی طرف جواز تعزیہ داری کے فتوے غلط منسوب ہیں، یا جو ایک دو ہیں بھی تو وہ قابل اعتناء نہیں یا ان علماء کے فتووں کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

مولانا عظمی کی تصنیف ''ابطال عزاداری'' مناظرانہ رنگ میں ایک علمی کتاب ہے۔ اگرچہ یہ رنگ کہیں کھلتا، کہیں دبتا نظر آتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی مصنف کے لئے مناظرانہ تحریر میں علم کی برد اور قلم کی عصمت و پاس بہت اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا نے علم کی سنجیدگی اور قلم کی گرفت دونوں برقرار رکھی ہے۔

'ابطال عزاداری' میں متفرق طور پر کچھ ایسی اہم باتیں یا نکات بھی ہیں جن کے بارے میں عوام کو مغالطہ ہے یا پھر انہیں معلوم نہیں۔ مناسب معلوم ہوا ہے کہ ان میں سے کچھ متفرق طور پر پیش کئے جائیں تاکہ اس کتاب کی علمی افادیت کا اندازہ ہو سکے، وہ نکات یہ ہیں:

۱-عزاداری بمعنی گریہ و ماتم کی ابتداء یزید کے گھر سے ہوئی۔

۲-تیمور لنگ کو تعزیہ داری کا موجد قرار دینا عامیانہ روایت ہے۔

۳-ہندوستان میں عالمگیر کے زمانہ سے پہلے تعزیہ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔

۴-حضرت حسینؓ کو ذبح کرنے کی ملعون حرکت شمر سے نہیں بلکہ سنان نخعی سے صادر ہوئی تھی۔

۵-مؤرخین کی تصریحات کے مطابق ۱۴۳ھ سے تصنیف و تالیف کی ابتداء ہوئی۔

۶-۱۰ھ تک تحریری استفتا یا محضر نامہ لکھنے لکھوانے کا دستور نہیں تھا۔

۷-بابا رتن ہندی ایک طویل العمر شخص تھے، نہ صحابی تھے نہ تابعی، ان کی طرف منسوب حدیثیں جعلی ہیں۔

۸-ہر بے جان کی تصویر بنانا جائز نہیں ہے جیسے صلیب وغیرہ۔

۹-فتح مکہ کے دن خانہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں تھیں، حضور ﷺ نے انہیں کعبہ سے نکلوایا اور ان کو مٹوادیا۔

۱۰-بخاری کی ایک روایت ہے کہ عاشوراء کے دن کعبہ کو غلاف بھی پہنایا جاتا تھا۔

مندرجہ بالا نکات 'ابطال عزاداری' سے بعض ترتیب سے مختلف جگہوں سے نقل کئے گئے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کا یہ رسالہ مجلہ 'ندائی' لکھنو جلد ۵ شمارہ ۲ سے ۲ بابت ماہ جمادی الاخری تا ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ میں شائع ہوا۔ اس رسالہ کا آخری حصہ یعنی اکابر مشاہیر علماء اہل سنت کے فتوے ماہنامہ الفرقان بابت ماہ ربیع الثانی و جمادی الاولی ۱۳۶۶ھ میں الگ سے بھی شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر مسعود احمد الاعظمی مصنف حیات ابوالمآثر اور ان کے علاوہ بعض تذکرہ نگاروں نے الفرقان میں شائع اکابر کے فتوے کو مولانا اعظمی کی ایک مستقل تصنیف شمار کیا ہے۔ اور 'ابطال عزاداری' اور عزاداری سے متعلق اکابر کے فتاوے کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے 'الفرقان' میں جو شائع ہوا ہے وہ 'ابطال عزاداری' کا ہی حصہ ہے۔ دلیل میں مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی وہ تمہید پیش ہے جو 'الفرقان' میں شائع "جملہ رسم عزاداری کے متعلق اکابر و مشاہیر علماء اہلسنت کے فتوے" کے شروع میں انہوں نے لکھی تھی فرماتے ہیں

> "میرا یہ پورا رسالہ ضخیم ہو گیا ہے، اس لئے بعض احباب کے مشورہ کی بنا پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ اسکا آخری حصہ (علماء کے فتوے) الگ بھی شائع کیا جائے تا کہ فائدہ کا دائرہ وسیع تر ہو۔"

۱؎ الفرقان ربیع و جمادی الاولی ۱۳۶۶ھ ص ۳۰۳

تعدیل رجال بخاری

اسلامی تعلیمات کے اصل ماخذ قرآن و حدیث کی استنادی حیثیت کو مجروح کرنے کے لئے اس میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اسلام دشمن عناصر نے اسلام کی صورت مسخ کرنے اور حدیث کو غیر معتبر ثابت کرنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی، مستشرقین نے رسول ﷺ کے کلام کی عظمت کو مجروح کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ حدیث کی استناد پر حملہ کرنے والوں میں شیعیت نے بھی اپنے خوب جوہر دکھائے۔

اس فرقہ نے رسول ﷺ کے کلام کے امین صحابہ کرامؓ، ازواج مطہرات، تابعین، محدثین جیسی برگزیدہ شخصیتوں پر طعن و تشنیع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ شیعوں کی تخریبی کارروائیوں سے واقفیت کے لئے زیر تبصرہ مرزا عبد الحسین لکھنوی کی تصنیف 'رجال بخاری' کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہوگا۔ مرزا لکھنوی نے مستند مجموعہائے حدیث کے صحیح ترین مجموعہ 'بخاری شریف' کے راویوں پر کلام کیا ہے۔

حالانکہ یہ بات غیروں کے یہاں بھی تسلیم شدہ ہے کہ حدیث شریف کی حفاظت کی خاطر اس کے ایک ایک لفظ کی چھان بین اور رواۃ کی زندگی کے تمام گوشوں کی جانچ پرکھ میں جو اعلیٰ ترین معیار مقرر کیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں جس قدر اہتمام برتا گیا، ایسا اہتمام اور ایسا معیار نقد کسی اور علم و فن میں نظر نہیں آتا۔ جانچ کے ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اہل فن نے یہ فیصلہ کیا کہ بخاری شریف حدیث کا سب سے صحیح اور پاکیزہ مجموعہ ہے۔

لیکن شیعہ عالم نے حدیث کی صحت کے سلسلہ میں ان تمام احتیاط و تدابیر کو نظر انداز کرتے ہوئے رجال بخاری پر جرأت نقد کی، بلکہ یہ کہنا حقیقت کے عین

معروف ہوگا کہ مرزا لکھنوی نے رجال بخاری پر اشاعت جاری کی۔ انہوں نے کتاب کا نام ہی 'رجال بخاری' رکھا۔

جب 'رجال بخاری' منظر عام پر آئی تو علامہ سید سلیمان ندوی نے حدیث رجال پر مرزا عبدالحسین لکھنوی کے اس سلسلہ کا نشانہ بنانے کا تحت نوٹس لیا اور بہت ہی ریفر سمجھتے ہوئے مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے 'رجال بخاری' کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔

مولانا اعظمی جن کا میدان عمل حدیث اور رجال حدیث کی تحقیق و تنقید تھی، نے رواۃ بخاری کے دفاع کو سعادت عظمی سمجھا، اور رجال بخاری کے رد میں منہمک ہوگئے۔ ان کے انہماک کا اندازہ ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۳۵۱ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو لکھا تھا۔ اس خط کا چھوٹا سا ایک اقتباس ملاحظہ ہو

"آج کل ایک شیعی رسالہ (رجال بخاری) کے رد میں منہمک ہوں
اس کے رد میں اتنا انہماک ہے کہ بجز درس و فرائض شرعی ضروریات کے
اور کوئی کام نہیں ہوتا سارا وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔"[1]

مولانا اعظمی نے مولوی مرزا عبدالحسین لکھنوی کی ریت پر قائم تحقیق یعنی فریب اور غلط بیانیوں کو ڈھا کر اس شیعہ عالم کے مستشرقانہ انداز کے بالمقابل محدثانہ محققانہ انداز سے حق و باطل کے درمیان خط فاصل کھینچ دیا۔ مرزا عبدالحسین لکھنوی نے مسلمانوں کو جہاں جہاں دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے اور مولانا اعظمی نے اس پر جو گرفت کی ہے، اس کے کچھ نمونے نذر ناظرین ہیں

۱- مرزا صاحب نے شمر بن ذی الجوشن قاتل حسینؓ کو صحیح بخاری کا راوی

۱- حیات ص ۲۶۸-۲۶۹، تعدیل رجال بخاری ص ۱۹

لکھ دیا ہے۔ (رجال بخاری ۲۹)

مولانا اعظمی نے اس پر گرفت کی کہ صحیح بخاری ومسلم تو کیا صحاح ستہ کی کسی کتاب میں شمر بن ذی الجوشن سے روایت نہیں ہے۔ دلیل کے طور پر مولانا نے لکھا، تقریب، تہذیب اور خلاصہ وغیرہ جن میں صحاح کے جملہ راویوں کا ذکر ہے، میں شمر ابن ذی الجوشن کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا صحاح کا بانداز تحدی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مصنف رسالہ اپنے تمام عوان وانصار کو اکٹھا کر کے ان کتابوں میں شمر ابن ذی الجوشن کی روایت نکال دیں تو جو انعام مانگیں حاضر ہے۔"[۱]

مولانا اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ فقط ترمذی میں شمر نام کے ایک راوی کی روایت ہے جو شمر بن ذی الجوشن نہیں ہے بلکہ شمر بن عطیہ ہے۔

۲- حارث بن یزید پر شیعہ مولف نے الزام لگایا کہ "قاتلین حسین میں سے ہے، کربلا میں موجود تھا۔" مولانا نے اسے سر سر جھوٹ قرار دیا، اخبار طوال میں جس حارث کی نسبت یہ لکھا ہے اس کے دادا کا نام رویم ہے، اور جو حارث بخاری وغیرہ کا راوی ہے اس کے دادا کا نام کسی نے بھی رویم نہیں بتایا ہے۔

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ جو حارث بخاری کا راوی ہے عقلاً بھی ممکن نہیں کہ وہ کربلا میں موجود ہو سکے، اس لئے کہ وہ ابراہیم نخعی کا شاگرد ہے اور ابراہیم واقعہ کربلا کے سال بہت سے بہت چودہ برس کے ہوں گے تو ان کا شاگرد اس سے بھی کم عمر ہو گا لہذا وہ اس میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔[۲]

ہم نے صرف دو مثالیں پیش کیں ورنہ تو مولانا نے دو سو سوا سو صفحات میں رجال بخاری کا رد لکھا ہے۔ مولانا اعظمی نے اپنی اس کتاب کا کیا نام رکھا، ڈاکٹر

---

[۱] تعدیل رجال بخاری ص ۳

[۲] ایضاً ص ۹۱

مسعود احمد صاحب اعظمی نے کچھ یوں روشنی ڈالی

"حضرت محدث کبیر کی فائلوں میں اس کتاب کے دو نام لکھے ہوئے مل گئے، ان میں سے ایک نام "ضرب قاری بر متن رجال بخاری" اور دوسرا "تعدیل رجال بخاری" تھا۔"[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا اعظمی کی یہ کتاب اسم بامسمّٰی شاہکار ہے۔ علم و تحقیق کی دو اہم شخصیات حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کتاب پر تقاریظ لکھیں۔ امام اہلسنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھتے ہیں:

"حق یہ ہے کہ اہل سنت کے ذمہ ایک قرض تھا جس کو مولانا ممدوح نے ادا کیا، مؤلف رجال بخاری کی خیانت اور جہالت کی کارروائیاں جو گرفت کی ہیں وہ ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔"[2]

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا

"مولانا نے میری تحریک سے اس کو لکھنا شروع کیا، جواب بے حد متین، سنجیدہ، مدلل اور فن و تحقیق کے اعتبار سے کافی شافی ہے، اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے۔"[3]

راقم الحروف کا جہاں تک خیال ہے تو فن رجال میں یہ کتاب مولانا اعظمی کی دقت نظر، وسعت معلومات اور اس فن سے متعلق ہر نشیب و فراز سے واقفیت کی آئینہ دار ہے۔ یہ کتاب اس حیثیت سے ہی مفید نہیں کہ اس کا مطالعہ صرف 'رجال بخاری'

---

[1] تعدیل رجال بخاری ص ۲۰

[2] ایضاً ص ۱۲

[3] ایضاً ص ۳

کے رد کے ہی نقطۂ نظر سے ہو بلکہ اس کا اہم اضافی فائدہ یہ بھی ہے کہ رجال بخاری سے متعلق معلومات اور تنقیدات کے سلسلہ میں کافی کچھ مواد اس میں موجود ہے، اردو زبان میں اس طرح کی تصنیفات کم دیکھی جاتی ہیں۔

اس کتاب کو المجمع العلمی مئو نے مولانا الاعظمی کے رکھے ہوئے دو ناموں میں سے مؤخر الذکر 'تعدیل رجال بخاری' کے نام سے ۱۴۲۳ھ م ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ رسالہ مجلہ 'المآثر' (جلد: ۳ ش: ۴ سے جلد: ۷ ش ۴) 'رد رجال بخاری' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

ردِ اہلحدیث

مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ایک پختہ کار حنفی عالم تھے۔ حنفیت کے دفاع میں ہمیشہ کمربستہ نظر آتے۔ اہلحدیث حضرات کی جانب سے کئے جانے والے ایک ایک اعتراض اور ہر اشکال کا انہوں نے بڑے پرزور انداز میں رد کیا، اور احناف دشمنی پر مبنی غیر مقلدین کی افتراپردازیوں کو عوام کے سامنے اجاگر کیا۔

فرقۂ اہلحدیث کے ساتھ مولانا کے تحریری مناظرے بہت مشہور ہیں، اہلحدیث حضرات کے رد میں آپ کی تصنیفات کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آگے چل کر ہم آپ کی بعض مناظرانہ تحریروں کو ناظرین کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ مولانا اعظمی نے غیر مقلدین کے خلاف باقاعدہ تقریری مناظرے بھی کئے، دو تقریری مناظروں کا ذکر خاص طور سے کتابوں میں ملتا ہے۔ ایک بڑھنی کا، دوسرا سمہوا بسم اللہ کا۔

یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فرقۂ اہلحدیث کے رد میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی تصنیفات اور مناظروں میں ان کی شرکت ذاتی عناد کا ثمرہ نہ تھی، بلکہ یہ سب کچھ غیر مقلدین کے اس الزام کے ردعمل میں تھا جو وہ احناف پر لگاتے ہیں کہ احناف کا مسلک حدیث سے دور محض قیاس آرائیوں اور تخیلات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں خود مولانا الاعظمی کا بیان ملاحظہ کیجئے جسکے ناقل مفتی ظفیر الدین صاحب مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ہیں:

"مجھے کسی سے عناد نہیں ہے۔ حدیث میں نماز کے سلسلہ میں متعدد روایتیں آتی ہیں ایک پر اگر غیر مقلد عمل کرتے ہیں تو ان سے کیوں لڑا جائے، جب کہ وہ بھی حدیث سے ثابت ہے لیکن جب وہ حنفیوں کو طعنہ

دیتے ہیں کہ یہ حدیث پر عمل نہیں کرتے قیاس پر عمل ہی اپنی توہین الت
سوچو کیسے خاموش رہا جائے ؟!

مولانا حبیب الرحمن صاحب جیسے حنفی عالم کا مسلکی اختلاف سے بالاتر اس طرح کہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، ایک سخت نقاد اور بے باک مناظر سے اسکی امید نہیں کی جاتی، اس سے مولانا کی صاف گوئی اور وسعت ظرفی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بڑھنی نیپال کی سرحد پر بستی کا ایک گاؤں ہے۔ غیر مقلدین نے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اس جگہ کو بہت موزوں سمجھا اور یہاں غیر مقلدیت کو خوب ترویج دی۔ اس فرقہ کے ماننے والوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا لیکن یہ بھی خوب ہے کہ اسی فرقہ کے ایک نوجوان نے علم بغاوت بلند کیا، غیر مقلدیت کا پروردہ و تربیت یافتہ ہونے کے باوجود اس نے اس کا سب راہنما خود اسی کے لئے وہاں جانا بن گیا، اور اس نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا جس میں حنفی علماء کو دعوت سخن دی۔ ان علماء میں بطور خاص قابل ذکر شخصیات یہ تھیں مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی، مولانا عبد الشکور صاحب مرزاپوری، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا عبد اللطیف نعمانی اور مولانا محمد ایوب مئوی۔

اس جلسہ کی کامیابی کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ عین اسی وقت تین افراد نے تبدیلئ مسلک کا اعلان کیا۔ اس واقعہ کے نتیجہ میں اہلحدیث حضرات نے احناف کو مناظرہ کا چیلنج دے ڈالا۔ اس چیلنج کو مولانا اعظمی اور مولانا عبد اللطیف نعمانی نے قبول کیا اور دونوں حضرات بستی پہونچ گئے لیکن شرائط مناظرہ طے نہ ہو سکنے کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ جلسہ کا انعقاد اور مناظرہ کا چیلنج دونوں ۱۹۲۹ء کے دوران کے واقعے ہیں۔

لے ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲ ص ۱۹

مہوا، بسم اللہ ضلع گونڈہ کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا، یہاں بھی جلسہ منعقد ہوا۔
حنفی المسلک عالم مولانا حفیظ اللہ صاحب نے احناف کے علماء میں سے مولانا
عبدالشکور صاحب لکھنوی، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی کو اس
جلسے کے لئے دعوت دی۔

دوسری جانب اہلحدیث نے بھی اپنے بزرگ اور جید عالم مولانا ثناء اللہ
امرتسری کو بلایا تھا۔ دونوں جماعتوں کے اسٹیج آمنے سامنے لگائے گئے تھے۔ مولانا
امرتسری نے قرأت خلف الامام کا موضوع پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلے حنفی عالم تقریر
کرے۔ مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنے میں سے ایک نوجوان عالم مولانا حبیب
الرحمن الاعظمی کو تقریر کرنے کو کہا۔ مولانا عبدالحفیظ رحمانی مولانا حفیظ اللہ خاں کا بیان
نقل کرتے ہیں کہ

"مولانا اعظمی جب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ان کو دیکھ کر ہم لوگوں
کو حیرت بھی ہوئی اور چہرے بھی اتر گئے کہ غیر مقلدین کے اتنے بڑے
مقابلہ کے لئے امام اہلسنت نے ایک نوجوان کو اکھاڑے میں اتار دیا
ہے، اللہ ہی خیر کرے"[1]

مولانا اعظمی نے اپنی تقریر یہ کہہ کر شروع کی کہ قرأت خلف الامام سے
متعلق غیر مقلدین کے استدلال میں مکڑی کے جالوں سے بھی زیادہ ضعف اور
کمزوری ہے' اور پھر مولانا نے اس موضوع پر احادیث پیش کیں، سند و متن سے جرح
و بحث کی، مخالفین کے دلائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر محدثانہ نقد کیا اور یہ سلسلہ ایک
رات نہیں بلکہ دو رات تک چلا' دو رات مولانا اعظمی نے قرأت خلف الامام پر تقریر کی
اور حنفی نقطۂ نظر کو بہت پختہ ثبوت کے ساتھ مدلل اور مستند ثابت کیا، اور فریق مخالف

---

[1] حیات ابوالمآثر ص ۱۸۷-۱۸۸

کے موقف کا رد کیا۔ مولانا افضل الحق جوہر قاسمی لکھتے ہیں

"غیر مقلدین یہ دیکھ کر دم بخود تھے کہ ایک عالم ہے حنفی ہے جوان ہے اور اسے ایک موضوع پر سینکڑوں حدیثیں مستحضر ہیں جن کو بلا کسی کتاب اور کاپی کے پڑھتا چلا جاتا ہے" [1]

تیسری رات جب مولانا عبد الشکور صاحب نے غیر مقلدین سے مولانا اعظمی کی تقریر کا جواب دینے کو کہا تو کوئی آمادہ نہ ہوا حالانکہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری بھی موجود تھے۔ اور اس طرح احناف کی فتح کا سہرا مولانا اعظمی کے سر رہا۔

اسی طرح اہلحدیث کانفرنس کے بالمقابل احناف کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۳ء میں بھی آپ شریک رہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اب ہم غیر مقلدین کے رد میں مولانا اعظمی کی چند مناظرانہ تحریروں کو پیش کریں گے، یہاں اس کی بھی صراحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مولانا کی تمام جوابی تحریروں کو ہم نے "مناظرہ" کے عنوان کے تحت جمع نہیں کیا ہے بلکہ کچھ کا تذکرہ "نقد" کے عنوان کے ذیل میں کیا گیا ہے۔

السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث

مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے فرقہ اہل حدیث کے نقطہ آغاز اور اس کی تاریخ پر بحث کی ہے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس فرقہ کا وجود قدیم ہے اور سینکڑوں سال پیشتر سے ہے۔ مولانا سیالکوٹی نے اپنی تحقیق میں احناف کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ فرقہ اہلحدیث کا وجود ۱۸۹۱ء سے قبل نہ تھا۔ مولانا کی یہ تحقیق امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار اہلحدیث کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئی۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی تحقیق پر تنقید

---

1 ترجمان اسلام ۱۱-۱۴ ص ۱۰۱

اور یہ واضح کیا کہ مولانا سیالکوٹی کے دعوی اور دلیل میں قطعا کوئی مطابقت نہیں ہے، کیونکہ مولانا تاریخ لکھ رہے ہیں اہل حدیث (فرقہ غیر مقلد) کی اور دلیل میں پیش کر رہے ہیں اہلحدیث (محدثین کرام) کو، جن کا دور دور تک اہلحدیث سے کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

مولانا اعظمی نے 'مواقع استعمال لفظ اہل حدیث و معانی معروفہ' کے عنوان کے تحت اہل حدیث پر بحث کرتے ہوئے ان دو جگہوں کا ذکر کیا جہاں اس لفظ کا اطلاق کرتے ہیں اور اس سے مراد محدثین ہوتے ہیں، وہ مقام یہ ہیں

(اول) مصنفین کبھی لفظ اہل حدیث کا اطلاق کرتے ہیں اور اس سے مراد محدثین ہوتے ہیں۔

مولانا نے اس پہلی قسم کے اطلاق پر مسک الختام جلد ۱ ص ۱۲، ۲۰، مقدمہ ابن خلدون ص ۳۳۲، ۴۲۱، مقدمہ فتح الباری ص ۵۷۰، ۵۷۳، مقدمہ صحیح بخاری سے مولانا احمد علی سہارنپوری کا قول، حجۃ اللہ البالغہ ۱ ص ۱۱۸، ۱۹، بستان المحدثین ص ۹۶، ۹۷، نزہۃ النظر کے حوالہ سے حافظ ابن حجر، شرح نزہۃ النظر کے حوالہ سے ملا علی قاری کے اقوال، تاریخ بغداد ص ۱۸۱، ۲۲۶ وغیرہ سے دلائل پیش کئے۔ اور یہ ثابت کیا کہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے جہاں کہیں بھی لفظ اہل حدیث کا استعمال کیا ہے اس سے مراد محدثین ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں

> "مولانا کے حوالوں میں جہاں کہیں لفظ اہل حدیث اصحاب الحدیث وغیرہ وارد ہیں ان سے بھی محدثین، وارثین علم نبوۃ اصحاب جرح و تعدیل مراد ہیں۔"[۱]

لفظ اہل حدیث کے اطلاق پر مولانا اعظمی کی پیش کردہ دلیلوں میں سے

۱۔ اسیر ادروی کی تنقید تاریخ اہل حدیث، مشمولہ مقالات ابو المآثر ۲۷۷ مرتبہ ڈاکٹر مسعود احمد

صرف ایک دلیل پیش کی جاتی ہے، ملاحظہ ہو۔

"وقال الحافظ ابن حجر في مقدمة الفتح وقال (أي اسحاق بن راهويه) يا معشر اصحاب الحديث انظروا الى هذا الشاب (يعني البخاري) واكتبوا عنه (مقدمہ فتح ص ۵۷۰)"

(حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ نے کہا کہ اے جماعت اہل حدیث اس جوان کو دیکھو اور اس سے حدیثیں لکھو، مراد امام بخاری تھے۔)

(ثانی) کبھی اہل حدیث کا طلاق اہل الرائے کے مقابل میں ہوتا ہے۔

مولانا نے دوسری قسم کے اطلاق پر ابن خلدون کی عبارت پیش کی جس میں ابن خلدون نے ذکر کیا ہے کہ فقہ کے دو طریقے رائج تھے

۱۔ طریقہ اہل حدیث جو اہل حجاز میں رائج تھا اور اس کے امام مالک، شافعی تھے۔

۲۔ طریقہ اہل الرائے جو اہل عراق میں مروج تھا اور اس کے امام ابو حنیفہ تھے۔[1]

اہل حدیث حضرات نے احناف کو اہل الرائے کے طعنے دیئے اور یہ باور کرنے کی کوشش کی کہ احناف اپنی رائے کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے مولانا نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ اہل الرائے سے مراد تخریج ہے نہ کہ وہ رائے جو کتاب وسنت کے معارض ہو کیونکہ ایسی رائے سرے سے قابل التفات ہی نہیں۔

فرقۂ اہل حدیث کے وجود کے سلسلہ میں ابن خلدون کی اس تصریح کی بناء پر کہ ابن حزم کے بعد روئے زمین پر صرف دو مذہب اہل الرائے اور اہل حدیث باقی

---

[1] السیر الحثیث الی تنقید تاریخ اہل الحدیث، مشمولہ مقالات ابو المآثر ۱/۷۰

[2] ایضاً ص ۸۱

ہے اس کے علاوہ تیسرا کوئی باقی نہ رہا۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں

"ابن حزم اندلسی کا سن وفات ۴۵۶ھ ہے، جبکہ اس وقت سے آٹھویں صدی تک جو ابن خلدون کا عہد ہے ان دونوں مذہبوں کا مقابل و مقاوم کوئی تیسرا کھڑا نہ ہوا (ابن خلدون کا یہ فقرہ قابل غور ہے ولم يبق إلا مذهب أهل الرأي الخ) نظر بریں کسی کا یہ دعویٰ بالکل بجا ہے اور مؤرخین کی تصریحات اس کی مؤید و مشید ہیں کہ اس جدید فرقہ اہل حدیث کا حدوث ۱۸۹۱ء ہی میں ہوا ہے۔"[1]

مولانا اعظمی آخر میں اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے بیان و دلیل میں کوئی مطابقت نہیں، کیونکہ مولانا دلیل میں پیش کرتے ہیں ان اہل حدیث کو جو اجماع اور قیاس کو حجت مانتے ہیں۔ یعنی امام مالک و شافعی وغیرہ کو اور تاریخ لکھ رہے ہیں ان اہل حدیث کی جو غیر مقلد ہیں ورنہ اجماع و قیاس ان کے نزدیک حجت شرعی ہے۔

مولانا اعظمی نے یہ مضمون اس وقت لکھا جب وہ دورۂ حدیث کے طالب علم تھے، مسودہ کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے

"قد فرغت من تأليفه لخمس وعشرين مضت من ربيع الأول سنة ١٣٤٠ عام قراءتي الصحاح الست"[2]

(۲۵ ربیع الاول ۱۳۴۰ھ صحاح ستہ پڑھنے کے سال میں اس مضمون کی تصنیف سے فارغ ہوا۔)

قابل غور ہے کہ مولانا کی ولادت ۱۳۱۹ھ میں ہوئی اور ۱۳۴۰ھ میں یہ

۱۔ رسالہ تحقیق لا تقلید تاریخ اہل حدیث، مشمولہ مقالات ابو المآثر ص ۸۲

۲۔ دیباچہ ص ۵

مضمون نگار عمر کا کیسواں سال اور تنقید کا یہ انداز! گویا کوئی کہنہ مشق نقاد حدیث ہو، مولانا نے جس قدر مواد یا حوالے فراہم کئے اور جو انداز تحریر اختیار کیا ہے وہ کسی ماہر فن کا ہی حق تھا۔ مولانا کی یہ تحریر کس رسالہ میں شائع ہوئی، شائع ہوئی بھی یا نہیں، اس سلسلہ میں راقم سطور کو کہیں کوئی صراحت یا اشارہ نہیں ملا، البتہ مولانا اعظمی کی ہی درج کردہ تحریر سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اشاعت کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ مولانا کی وہ تحریر یہ ہے۔

"یہ تحریر ۱۹ / جمادی الاخریٰ ۱۳۴۰ھ کو دفتر اہلسنت والجماعت میں بغرض اشاعت روانہ کی گئی۔"

اب یہ مضمون مقالات ابوالمآثر مرتبہ ڈاکٹر مسعود احمد میں شائع ہوا ہے۔

الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود

اخبار 'اہلحدیث' دسمبر ۱۹۲۳ء میں ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا 'سجدہ میں جاتے وقت ہاتھوں کو پہلے رکھنے کی سنیت'۔ اس مسئلہ میں مضمون نگار کی تحقیق کا محور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث ہے، جس میں سجدہ کے وقت ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے رکھنے کا ذکر ہے۔ چونکہ مضمون نگار کے مطابق اس حدیث کے رواۃ ثقہ و معتبر ہیں کسی قسم کی کوئی جرح ان پر نہیں کی گئی ہے، اس لئے یہ حدیث گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کی روایت سے راجح اور افضل ہے، لہٰذا اسی حدیث (روایت ابوہریرہ) پر عمل عین سنت کے مطابق عمل کہلائے گا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو مسئلہ بلا تحقیق سے [illegible] ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے رد میں ایک رسالہ الروض المجود فی تقدیم الرکبتین عند السجود

۱۔ السیر الحثیث الی تعبد تاریخ اہل حدیث، مشمولہ مقالات ابوالمآثر ۵۱

کے نام سے تحریر کیا۔ اس رسالہ میں انہوں نے احناف کے مسلک یعنی گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کو سنت کے عین مطابق قرار دیا۔

مولانا نے اپنے (احناف) کے مسلک کی تائید میں حضرت وائل بن حجر کی حدیث پیش کی اور حدیث کے مستند مراجع کے حوالے سے رواۃ پر جرح کرتے ہوئے اور اہلحدیث کے اصول مسلمہ کو بھی سامنے رکھتے ہوئے اس حدیث کو مقبول، صحیح اور قابل احتجاج ثابت کیا۔ اسی طرح مولانا نے مستند حوالوں سے اکثر اہل علم کا عمل بھی اسی حدیث پر ثابت کیا۔ امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام شافعی، ابراہیم نخعی، مسلم بن یسار، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، امام ابوحنیفہ کے اصحاب اور اہل کوفہ، صحابہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنے کے ہی قائل اور اسی پر عمل پیرا تھے۔

اس کے بعد مولانا نے اہل حدیث (غیر مقلد) عالم کی پیش کردہ حدیث ابوہریرہ پر جرح و بحث کی اور امام احمد بن حنبل، ابوحاتم، ابوزرعہ، ذہبی کے حوالے سے اس حدیث کے ایک راوی عبدالعزیز بن محمد کے غیر حافظ اور ان کے ناقابل احتجاج ہونے کا ذکر کیا۔ اسی طرح اس حدیث کے ایک راوی محمد بن عبداللہ حسن ہیں جن کے بارے میں امام بخاری کا قول "لا یتابع علی حدیثہ" یعنی وہ غرائب کے راوی ہیں ان کی متابعت نہیں کی جاتی، نقل کیا۔

آگے چل کر حدیث ابوہریرہ اور حدیث وائل کے مساوی ہونے کی صورت میں حدیث وائل کی وجوہ ترجیح بیان فرمائی اور حافظ ابن القیم کے حوالے سے مخالفین کی تاویلات کو تین وجہوں سے فاسد قرار دیا۔ اہلحدیث کے مضمون نگار نے حدیث وائل کی مرجوحیت اور حدیث ابوہریرہؓ کی راجحیت کی جو وجوہ بتائی ہیں، مولانا اعظمی نے ان کا بھی جواب دیا ہے، اور اہل حدیث عالم کے اس دعویٰ کو سرے سے باطل قرار دیا

کہ حدیث ابوہریرہ تمام طرح کی جرحوں سے پاک ہے، فرماتے ہیں۔

"یہ بالکل غلط ہے کہ اس حدیث کے تمام رواۃ جرح سے بالکل سالم ہیں اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ حدیث ابوہریرہ حدیث وائل سے راجح ہے۔"[1]

مولانا نے اس مختصر تصنیف میں حدیث اور رواۃ حدیث پر بحث کی ہے اور غیر مقلدین کے مسلک کا حدیث کی روشنی میں رد فرمایا۔ چنانچہ احناف پر بجا یا بے جا حدیث سے گریز کے الزام کی بھی تردید ہوگئی۔ اگرچہ اس کتاب کی حیثیت جوابی ہے لیکن مناظرانہ اسلوب اور طرز ادا سے یہ تحریر پاک ہے، مولانا پر خالص محدثانہ رنگ غالب ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی یہ کتاب ان کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے، غالباً ۱۳۳۲ھ میں لکھی گئی۔ ہم اس تصنیف کا تعارف مقالات ابوالمآثر کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔ راقم الحروف کے مطابق اس سے قبل شاید یہ تحریر کہیں چھپی نہیں ہے۔

حنفیہ کرام اور اتباع حدیث

جن علماء کا اشتغال حدیث کے ساتھ زیادہ رہا اصطلاح میں انہیں 'اصحاب الحدیث' کہا گیا اور جن علماء کا اشتغال فقہ اور استنباط مسائل واحکام سے زیادہ تھا انہیں 'اصحاب الرائے' کہا گیا۔

اشتغال اور میدان عمل کی اس تفریق کو ایک دوسرے تناظر میں دیکھا گیا اور 'اصحاب الرائے' کا ایک جدید مفہوم اخذ کیا گیا کہ یہ وہ اصحاب علم ہیں جو احادیث یا

[1] الرواس المجودی تقدیم الرکبتین عند السجود مشمولہ مقالات ابوالمآثر ۱۵۳

اصول کے وضع کرتے ہوئے قیاس اور عقل کی بنیاد پر اپنی رائے کا استعمال کرتے ہیں اور
احکام شرعیہ کی تعیین کرتے ہیں۔ چونکہ احناف کا فقہ اور اجتہاد شرعیہ سے استنباط
اختراع پر زیادہ زور تھا اس سے انہیں اس طرح کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا اور
میں اس کی اتنی تشہیر کی گئی کہ احناف اور قیاس ایک دوسرے کے مترادف ہو کر رہ گئے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے، جنکی حیثیت احناف میں ایک وکیل کی ہے، ان اعتراضات کا جائزہ لیا اور حنفیہ کے طرز عمل کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کے یہاں قیاس کا کیا مرتبہ یا حیثیت ہے اور حدیث و سنت کا انہیں کتنا لحاظ ہے۔ چنانچہ یہ مختصر تحریر قلم بند کی، مولانا کی اس تحریر کا مقصد خود انہیں کی زبانی ہے

> "چونکہ حنفی مذہب ان بیجا الزاموں سے جو اس کے سر تھوپے جاتے ہیں،
> بالکل بری ہے، اس لئے میں اس مختصر تحریر میں مدافعانہ طریق پر اصول
> اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔"[1]

مولانا اعظمی نے اپنے اس رسالہ کو 'حنفیہ کرام اور اتباع حدیث' کے نام سے موسوم کیا۔ مولانا نے امام ابو حنیفہ کی شخصیت، کردار کی مضبوطی، ورع و زہد و تقویٰ جن کا معترف اہل حدیث کو بھی ہے، کا جائزہ لیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا امام اعظم کی شخصیت سے یہی امید کی جا سکتی ہے کہ حدیث کو ترک کر کے اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیا ہے۔ مولانا نے امام ابو حنیفہ کی شخصیت اور ان پر عائد الزام میں صریح تناقض پایا۔ اس کے بعد ابن عبد البر، ابن الشحنہ وغیرہ کے حوالے سے امام ابو حنیفہ کی اپنے مسلک سے متعلق یہ تصریح نقل کی کہ

"إذا صح الحديث فهو مذهبي"[2]

(جب حدیث کی صحت ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔)

---

۱ ماہنامہ ثقافت اکتوبر ۲۰۰۱ء ص ۳۶ ۲ ایضاً ص ۳۷

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی تصریحات و اقوال درج کیے جن کو نقل کرنے کا یہ موقع نہیں۔

مولانا معترضین کو احناف کے اصول فقہ کے مطالعہ کی دعوت بھی دیتے ہیں تاکہ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ حنفیہ کے یہاں رائے اور قیاس کے مقابل حدیث کو کس شان کی حیثیت حاصل ہے۔ احناف کے نزدیک تو خبر آحاد کے ہوتے ہوئے قیاس قابل عمل نہیں۔ قاضی ابوزید دبوسی کی کتاب تاسیس النظر کی عبارت ملاحظہ ہو

"الأصل عند علمائنا الثلاثة أن الخبر المروي عن النبي ﷺ من طريق الآحاد مقدم على القياس الصحيح وعند مالك القياس الصحيح مقدم على الخبر الآحاد"[1]

(ہمارے تینوں علماء کے نزدیک اصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے بذریعہ آحاد روایت کی ہوئی حدیث قیاس صحیح پر مقدم ہوتی ہے اور امام مالک کے نزدیک قیاس صحیح خبر واحد پر مقدم ہوتا ہے۔)

یہ بھی خوب ہے کہ امام مالک کے نزدیک قیاس صحیح خبر آحاد پر مقدم ہے تو ان پر تو کوئی الزام نہیں! لیکن حنفیہ جو اس قدر محتاط ہیں کہ ان کے اصول فقہ میں یہ بھی ہے کہ "قول صحابی جو خلاف قیاس ہو کے ہوتے ہوئے قیاس متروک اور غیر مقبول ہے" ہمیشہ طعن و تشنیع کے نشانہ بنتے ہیں۔

مولانا نے "ہدایہ" سے چند جزئیات بھی پیش کیے جہاں حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا۔ علاوہ وہ مسائل جن میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام الحنیفہ نے حدیث چھوڑ دی ہے یا قیاس کو ترجیح دی ہے، اس کے بارے میں مولانا نے حنفیہ کی طرف سے صفائی پیش کی کہ

---

[1] الماثر گست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء ص ۳۹

"ایسے مسائل میں حدیث سے عدول یا اتباع سنت سے زیادہ وسعت اور اہم امر کی رعایت نے مجبور کیا ہوگا۔ مثلاً حدیث پر کسی وجہ سے عمل نہ کیا ہوگا کہ کتاب اللہ کے (بظاہر) مخالف ہے، کوئی خبر واحد اس وجہ سے متروک ہوگی کہ وہ خبر مشہور سے معارض ہے۔"

آگے چل کر علامہ ابن حجر مکی شافعی کی اس عبارت کو نقل کرتے ہیں جہاں ان اسباب ودواعی کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا اعظمی نے پوری تحریر میں اپنا انداز مدافعتی رکھا ہے، کافی کچھ اعتراضات کے جوابات اور مباحث اس مختصر رسالے کے ضمن میں آگئے ہیں لیکن کیا ہی خوب ہوتا اگر مولانا کچھ اور تفصیل سے کام لیتے۔ کیونکہ موضوع بہت اہم اور نازک ہے، ضرورت تھی کہ اس موضوع پر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی جیسے محدث کے ہاتھوں اردو زبان میں ایک مستند اور مفصل کتاب وجود میں آتی۔

لیکن اس کا بھی اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ یہ رسالہ ابتدائی تصنیفات میں سے ہے۔ مختصر ہی سہی لیکن مباحث ضروریہ کو ایسا محیط ہے کہ گویا کوئی پختہ عمر، پختہ کار شخص لکھ رہا ہو۔

مولانا اعظمی کا یہ مضمون سب سے پہلے ۱۳۴۳ھ؍ ۱۹۲۴ء میں مجلہ القاسم (امرتسر) کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد المآثر اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ مقالات ابوالمآثر میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔

۱؎ المآثر اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء ص ۳۶

تحقیق اہل حدیث

آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس اپریل ۱۹۴۳ء میں مئو ناتھ بھنجن میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی نے کی۔ مولانا نے اپنے خطبہ صدارت میں 'اہلحدیث' کے مسلک پر روشنی ڈالی اور اس کا رشتہ براہ راست قرآن اور سے مربوط کیا۔ مولانا نے اپنے موقف کی صداقت میں دلائل بھی دیے۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں احناف کی طرف سے سہ روزہ احناف کانفرنس منعقد ہوئی، جس کی صدارت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند نے کی۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اس کے آخری اجلاس میں مولانا کی تقریر ہوئی۔ مولانا اعظمی نے اپنی تقریر میں اہلحدیث کانفرنس منعقدہ اپریل ۴۳ء کے خطبہ صدارت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پر نقد و تبصرہ کیا اور مولانا ابوالقاسم صاحب بنارسی کے دعوے اور دلائل کے حقائق کو واشگاف کیا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی یہ تقریر پسند کی گئی اور اس کی اشاعت کا خیال ہوا۔ دراصل تقریر میں اہل حدیث عالم کے خطبہ صدارت کے چند اجزاء پر ہی تبصرہ کیا گیا تھا، لیکن جب بات اشاعت کی آئی تو یہ ضروری سمجھا گیا کہ بقیہ اجزاء پر بھی تبصرہ ہو جائے، چنانچہ مولانا اعظمی کے سامنے احباب نے یہ تجویز رکھی جسے آپ نے منظور کر لیا اور خطبے کے بقیہ اجزاء پر بھی تنقید و تبصرہ تحریر فرمایا۔ مولانا کا یہ تنقیدی تبصرہ 'تحقیق اہل حدیث' کے نام سے شائع ہوا۔

مولانا ابوالقاسم صاحب نے خطبہ صدارت میں 'حدیث' کی تعریف اس طرح کی ہے

"حدیث نام ہے کلام اللہ اور کلام رسول کا"[1]

مولانا اعظمی نے حدیث کی اس تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے یہ مقلدیت کا تازہ کرشمہ بتایا، اور اہل حدیث کے ہی ایک معتقد عالم نواب صدیق حسن خاں صاحب کی عبارت پیش کی

"حدیث در اصطلاح مشہور قول و فعل و تقریر رسول است علیہ الصلاۃ والسلام"[2]

مولانا نے مزید اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی عبارت بھی پیش کی جس میں وہ بھی کلام اللہ کو حدیث سے الگ اور حدیث کو قرآن سے دوسرے درجہ کی چیز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح مولانا اعظمی نے مولانا بنارسی کی بنیادی گرفت کی اور ان کی کی ہوئی تعریف حدیث کا رد فرمایا۔

مولانا ابو القاسم صاحب نے یہ دعویٰ کیا کہ اہل حدیث نام پیغمبر علیہ السلام کا مقرر فرمایا ہوا ہے اور دلیل میں ایک حدیث پیش کی

"قیامت میں اہل حدیث سیاہی دانوں سمیت آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم اہل حدیث ہو جنت میں جاؤ۔"[3]

مولانا اعظمی نے مندرجہ بالا حدیث کو ذہبی، خطیب اور سیوطی کے حوالے سے جعلی قرار دیا، اور بفرض محال حدیث کے جعلی نہ ہونے کی صورت میں لفظ "اہل حدیث" کی مراد پر بحث کی۔ حدیث کے سلسلہ میں غیر مقلدین کے معیارِ تحقیق کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں

"جب آج کل کے تارک تقلید علماء جعلی اور غیر جعلی حدیث میں تمیز نہیں کر سکتے تو ان کو براہ راست حدیث سے مسائل اخذ کرنے کا حق کہاں

1. خطبہ صدارت ۲، بحوالہ تحقیق اہل حدیث ص ۹
2. مسک الختام ص ۱، بحوالہ تحقیق اہل حدیث ص ۹
3. تحقیق اہل حدیث ص ۹، ۱۰

تک حاصل ہو سکتا ہے۔"[1]

مولانا حبیب الرحمن صاحب نے 'اصحاب الحدیث' یا 'اہل الحدیث' کی اصطلاح پر بھی بحث کی۔ 'قدیم اہل الحدیث' اور 'جدید اہل الحدیث' (غیر مقلدین) میں تفریق کی، کیونکہ مولانا ابوالقاسم صاحب نے شرف اصحاب حدیث کے حوالہ سے اہل حدیث کا لفظ دکھا کر یہ باور کرانا چاہا کہ وہ اسی معنی (غیر مقلدیت) میں اہل حدیث تھے۔

اپنے مسلک کو سلف صالحین کی طرف منسوب کرنے کے لئے اہل حدیث حضرات کے یہاں ترجمہ کے انداز کو بدلنے پر بھی 'تحقیق اہل حدیث' میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ منقبت کی جگہ 'اصحاب الحدیث' کا ترجمہ غیر مقلدین جماعت اہلحدیث کرتے ہیں اور جہاں برائی مذکور ہوتی ہے وہاں جماعت اہلحدیث کی جگہ کوئی دوسری تعبیر اپناتے ہیں۔ مولانا نے ترجمہ کے اس فرق کو واضح کرنے کے لئے کئی مثالیں دی ہیں لیکن ہم یہاں ایک مثال پر اکتفاء کرتے ہیں۔ مولانا اعظمی مولانا محمد جوناگڈھی کے ترجمہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ما قوم خير من أصحاب الحديث کا ترجمہ تو یوں کرتے ہیں کہ اہلحدیث سے بہتر کوئی قوم نہیں (۳۳) لیکن اما ترى أهل الحديث كيف تغيروا كيف أفسدوا کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ دیکھئے تو یہ حاملین حدیث کیسے بگڑ گئے ہیں۔"[2]

مولانا نے آخر میں 'اہلحدیث کس کو کہتے ہیں' کے عنوان کے تحت اہل حدیث کی تعریف پر بحث کی اور یہ دعویٰ کیا کہ اہلحدیث کی یہ اصطلاح کہ ایک عام

---

[1] تحقیق اہل حدیث ص ۱۰

[2] ایضاً ص ۱۵

یعنی کسی امام کی تقلید و اتباع کا قائل نہ ہو، یا اہل حدیث و بدعت سے ایسے اہل حدیث کا وجود اس دور متاخر کے علاوہ اور کبھی نہ تھا۔

مولانا اعظمی کی تقریر سے ایک دن پہلے مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کی تقریر ہوئی تھی۔ غیر مقلدین کو سب سے زیادہ ان کی تقریر سے شکایت تھی، چنانچہ اہل حدیث حضرات کچھ غلط مضامین ان کی طرف منسوب کر رہے تھے اس لیے مولانا اعظمی نے 'تحقیق اہل حدیث' میں ایک تحریر لکھا جس میں مولانا عبدالشکور صاحب کی تقریر کے پانچ مضامین کا مختصر ترین خلاصہ کے ساتھ تذکرہ کیا، تاکہ غیر مقلدین غلط مضمون مولانا لکھنوی کی طرف منسوب نہ کرسکیں۔

'تحقیق اہل حدیث' کا کچھ حصہ مولانا کے ۱۳۳۰ھ میں لکھے ہوئے ایک مضمون 'السیر الحثیث الی تحقیق تاریخ اہل الحدیث' سے ملتا جلتا ہے، جس کا تعارف گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے۔ 'تحقیق اہل حدیث' کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۳۳ھ میں احناف دار الاشاعت والتبلیغ مئو سے شائع ہوا۔ اور دوسرا ایڈیشن المجمع العلمی مئو سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ اور تیسرا ایڈیشن سنہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔

دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب

اہل حدیث (غیر مقلد) عالم مولانا یوسف صاحب فیض آبادی نے ایک اشتہار شائع کیا، جس کا عنوان تھا 'دیوبندیوں سے چند سوالات'۔ مولانا نے ان سوالات کے ذریعہ مسلک اہل دیوبند پر اعتراض کیے تھے اور جواب کا مطالبہ کیا تھا۔

اہل دیوبند کی جانب سے مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے غیر مقلدین کے سوالات کے جواب دیے۔ مولانا کے مطابق یہ سوالات تو در خور اعتنا بھی

۱ تحقیق اہل حدیث ص ۲۸

تھے: کیونکہ اس سے قبل بھی دیوبندی علماء نے اس طرح کے سوالوں کے جواب دیئے تھے۔ لیکن مولانا الاعظمی نے صرف اس لئے ان سوالات کے جواب دیئے کہ جواب نہ دینے کی صورت میں کہیں یہ نہ تصور کر لیا جائے کہ مسلک دیوبند پر ہونے والے اعتراضات کو صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے اور ان کے جواب پر قدرت نہیں۔

مولانا یوسف فیض آبادی کے سوالات اور ان پر مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے جوابات کے دو نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں تا کہ سوال و جواب کے معیار کا اندازہ ہو سکے:

سوال ہفتم: حنفیہ کے نزدیک صحابی کو گالی دینا یا بغض رکھنا کفر نہیں ہے۔ (شامی جلد ۳ ص ۳۵۳) کیا یہ عقیدہ حدیث لا یحبھم إلا مؤمن ولا یبغضھم إلا منافق کے خلاف نہیں ہے۔

جواب: صحابیؓ کو گالی دینا یا بغض رکھنا اہل سنت میں کسی کے نزدیک بھی کفر نہیں ہے۔ اہل سنت کے نزدیک گالی موجب کفر نہیں ہوتی، دلیل میں مولانا اعظمی نے حافظ ابن حجر کے حوالہ سے اس حدیث کی مراد بیان کی، حافظ ابن حجر کے مطابق اس حدیث میں بغض سے مراد خاص نوعیت کا بغض ہے۔ مولانا اعظمی نے ابن حجر کی جو تصریح نقل کی ہے، وہ ملاحظہ ہو۔

"هل يكون من أبغضهم منافقاً وإن صدق وأقر فالجواب أن ظاهر اللفظ يقتضيه لكنه غير مراد فيحمل على تقييد البغض بالجهة فمن أبغضهم من جهة هذه الصفة وهي كونهم نصروا رسول الله ﷺ أثر ذلك في تصديقه فيصح أنه منافق. (فتح الباری، ۳۸) خلاصہ یہ کہ ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ان سے بغض رکھے منافق ہے لیکن مراد یہ نہیں ہے بلکہ خاص نوعیت

کا بغض مراد ہے۔ اور یہ کہ ان سے صرف اس وجہ سے بغض رکھے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی ہے بلا شبہ ایسا شخص منافق ہے۔"[1]

مولانا نے مندرجہ بالا عبارت کو پیش کر کے حنفیہ کے مسلک کو واضح کیا کہ صحابیوں سے بغض رکھنا اگرچہ سخت ترین گناہ ہے لیکن کفر نہیں ہے، البتہ اگر اس بغض کی بنیاد نصرت رسول ہے تو بیشک یہ نفاق ہے۔

اس موقع پر لگے ہاتھوں مولانا اعظمی نے مولانا فیض آبادی سے بھی کچھ سوالات کر لئے کہ بخاری شریف کی حدیث ہے "سباب المسلم فسوق" (مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔) اس حدیث میں گالی کو فسق کہا گیا ہے، اگر سب صحابہ کو آپ کفر سمجھتے ہیں تو حدیث صحیح کے خلاف ہے یا نہیں۔ حدیث میں "وقتاله كفر" ہے۔ (بخاری) یعنی قتل مسلم کو کفر کہا گیا ہے تو صحابہ میں جو قتال ہوا اس کی بابت آپ کا کیا فتویٰ ہے۔ نیز امام بخاری قتال کرنے والے مومنوں کو قرآن سے مومن ثابت کرتے ہیں اور خود ہی "قتاله كفر" بھی روایت کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

مولانا اعظمی مولانا یوسف فیض آبادی سے سوال کرتے ہیں کہ جب قتال مومن بنص قرآنی (کما زعم بخاری) منافی ایمان نہیں ہے تو سب مومن کیونکر کفر ہو جائے گا؟[2]

سوال یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک نجس العین نہیں در مختار نولکشور صفحہ ۲۰، اس کی دلیل مطلوب ہے۔

---

[1] دیوبندیوں سے چند سوالات کا جواب، مشمولہ مقالات ابوالمآثر ۳۹۱
[2] ایضاً ص ۳۹

جواب مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس سوال پر اظہار افسوس کیا کہ سائل کو بخاری کے باب سور الکلاب وممرها في المسجد سے ذہول ہوگیا۔ مولانا نے کتے کے نجس العین نہ ہونے پر جو دلیلیں پیش کیں، وہ یہ ہیں

۱- امام بخاری کے نزدیک صرف یہی نہیں کہ کتا نجس العین نہیں، بلکہ مطلقاً نجس بھی نہیں ہے۔ چنانچہ امام زہری کا فتویٰ نقل کیا کہ اگر کوئی دوسرا پانی موجود نہ ہو تو اس پانی سے وضو جائز ہے جس میں کتے نے پیا ہو۔ اس مقام پر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

والظاهر من تصرف المصنف انه يقول بطهارته (فتح الباری ۱/۱۹۱) یعنی مصنف کے تصرف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی پاکی کے قائل ہیں۔

۲- بخاری میں حدیث ہے کہ ایک شخص نے پیاسے کتے کو اپنے موزہ سے پانی پلایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اس فعل کو پسند فرمایا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں

استدل به المصنف على طهارة سور الكلب (فتح الباری ۱/۱۹۶)

یعنی امام بخاری نے اس حدیث سے کتے کے جھوٹے کی پاکی پر استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد شکاری کتے والی حدیث ذکر کر کے اس کو بھی اس کی پاکی کی دلیل بتائی۔

۳- حدیث میں وارد ہے کہ جس برتن میں کتا پانی پی لے اس کو دھویا جائے برتن کی پاکی کا یہی طریقہ حدیث میں مذکور ہے۔

۴- حدیث میں مذکور ہے کہ مسجد نبوی میں کتے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور مسجد میں پانی بھی نہیں چھڑکا جاتا تھا۔

مولانا اعظمی ان دلیلوں کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ کتا نجس تو ہے، مگر نجس العین نہیں اس لئے کہ اگر نجس نہ ہوتا تو جس برتن میں پانی پی

پانی اس کی پاکی کی ضرورت نہ تھی اور اگر نجس نہیں ہوتا تو مسجد کا دھونا ضروری ہوتا۔

مولانا نے بارہ سوالات نقل کیے۔ اور پھر ان کے مسکت جوابات دیے اور آخر میں فریق مخالف کو یہ چیلنج دے ڈالا

"جوابات پر غائر نظر ڈال کرے اگر کلام کی گنجائش ہو تو کلام کیا جاوے۔"[1]

مرتب مقالات ابوالمآثر کے بیان کے مطابق مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کی یہ تحریر ۱۳۴۲ھ یا اس کے بعد کی ہے۔ پہلی مرتبہ یہ جوابی تحریر مطبع برقی پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اور اب یہ مقالات ابوالمآثر جس کو مجمع علمی مئو نے ۲۰۰۰ء میں شائع کیا، میں شامل ہے۔ مولانا کی اس جوابی تحریر میں احناف پر ہونے والے بنیادی اعتراضات کا مختصر مگر جامع رد کیا گیا ہے، اس موضوع پر مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہت کارآمد رسالہ ہے۔

مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اپنے اس مضمون میں حنفیت کی شہرت و مقبولیت کے اسباب و عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا کا یہ مضمون ان عنوانات پر مشتمل ہے

(۱) امام ابوحنیفہ کی مقبولیت خداداد ہے (۲) تلامذۂ امام کی تعداد (۳) وہ ممالک جہاں امام صاحب کا مذہب مقبول ہوا (۴) ابن خلدون کی شہادت (۵) مقبولیت کے اسباب۔

اس مضمون میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، لیکن اس اختصار کے باوجود

---

[1] ایک مدعی حدیث سے چند سوالات کا جواب، مشمولہ مقالات ابوالمآثر، ص ۱۴۱-۱۴۲

[2] ایضاً ص ۱۴۵

مذہب حنفی کی مقبولیت کے سلسلہ میں کافی کچھ اہم اور بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون ۱۲ رشوال ۱۳۴۵ھ کا مکتوب ہے۔ یکم مئی ۱۹۲۷ء کو ارشاد امرتسر میں شائع ہو۔ مقالات ابوالمآثر جلد دوم میں بھی شائع ہوا ہے۔

مثالب ابی حنیفہ کی تنقید

اہل حدیث اخبار "محمدی" دہلی کے ایڈیٹر نے "حنفی علماء جواب دیں" کے عنوان سے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو ایک مضمون لکھا۔ ایڈیٹر "محمدی" نے تاریخ خطیب کے حوالے سے امام ابوحنیفہ کی چند باتیں نقل کر کے علماء احناف سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کا جواب دیں، ورنہ وہ احناف کو لاجواب سمجھنے پر مجبور ہوگا۔

احناف کی جانب سے مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے جواب کے لئے قلم اٹھایا اور "مثالب ابی حنیفہ کی تنقید" کے نام سے ایک مضمون تحریر فرمایا۔ مولانا نے ایڈیٹر "محمدی" کے اعتراضات کا جواب دیا اور مستند حوالوں سے امام ابوحنیفہ سے متعلق روایات خطیب کو ناقابل اعتماد اور حقیقت سے دور قرار دیا۔

"مثالب ابی حنیفہ کی تنقید" میں مولانا نے چند ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں ان میں اہم عنوانات یہ ہیں

(۱) روایات خطیب کی تردید ابن حجر شافعی کے قلم سے (۲) ابن خلکان شافعی کے ہاتھوں روایات خطیب کی رسوائی اور خطیب کی اس کارروائی پر اظہار ناپسندیدگی (۳) سیوطی شافعی کی زبانی خطیب کا تعصب بے جا، اور ان کی روایت کی بے اعتباری (۴) سبط ابن الجوزی کی رائے میں خطیب سے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں (۵) تنقید روایات خطیب۔

احمدیوں کی ذلت و خواری پر محمدیوں کی بیقراری

علامہ سید مرتضیٰ حسن صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے مرزائیت کی روک تھام اور تردید میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تصنیفات مرزائیوں کے خلاف بہت مشہور ہوئیں، مثلاً 'تحقیق الکفر والایمان بآیات القرآن' اور 'اشد العذاب علی مسیلمۃ الپنجاب' وغیرہ۔ اشد العذاب میں علامہ نے احمدیوں کے عقائد کفریہ شمار کرائے ہیں۔

اخبار 'محمدی' دہلی میں یکم مارچ ۱۹۲۷ء کو ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا 'حنفیت اور مرزائیت کا بعض خصوصی عقائد میں اتحاد و اتفاق'۔ مضمون نگار کا نام ابو محمد عبدالجبار تھا۔ مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے گنائے ہوئے احمدیوں کے عقائد کفریہ میں سے بعض کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ احناف بھی مرزائیوں کے ساتھ ان عقائد میں شریک ہیں۔

اصول فقہ میں احناف کا کیا موقف ہے، استنباط و استخراج مسائل میں ان کا کیا طریقہ کار ہے، حدیث و نصوص کے بارے میں احناف کا کیا عقیدہ ہے؟ مولانا اعظمی نے اپنے اس مضمون میں ان تمام باتوں کا تجزیہ کر کے احناف کا ایک واضح مسلک پیش کرتے ہوئے 'محمدی' کے مضمون نگار کا جواب دیا اور اس کے مضمون کو افترا پردازی اور دجل فریبی کا مجموعہ قرار دیا۔ مولانا کا یہ مضمون 'العدل' گوجرانوالہ میں ۲۹ راپریل اور ۷ رمئی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ مجموعۂ مقالات جلد اول میں بھی یہ مضمون شامل ہے۔

قادیانی مرتد کی سنگساری

مولوی ثناء اللہ کی غمگساری

کابل میں نعمت اللہ خاں مرزائی کو بسبب ارتداد سنگسار کیا گیا۔ اب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ مرزائی کی سنگساری شرعی نقطۂ نظر سے درست تھی یا نہیں۔ مولانا ثناء اللہ ایڈیٹر 'اہلحدیث' نے ۳ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ کو ایک مضمون لکھا، جس میں مرتد عن الاسلام سے شرعی اصطلاح کی مراد پر بحث کی۔ اپنی تحقیق کی روشنی میں وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ مرزائی کی سزا سنگساری نہیں ہو سکتی۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے ایڈیٹر اہلحدیث کا رد کیا اور فقہی مراجع کے حوالوں سے ارتداد کی شرعی اصطلاح کی تعیین فرمائی۔ انہوں نے اپنی تحقیق کی روشنی میں نعمت اللہ خاں مرزائی کی سزائے سنگساری کے سلطنت افغانستان کے فیصلہ کو حق بجانب اور شرعی نقطۂ نظر سے صحیح قرار دیا۔

مولانا کے اس مضمون کا عنوان 'قادیانی مرتد کی سنگساری مولوی ثناء اللہ کی غمگساری' تھا۔ یہ مضمون ۱۰ نومبر ۱۹۲۴ء میں القاسم امرتسر میں شائع ہوا۔ یہ مضمون مجموعۂ مقالات میں بھی شامل ہے۔

مضامین ومقالات

(غیر مقلدیت کے رد میں)

غیر مقلدیت کے رد و ابطال میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے حنفی مسلک کی جانب سے بہت اہم اور کلیدی رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے مضامین ومقالات بھی اس موضوع سے متعلق کئے ہیں، یہ بھی ایک خاص بات ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کتابوں کو چھوڑ کر مولانا کے بھی مضامین وفتاوی ہیں کسی نہ کسی مضمون یا مضمون کے جواب ورد میں لکھے گئے ہیں، جن کا تعارف اور تجزیہ کرنے کے لئے مقالہ کے محدود صفحات کافی نہیں۔ لہٰذا رد غیر مقلدیت یا دفاع حنفیت میں مولانا اعظمی کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ مضامین ومقالات کی ایک اجمالی فہرست پیش کی جارہی ہے جس کو دیکھ کر قاری کو اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا نے ہر موڑ پر اس فرقہ کے راہ میں (Obstacles) کھڑی کیں اور احناف کے خلاف ان کی افتراپردازیوں کو فاش کیا۔

۱- اخبار محمدی کے بعض مضامین پر ریویو (الفقیہ ۲۸ اپریل ۱۹۲۵ء)

۲- امام اعظم اور خطیب بغدادی

۳- اہل حدیث اور اس کے ہمنواؤں کی خوش فہمی

۴- اہل حدیث کی چیرہ دستیاں

۵- ایڈیٹر اخبار 'محمدی' کا شر انگیز مشغلہ، مذہب حنفی پر ناپاک حملہ (الفقیہ ۲۱ جنوری، ۲۸ فروری ۱۹۲۵ء)

۶- ایڈیٹر اہل حدیث کی منطق دانی

۷- بحث اجماع

۸- تاریخ اہل حدیث پر ایک نظر
۹- حقیقۃ الفقہ کی ایک فصل (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۱۰- تحقیق حکم الطلقات الثلاث (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۱۱- تقلید اور غیر مقلدیت، ایک اہم بحث (المآثر ج ۶ ش ۲ ربیع الاول تا جمادی الاخری ۱۴۱۸ھ، مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۱۲- تبصرہ بر حقیقۃ الفقہ
۱۳- خطیب بغدادی کی شرف اصحاب الحدیث اور محمد جوناگڈھی
۱۴- دفاع حنفیت
۱۵- رسالہ اثبات تقلید
۱۶- عدد رکعات تراویح (القاسم ۲۵ر مئی، ۱۰ر جون ۱۹۲۳ء، مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۱۷- غیر مقلدوں کے اشتہار کا جواب
۱۸- کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر محمدی (ارشاد ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۷ء)
۱۹- مسئلہ طلاق پر شبہات اور ان کا ازالہ (القاسم ۲۵ر اپریل ۱۹۲۳ء)
۲۰- واقعہ قتل کی تردید (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۲۱- کشف المعضلات (الفقیہ ۲۰ر فروری، ۵، ۷ر مارچ، ۱۵ر اپریل اور ۲۰ر اپریل ۱۹۲۳ء)
۲۲- مسئلہ تقلید
۲۳- مولوی ثناء اللہ صاحب اور بحث تقلید (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۲۴- حیلہ (مقالات ابوالمآثر جلد اول)
۲۵- نکاح محمدی پر ایک نظر (مقالات ابوالمآثر جلد اول)

ردِ بریلویت

بریلوی فرقہ کے علاوہ بھی مولانا اعظمی کا تقریری مناظرہ ہوا۔ اس سلسلہ میں ادری کے مناظرہ نے کافی شہرت حاصل کی۔ یہ مناظرہ ۱۵/۱۶/۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں موضع ادری ضلع اعظم گڑھ میں منعقد ہوا۔ بریلوی فرقہ کی جانب سے مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی جیسے مناظر نے اس جلسہ میں شرکت کی۔ دیوبندی علماء میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی اور مولانا منظور نعمانی کی رفاقت میں شریک ہوئے۔

ادری کے مناظرہ میں امیر اوروی کے بقول

"مولانا اعظمی بحیثیت سرپرست ہر نشست میں اسٹیج پر ہر وقت رہنمائی کے لئے موجود رہتے اور جوابات کی نشاندہی اور ہدایت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔"[1]

نتیجہ میں بریلوی مناظرین شب کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غائب ہوگئے۔[2]

بدعت نواز مصنفین کے مولانا اعظمی نے تحریری جواب بھی دیئے، بریلویت کے رد میں مولانا کی تصنیف 'شارع حقیقی' کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ بریلویت کے ابطال میں مولانا کے کئی مضامین بھی ہیں۔ ہم یہاں صرف 'شارع حقیقی' کا تعارف پیش کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

۱؎ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۳۱

۲؎ دارالعلوم اپریل، مئی ۱۹۹۳ء ص ۱۶

شارع حقیقی

بریلوی فرقے کے عالم مولانا سید محمد کچھوچھوی نے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اس رسالہ میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی بھی چیز کی تحلیل وتحریم کا اختیار ہے۔ مولانا کچھوچھوی نے رسالہ کا نام "تحقیق المسائل فی حقوق الشارع" ہے۔ انہوں نے اس رسالہ میں حضور اکرم ﷺ کی ذات قدس کو اس حد تک بلند کیا کہ الوہیت اور رسالت کا امتیاز ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔

مولانا محمد منظور نعمانی نے اپنے استاد محترم مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے اس کتاب کا رد لکھنے کی فرمائش کی تاکہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں نظام دنیا کے چلانے والے شارع حقیقی اور اس کے رسول کے درمیان فرق کو واضح کیا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے شاگرد کی اس نیک خواہش وفرمائش کو "شارع حقیقی" کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر پورا کیا۔

اس کتاب کے اہم مباحث مسلک حق کی توضیح، مسلک حق کے دلائل، مخالفین کے دلائل وغیرہ ہیں۔ مولانا نے سب سے پہلے تحلیل وتحریم کے سلسلہ میں تحقیقی مسلک بیان فرمایا۔ بریلوی عالم سید محمد کچھوچھوی کے موقف کا رد کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ شارع حقیقی صرف اور صرف باری تعالیٰ کی ذات ہے۔ تحلیل وتحریم کا مالک وہی ہے، کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں۔

مولانا اعظمی نے اس مسلک کی توضیح شیخ کمال الدین ابن الہمام حنفی، علامہ ابوجعفر رازی، علامہ اسنوی شافعی، حافظ بدر عینی، علامہ محب اللہ بہاری، نیز شرح ابن امیر الحاج، حجۃ اللہ البالغہ، تحفہ اثنا عشریہ کے حوالے سے پیش کی ہے۔ اس کے بعد مولانا قرآن وحدیث سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ پھر کچھوچھوی صاحب کے دلائل کا تجزیہ

کرتے ہیں اور پیش کی گئی آیات و احادیث سے مفہوم و معنی کی تعیین فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا سید محمد صاحب نے اپنے موقف یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تحلیل و تحریم کے مجاز ہیں، کے سلسلہ میں پہلی دلیل ایک حدیث سے پیش کی، وہ حدیث یہ ہے

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اس شرط پر ایمان لایا کہ میں صرف دو نمازیں پڑھا کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمایا۔ اس حدیث سے مولانا کچھوچھوی نے یہ ثابت کیا کہ نبی کو اختیار تھا کہ جس کو چاہیں اور جس حکم سے چاہیں مستثنیٰ فرمادیں۔

مولانا الاعظمی کو اس دلیل پر کلام ہے۔ مولانا کہتے ہیں کہ اول تو حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابی کو مستثنیٰ فرمادیا۔ ممکن ہے کہ آپ نے دو نمازوں کو بایں خیال قبول فرمایا ہو کہ اسلام لانے کے بعد اس کی برکت سے یہ خود بخود پنج وقتہ پڑھنے لگیں گے۔ اس لئے اس سے پہلے ہی اس کے اقرار کی ضرورت نہیں تھی، ثانیاً آپ نے اس لئے قبول فرمایا ہو کہ کافر رہنے سے تو بہر حال یہ اچھا ہی ہے کہ آدمی مسلمان ہو جائے۔

مولانا اعظمی نے ہاتھ کے ہاتھ مولانا کچھوچھوی سے ایک سوال بھی کر دیا کہ اگر جناب کے پاس کوئی غیر مسلم حاضر ہو کر کہے کہ مجھے مسلمان کر لیجئے مگر میں دو ہی وقت کی نماز پڑھوں گا اور فرض کیجئے کہ آپ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے مگر وہ نہیں سمجھا تو بتائیے کیا کریں گے؟ مسلمان کر لیں گے یا پنج وقتہ کے اقرار کی شرط لگائیں گے!

مولانا کچھوچھوی نے اپنے موقف کی تائید میں کچھ اقوال علماء بھی نقل کئے ہیں۔ انہوں نے "تحقیق البریت"[1] میں ایک جگہ لکھا

"مولوی اشرف علی کو بھی اپنے ترجمہ قرآن میں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس

---

۱ شارح حقیقی ص ۲۲-۲۶

یت سے احکام شریعت میں بھی اختیار نبوی ثابت ہوتا ہے۔[1]

مولانا اعظمی نے اس کو مولانا کچھوچھوی کی فریب دہی قرار دیا۔ بیان القرآن اور مولانا تھانوی کے ترجمہ میں کہیں بھی اس طرح کی عبارت ہونے سے مولانا نے انکار کیا۔ اسی طرح مولانا تھانوی کے ملفوظات وغیرہ سے جو اقوال وفرمودات مولانا سید محمد کچھوچھوی نے پیش کئے ہیں، ان تمام پر مولانا اعظمی نے بحث وجرح کی اور ان کے معانی ومفاہیم کی تعیین کرکے ثابت کیا کہ یہ اقوال بریلوی مسلک کی تائید میں قطعاً نہیں ہو سکتے۔

مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اپنے موقف یا مسلک یعنی حضور اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ شارع حقیقی نہیں ہے بلکہ شارع حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس سلسلہ میں پچیس دلیلیں پیش کی ہیں۔ مولانا نے آخر میں تحقیق بازغ کی تقریظ کے کچھ حصہ کو نقل کرکے اس پر بھی نقد وتبصرہ کیا اور اسی پر اپنی بات ختم کی۔

رد بریلویت میں مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی دو کتابیں شارع حقیقی اور احکام النذر لاولیاء اللہ ہیں۔ موخر الذکر کا تعارف ہم نے فقہ کے ذیل میں پیش کیا ہے۔ ان دو کتابوں کے علاوہ مولانا کے کچھ مضامین بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو بریلویت یا رضاخانیت کے رد میں ہیں۔

شارع حقیقی پہلی مرتبہ الفرقان، بریلی میں ۱۳۵۷ھ میں قسط وار شائع ہوئی۔ اس کا کتابی ایڈیشن بھی مکتبہ الفرقان سے شائع ہوا۔ اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۴۳۲ھ م ۲۰۱۱ء میں المجمع العلمی مئو نے شائع کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

[1] شارع حقیقی ص ۶۶

تاریخ وتذکرہ

تاریخ صرف کچھ افراد اوران سے متعلق کچھ واقعات کا ہی نام نہیں ہے، اور نہ ہی یہ بادشاہوں یا حکمرانوں کے انتظام حکومت تک ہی محدود ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ میں عصریت کا دل دھڑکتا ہے، اور اسی لئے علماء وفلسفیوں نے ہر علم ہر فن ہر شئے سے متعلق ایک مرتب واقعاتی سلسلہ کو تاریخ کا نام دیا ہے، اسی لئے تفسیر وحدیث کی تاریخ بھی ہوگی، فقہ کی بھی تاریخ ہوگی، اور حکومتوں کے عروج وزوال کی تاریخ بھی ہوگی۔

کوئی بھی عالم تاریخ سے صرف نظر نہیں کرسکتا، اس کے احاطہ علم میں تاریخ ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب یہ تاریخ کسی مخصوص نظریہ سے متعلق افراد کے تذکرے کی بھی ہوسکتی ہے، حجاج کے تذکرہ کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے، اور اس تاریخ میں کتابوں کے انتساب کی تحقیق بھی ہوسکتی ہے۔ تذکرہ کو تاریخ سے کسی لمحہ بھی الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا ہے، اس کا اپنا مستقل وجود ہوتا ہے، لیکن اس کی پوری عمارت کے سنگ وخشت تاریخ سے ہی مستعار ہوتے ہیں۔

چنانچہ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی کے یہاں بھی تاریخ وتذکرہ کے بہت اہم اور معتبر گوشے ملتے ہیں۔ اس عنوان کے تحت انہیں گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اہل دل کی دل آویز باتیں

دوران مطالعہ مولانا اعظمی کی نظروں سے بہت سے واقعات، آب زریں اور حکمت و دانائی کی باتیں گزریں، جن واقعات سے مولانا متاثر ہوئے یا جن سبق آموز یا دل آویز باتوں نے ان کے قلب پر اپنے نقوش چھوڑے، مولانا نے ان کا انتخاب کرکے قارئین کے سامنے ایک مختصر مگر مفید مجموعہ پیش کیا۔

یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے، اس رسالہ میں مولانا نے ۹۷ عنوانات قائم کرکے مختصر واقعات، بزرگان دین کے فرمودات اور اہل دل کی دل آویز باتیں نقل کی ہیں۔ اس کتاب کے چھوٹے چھوٹے واقعات و ملفوظات کے مطالعہ سے تصوف اور راہ سلوک کے بعض اہم نکتوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اس رسالہ کی استناد اور اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے واقعات وغیرہ مستند مراجع سے لئے گئے ہیں۔ جیسے اخبار الاخیار، فوائد الفواد اور تذکرۃ الاولیاء وغیرہ۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اس رسالہ کو اہل دل کی دل آویز باتیں کے نام سے موسوم کیا ہے۔

اس کا پہلا ایڈیشن ۱۳۶۰ھ میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ دوسرا المجمع العلمی مئو سے ۱۴۰۰ھ میں طبع ہوکر شائع ہوا۔ مختلف رسالوں میں اس پر تبصرے بھی لکھے گئے، لیکن یہاں صرف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا تبصرہ پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

"رسالہ کی زیارت سے دل خوش ہوا، اللہ تعالیٰ طالبین علم و عمل کے لئے نافع فرمائے وسیعمل انشاء اللہ تعالیٰ طالب علموں اور مبتدیان طریق کے لئے بہت مفید ہے۔"[1]

---

[1] اہل دل کی دل آویز باتیں حصہ دوم ص ۳۳

اعیان الحجاج

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ایک ایسا فریضہ عائد کیا، جس کی تشکیل میں اس نے اُن پر دین و دنیا کے تمام فوائد کھول دیے، علم و تحقیق، تہذیب و تمدن، و ثقافت کی ترقی اور ان کا فروغ کے مضمرات شامل ہیں۔ اس مشہور فریضہ کا نام حج ہے۔ حج ہمیشہ سے بین الاقوامی منافع کا واسطہ اور وسیلہ رہا ہے۔ اسی فریضہ کے سبب سے کتنے علماء ربانی، زاہد و مرتاض اور علم و تحقیق کے دیے روشن کرنے والے، وجود میں آئے۔

حج کے مسائل سے متعلق کتابیں لکھی گئیں اور خوب لکھی گئیں۔ لیکن اردو زبان میں ایک ایسے تذکرہ کی ضرورت اب بھی تھی جو حجاج سے متعلق ہو، جس میں حجاج کرام کی سفری مشقتوں، استفادہ و افادہ کی علمی اور حج کے دوران پیش آنے والے واقعات و حادثات کا تذکرہ ہو۔ تاکہ ناظرین یا قارئین کے دلوں میں ان واقعات کو پڑھ کر حسبِ توفیق حج کرنے کا شوق و ولولہ پیدا ہو۔

مولانا الاعظمی نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک ایسا تذکرہ مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا، جس میں اسلامی تاریخ کے اعیان و اکابر کے واقعات حج کا ذکر ہو۔ 'البلاغ' میں 'طبقات الحجاج' کے عنوان سے قاضی اطہر مبارکپوری کے ایک سلسلۂ مضامین کو دیکھ کر مولانا کا یہ داعیہ مزید مضبوط ہو گیا اور پوری قوت سے اس ارادہ نے عملی شکل اختیار کر لی۔

چنانچہ انہوں نے حضرات انبیاء، صحابہ، خلفاء، شاہان اسلام، اکابر امت اور بزرگان دین کے حج کے سبق آموز واقعات و حالات قلم بند کرنے شروع کیے۔ تا آنکہ ۵۲۶ اعیان حجاج کے واقعات حج جمع کر ڈالے، اور ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہو گئی۔ مولانا نے اس کتاب کا نام 'اعیان الحجاج' رکھا۔

یہ کتاب تذکرہ کیا، معلومات کا خزینہ ہے، اس کتاب کی ہر سطر سے معلومات
میں ایک نیا اضافہ ہوتا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عظمی نے
کہیں بھی موضوع سے ہٹ کر خارجی بات نہیں چھیڑی ہے۔

تذکرہ کا یہ سلسلہ سیدنا محمد ﷺ سے شروع ہو کر حضرت آدم، حضرت
ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت یونس
حضرت الیاس، حضرت خضر علیہم السلام سے ہوتے ہوئے 'لطفائے خاتون' متوفی
۳۹ھ پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ ۳۹ھ تک کے ہی حجاج کا تذکرہ
اس کتاب میں ہے، بلکہ ۱۳۲۶ھ تک کی منتخب اور عالمگیر شخصیات کا تذکرہ اعیان
الحجاج میں کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک ترتیب پٹ جانے کی بات ہے تو مولانا نے
خود اسکا اعتراف کیا ہے کہ صدیوں کی ترتیب کسی وجہ سے قائم نہیں رہ سکی ہے۔[1]

اس کتاب میں تحقیقی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے وادیٔ روحاء کی
تحقیق، ہرثی کی تحقیق، حضرت خضر نبی تھے یا ولی؟ حضرت خضر کی حیات کی بحث
وغیرہ۔ حجاج کرام نے اس پاک سرزمین میں جن اساتذہ سے استفادہ کیا، جو کتابیں
تصنیف کیں، یا جن کتابوں کی تصنیف کا ان بلند پایہ حجاج نے ارادہ کیا، انکا بھی جابجا
تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ جیسے امام بخاری نے اپنی کتاب 'التاریخ' روضۂ
نبوی کے پاس چاندنی راتوں میں تصنیف کی، اسی طرح سے صحیح بخاری کی تصنیف اور
اسکے ابواب کی ترتیب کا آغاز بھی انہوں نے مسجد حرام سے کیا تھا، اسکے مسودہ کو روضۂ
اقدس اور منبر شریف کے درمیان صاف کیا تھا وغیرہ۔[2]

کسی شخصیت کے تذکرہ میں اگر اس کا کوئی خاص کارنامہ ہے تو مولانا اس

۱۔ اعیان الحجاج ۱ ۲۰

۲۔ ایضاً ص ۳ ۲۷

کی بھی نشاندہی کرتے چلے گئے ہیں، جیسے زبیدہ کے اتحاف کے ذیل میں نہر زبیدہ
کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ زبیدہ نے دو نہریں کھدوائی تھیں۔ ایک نہر طائف
کی سرزمین سے شروع ہو کر مکہ میں ختم ہوتی تھی، دوسری نہر وادی نعمان سے عرفات،
مزدلفہ و منیٰ ہوتے ہوئے بیر زبیدہ پر آکر ختم ہوتی ہے، جہاں سے مکہ بہت تھوڑے
فاصلہ پر رہ جاتا تھا۔ زبیدہ نے سترہ لاکھ دینار کے صرفہ سے یہ نہر تعمیر کرائی تھی۔
۱۲۹۵ھ میں ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ و کوشش سے اس کی اصلاح و مرمت کے لیے
ایک کمیٹی بنی تھی جس کے ایک رکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی تھے۔[1]

'طغائے خاتون' کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ وہ الملک الناصر کی حرم تھی،
۷۲۱ھ میں جب اس کے بطن سے ناصر کا لڑکا آنوک پیدا ہوا تو ناصر کو بے انتہا مسرت
ہوئی، اسی موقع پر طغائے خاتون نے شاہ سے حج کی اجازت طلب کی، شاہ نے
اجازت دیدی اور اس ساز و سامان سے روانہ کیا کہ مدتوں اس کا چرچا رہا، مکہ میں گیہوں
کی آمد پر جو کسٹم لگتا تھا شاہ نے اسی خاتون کے کہنے سے اسکو موقوف کیا تھا، کہا جاتا
ہے کہ کسی بادشاہ کی حرم یا ملکہ نے اس شان کا حج نہیں کیا، نہ کسی نے اتنا خرچ کیا جو اس
نے اپنے حج میں خرچ کیا۔ اس نے ایک ہزار لونڈیوں کو آزاد کیا تھا۔[2]

آخر میں مولانا اعظمی نے خاتمہ مشتمل بر چند فوائد عنوان کے تحت دو صفحے

---

[1] عیون الحجاج ۱/ ۲۲۷-۲۲۸

جب بات نہر زبیدہ کی آ ہی گئی ہے تو اس کے سلسلہ میں مولانا ابو الکلام آزاد کا ذکر بے محل نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا خود نوشت سوانح 'ہماری آزادی' میں لکھتے ہیں کہ "میرے [illegible] بیدہ کی مرمت کرائی، انہوں نے ہندوستان، مصر، شام اور ترکی میں بیس لاکھ چندہ جمع کیا۔" (ہماری آزادی ص ۱۰)

مولانا آزاد کی یہ بات محتاج ثبوت ہے، [illegible] القادری کی تحقیق کے مطابق "مولانا ابو الکلام آزاد کے والد اس کمیٹی کے رکن بھی نہیں تھے۔ (یادرفتگاں ص ۳۳۷)

[2] عیون الحجاج ۲/ ۳۰۷

میں مزید مفید معلومات درج کی ہیں۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جا سکتی ہے کہ اس طرح کے تذکرے یا واقعات وہی شخص قلم بند کر سکتا ہے جو تاریخ یا تاریخ کے موڑ پر پیش آنے والے واقعات و حادثات سے بخوبی واقف ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا اعظمی نے ایسے واقعات کا انتخاب کیا ہے جو عام طور پر اردو کی کتابوں میں پڑھنے کو نہیں ملتے ہیں، جو چھوٹے تو ضرور ہیں مگر بڑے اہم ہیں۔ اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اعظمی کی تاریخ و سیر پر مضبوط گرفت تھی۔ حج کے ساتھ تاریخ و سیر کے امتزاج نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مولانا نے ۱۲ صفحے میں اس کتاب پر مقدمہ بھی تحریر فرمایا، حج کے فوائد و منافع، علم کی ترقی و اشاعت میں حج کا کیا رول رہا ہے، حج کے موسم میں کتابوں کی تصنیف، تسوید اور تبییض وغیرہ تمام چیزوں کا مولانا نے اجمالی جائزہ لیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عیون الحج کا تعارف و پیش لفظ تحریر فرمایا، علامہ ندوی لکھتے ہیں

"شکر و مسرت کا مقام ہے کہ فاضل گرامی محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے اس سلسلہ کو شروع کیا اور ایک نہایت مفید اور جامع کتاب تیار فرما دی۔"

مولانا [illegible] اس کتاب کی تعریف و توصیف ایک مکتوب میں اس طرح فرماتے ہیں

"يا صاحب الفضيلة قال في كشف الظنون عن كتاب أشنوتند لابن رجب إنها من عجائب الدهر، وإن كتابكم أيضا من عجائب الدهر في بابه وأسلوبه ومحتوياته،

۱؎ [illegible] ص ۱۱

وابتداؤكم فيه باشرف المخلوقات جعله من اعجب العجائب الهاماً من الله سبحانه وتعالى"۔!

(ابن رجب کی کتاب القوائد کے بارے میں کشف الظنون میں ہے کہ وہ عجائبات زمانہ میں سے ہے، اسی طرح آپکی کتاب بھی موضوع، اسلوب، اور مضامین کے اعتبار سے عجائبات زمانہ میں سے ہے اشرف المخلوقات علیہ السلام کے ذکر سے آپ کی ابتداء نے اس کتاب کو عجائبات میں سے بھی ایک اعجوبہ بنا دیا ہے۔)

ابتداءً اس تذکرہ کی چند قسطیں 'ابلاغ' ممبئی اور کچھ 'الصدیق' ملتان میں شائع ہوئیں۔ بعد میں 'اعیان الحجاج' کے نام سے یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی۔ جلد اول پہلی دفعہ ۱۹۵۸ء میں مکتبہ اعظمی مئو سے شائع ہوئی، اور دوسری جلد ۱۹۷۷ء میں مکتبہ اعظمی سے ہی شائع ہوئی۔ اب یہ کتاب پاکستان سے بھی شائع ہوگئی ہے۔ پاکستانی ایڈیشن میں دونوں جلدیں یکجا کردی گئی ہیں۔

دست کار اہل شرف

جس طرح تاریخ شاہان اولوالعزم کی مہم آزمائیوں کا نام نہیں، اسی طرح تاریخ نویسی بھی کسی عہد کے صرف اہم ترین واقعات کی جمع وتدوین کا نام نہیں۔ کسی عہد میں پیش آنے والے معمولی سے معمولی واقعات بھی تاریخ میں نقطہ انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے تاریخ کی ترتیب عمل میں آئی تا کہ زمانہ کے ہر نشیب وفراز پر روشنی پڑ سکے، یہی سبب ہے کہ قوس قزح کی طرح تاریخ کے بھی مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔

ا۔ حیات ص ۵۸۴-۵۸۵

اسلام نے ایک بنیادی اصول یہ طے کر دیا تھا کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" لیکن اس اہم تعلیم کے بعد بھی مسلمانوں میں قبائلی پیشہ ورانہ امتیازات باقی رہے۔ ہندوستان کے مخصوص معاشرتی و معاشی پس منظر میں مختلف طبقات نے جنم لیا اور انکے بیچ تعصبات رہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان بنیادوں پر طبقاتی و پیشہ ورانہ امتیازات کو سبب ترجیح وفضیلت بنایا۔

ظاہر ہے کہ جب کچھ کو ترجیح دی جائے گی تو جو باقی ماندہ ہوں گے وہ کمتر سمجھے جائیں گے۔ اس مخصوص تناظر میں ہندوستان کے پیشہ ورانہ نظام میں برطانوی سامراج اور بہت سے دوسرے سیاسی و سماجی عوامل نے ایک خط فاصل کھینچ دیا۔ چنانچہ جاگیردار اشرافیہ نے دستکاروں یا معمولی پیشہ اپنانے والوں کو کمتر سمجھنے کا رویہ اختیار کیا۔ اس کا فطری ردعمل بھی ہونا چاہئے تھا، جو ہوا۔ اس ردعمل کا ہم اپنے معاشرہ میں آسانی سے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کو تاریخ وسیر اور تذکرہ نویسی سے خاص شغف تھا، انکے اس ذوق کو حدیث کی تحقیق نے اور نکھار دیا تھا، کیونکہ راویان حدیث کے حالات کی چھان بین، قدیم زمانہ کے معاشرہ سے پوری طرح واقفیت و باخبری، اور اس دور کے اعیان واکابر کے حالات کا علم، یہ تمام چیزیں ایک محدث کے لئے تحقیقی مسائل ہیں۔ اسی لئے تاریخ وتذکرہ کی ترتیب میں بھی مولانا کے حدیث سے تعلق کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

وقت یا زمانہ اور اس میں بدلتے ہوئے واقعات وحالات کے پیش نظر مولانا اعظمی نے اردو زبان میں ایک تذکرہ مرتب کیا۔ اس تذکرہ میں انہوں نے مسلمانوں کے درمیان نسلی بنیاد پر تفضل اور برتری کی دیوار کو منہدم کر کے اسلامی اخوت کی بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرنے کی ایک کوشش کی ہے۔ مولانا کی تصنیف کا

حسب خود نفیس کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

"آج مسلمان عہدوں کے حصول اور ملازمتوں کو سرمایۂ عزت وافتخار اور ہاتھ سے کام کرنے کو معیوب اور پست کام سمجھنے لگے ہیں، اس کا ایک طرف یہ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے کہ بے شمار اشخاص بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جو لوگ دینی یا دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہیں یا ان کے پاس پیسے ہیں وہ دست کاروں کو ذلت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں انہیں باتوں کے پیش نظر برسوں سے یہ خیال ہو رہا تھا کہ محترف اعیان و اکابر اسلام کا ایک جامع تذکرہ قلمبند کیا جائے، جس میں ایک ایک پیشہ کو لے کر اس کے اختیار کرنے والے نامور حضرات کا حال لکھا جائے۔"[1]

چنانچہ مولانا نے "پارچہ بافی" کے پیشہ کو ذریعۂ معاش بنانے والے اکابر اسلام یا اس کو اگر وسیلۂ معاش نہ بھی بنایا ہو تو بھی کسی نہ کسی شکل میں بننے والی اہم شخصیات کا تذکرہ مرتب فرمایا۔ مولانا اعظمی نے پیشہ ورانہ بنیادوں پر بنکروں کی اہمیت ایک صحت مند سماج اور مذہبی معاشرہ میں ان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس تذکرہ کو مرتب کیا ہے۔

اس سلسلہ کی صرف ایک ہی کڑی یعنی پارچہ بافی کا ہی تذکرہ مرتب ہو سکا، غالباً دوسرے تحقیقی امور اور علمی کاموں نے اس جانب متوجہ ہونے کی اجازت نہ دی۔ اور صنعت وحرفت کے اکابر اسلام وارباب فضل وکمال سے واقفیت کا یہ سلسلہ پارچہ بافی پر ہی موقوف ہو کر رہ گیا۔ اس صنعت کے اعیان کا تذکرہ مرتب کرنے میں ممکن ہے کہ ایک ترجیحی پہلو یہ رہا ہو کہ مولانا اعظمی کا بھی اسی صنعت (پارچہ بافی) سے

۱۔ دستکار اہل شرف ص ۱۰-۱

تعلق تھا۔ مولانا کی اس کتاب کا نام "دستکار اہل شرف۔ تذکرۂ نساجین" ہے۔

اس کتاب کا آغاز انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام سے ہوتا ہے، انبیاء میں بھی حضرت آدم سے۔ حضرت آدم کے تذکرہ میں البدایہ والنہایہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"وکان اول کسوتهما من شعر الضان جزاه وغزلاه فنسج
ه آدم جبة ولحواء درعاً وخماراً"۔

(آدم وحوا کا پہلا لباس بھیڑ کے بالوں کا تھا، دونوں نے بال کاٹے اور انکو کاتا پھر آدم نے اپنے لئے ایک جبہ کا اور حواء کے لئے ایک درع اور ایک خمار کا کپڑا بنا۔)

انبیاء کے ذکر کے بعد ان صحابہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے کپڑے بنے، اسی طرح سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور عہد بعہد حروف تہجی کے اعتبار سے اہم شخصیات کا ذکر آتا جاتا ہے۔ بعض جگہ ترتیب میں چوک بھی ہوئی ہے جس کی نشاندہی مولانا نے خود بھی فرمائی۔ تذکرہ کا یہ سلسلہ عائشہ باعونیہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کبیر داس کا بھی تذکرہ ہے۔ آخر میں ایک صفحہ میں تنبیہات وتوضیحات اور ایک صفحہ میں تتمہ ہے۔

موضوع سے مناسبت کی وجہ سے مولانا اعظمی کے ایک مختصر مگر مفید رسالہ کو بھی کتاب کے آخر میں ملحق کیا گیا ہے۔ اس ضمیمہ کا نام "دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز" ہے۔ مولانا نے اس کتابچہ میں دنیا کے ان شہروں، علاقوں یا مقامات کا تذکرہ کیا ہے، جنہوں نے پارچہ بافی کے لحاظ سے ناموری حاصل کی۔

"دنیا میں پارچہ بافی کے مرکز" میں مدینہ منورہ، یمن، عراق، میسوپوٹامیا، بغداد، بلاد مغرب، ایشیائے کوچک، ترکی، قسطنطنیہ، البانیہ، چین، ترکستان، تبت، شام،

۱؎ دستکار اہل شرف ص ۳

مصر اور ہندوستان وغیرہ کا ذکر ہے، جہاں پارچہ بافی ہو کرتی تھی یا ہوتی ہے۔

اس رسالہ میں تقریباً دنیا کے مشہور، پارچہ بافی کے مراکز کا ذکر آگیا ہے۔ مولانا اعظمی نے سب سے آخر میں ہندوستان کا ذکر کیا۔ ہندوستان نے کپڑے بننے میں اس قدر ناموری حاصل کی تھی کہ بقول پروفیسر الیاس برنی کے کہ۔ اٹھارہویں صدی کے نصف تک پارچہ بافی کا کاروبار ہندوستان بھر میں اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کی مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا، انگریزوں نے سب سے پہلے ہندوستان کی اسی صنعت پر وار کیا اور اسے تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔[1]

"دست کار اہل شرف-تذکرۂ نساجین" ایک بہت دلچسپ اور معلومات افزا (Informative) کتاب ہے، بلکہ اسے تخزینۂ معلومات کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ کتاب تاریخی اور جغرافیائی حالات سے مولانا اعظمی کی واقفیت کی آئینہ دار ہے۔ اس کی جمع وترتیب میں عربی لٹریچر سے خاص طور سے مدد لی گئی ہے، جس سے عربی ادب پر مولانا کی کتنی مضبوط گرفت ہے اسکا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں فارسی اشعار بھی ہیں۔ عربی وفارسی اشعار، اکابر کے اقوال وفرمودات، سفرنامے، اور مستند مراجع کے حوالوں نے اس کتاب کی زینت، افادیت اور استناد میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

"دست کار اہل شرف-تذکرۂ نساجین" کا پہلا ایڈیشن ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں المجمع العلمی مئو سے شائع ہوا۔

---

[1] علم المعیشت ص ۵۹۲-۵۹۳ پروفیسر الیاس برنی

مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟

مبارق الازہار مشارق الانوار کی شرح ہے، استنبول سے چھپ کر شائع ہوچکی ہے۔ یہ شرح بہت مقبول ہوئی۔ مبارق الازہار کی نسبت قاضی سید نور الدین صاحب نے معارف جولائی ۹۴۹ء میں اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب استاذ شعبہ عربی سمعیل کالج بمبئی نے معارف اکتوبر ۵۰ء میں یہ تحقیق پیش کی کہ یہ ایک ہندوستانی عالم کی تصنیف ہے، جو احمد آباد کے باشندہ تھے۔ ان کے والد کا نام عبد الملک مدنی تھا، اور ان کی وفات ۹۱۵ھ میں ہوئی۔ یعنی فاضل مقالہ نگاروں کے مطابق مبارق الازہار کے مصنف عبد اللطیف بن عبد الملک بجانی احمد آبادی تھے۔

مولانا اعظمی نے اس تحقیق پر ایک تنقید لکھی جو "مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟" کے عنوان سے معارف ش اج ۳۰۷ (جنوری ۱۹۵۴ء) میں شائع ہوئی۔ انہوں نے فاضل مضمون نگاروں کی اس تحقیق وانکشاف کو تاریخی عقبار سے ناقابل قبول بتایا، اور اسے ایک ایسا دعوی قرار دیا جس کی تائید کہیں سے نہیں ہوتی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی تحقیق یہ ہے کہ مبارق الازہار شرح مشارق الانوار کے مصنف عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن لملک ہیں جو نہ بجانی ہیں، نہ احمد آبادی، اور نہ ان کی وفات ۹۱۵ء میں ہوئی۔

مولانا نے اپنے موقف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل شواہد پیش کئے

۱۔ جن مصنفین نے بھی ابن فرشتہ یا مبارق الازہار کا ذکر کیا ہے سبھی نے اس کو عبد اللطیف بن الملک کی تصنیف بتایا ہے۔ مولانا نے الضوء اللامع، الشقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار، شذرات وغیرہ کا حوالہ دیا۔

۲۔ مبارق کے مصنف نے خود اپنے نام کی تصریح کی ہے "وبعد فیقول العبد

لصحیف العزیز عبد اللطیف بن عبد العزیز المعروف بابن الملک"
(مبارق ج ص ۲)

۳۔ الضوء اللامع، الشقائق النعمانیہ، اعلام الاخیار، شذرات وغیرہ کسی کتاب میں مصنف کے والد کا نام عبد العزیز ہے، یا صرف عبد اللطیف ابن الملک لکھا ہوا ہے۔ ان میں سے کسی میں مصنف کے والد کا نام عبد الملک نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دادا کا نام کسی نے محمود بھی نہیں بتایا ہے جیسے کہ مقالہ نگار سید باقر علی صاحب نے لکھا ہے۔

۴۔ کسی مصنف نے ان کو ہندی یا ملتانی نہیں لکھا ہے، بلکہ طاش کبری زادہ نے ان کو ترکی کا باشندہ قرار دیا ہے۔ (الشقائق النعمانیہ ص ۲۳)

ان دلائل کی روشنی میں مولانا اعظمی اس نتیجے پر پہنچے کہ مقالہ نگاروں کو اشتباہ ہوا ہے۔ انہوں نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے وہ ابن فرشتہ اور شارح مشارق کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہیں جن کے والد کا نام عبد الملک ملتانی تھا، وہ نسباً عباسی اور احمد آباد کے باشندہ تھے، مگر غلطی سے ان کو شارح مشارق تصور کر لیا گیا۔

مولانا اعظمی نے سنہ وفات سے بھی بحث کی۔ مقالہ نگار حضرات نے جن عبد اللطیف کا ذکر کیا ہے، ان کا سنہ وفات ۹۹۰ھ لکھا، جس کا مطلب یہ ہو کہ وہ دسویں صدی کے عالم ہیں حالانکہ وہ نویں صدی کے علماء میں ہیں، دلیل میں مولانا نے سخاوی کی الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ کئے جانے کو کافی سمجھا اور پھر سخاوی کے اس تحریر سے یہ بتایا کہ ان کی وفات نویں صدی میں ہو چکی تھی، اور طاش کبری زادہ نے ان کو سلطان بایزید یلدرم کے عہد حکومت کے علماء میں بتایا ہے، اور سلطان بایزید یلدرم کا عہد حکومت ۷۹۱ھ سے ۸۰۵ھ تک ہے۔

سید نور الدین حسین صاحب اور ڈاکٹر سید باقر علی صاحب نے عبد اللطیف احمد آبادی کا جو سنہ وفات ذکر کیا ہے، مولانا اعظمی نے اس کو بھی غلط سمجھا اور دلیل سے

اپنے دعوے کو ثابت کیا۔ تاریخ وفات پر کلام کرتے ہوئے مولانا نے [illegible]
جنیدیہ بتائی کہ قاضی سید نورالدین حسینی نے مبارق الازہار کا مصنف ملک عبداللطیف
داورالملک کو سمجھا، اور ان کا سال وفات ۹۰۱ھ لکھا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب نے
عبداللطیف بن عبدالملک سنبلی کو مبارق کا مصنف تصور کر کے یہ تخیل قائم کیا ہے۔ یہ
عبداللطیف وہی ملک عبداللطیف داورالملک ہیں، بعدہ انہوں نے ان کا سنہ وفات بھی
۹۰۱ھ لکھ دیا حالانکہ یہ کسی طرح صحیح نہیں، یہ دونوں دو عبداللطیف ہیں۔ ان دونوں کے
علاوہ عبداللطیف بن ملک تیسرے بزرگ ہیں جن کی نسبت شوکانی نے لکھا ہے

"وله تصانيف منها شرح المشارق، وكان من علماء الروم
الموجودين في أيام السلطان مراد"

(ان کی متعدد تصنیفات ہیں، ان میں سے ایک شرح مشارق ہے، وہ
ایک رومی عالم تھے، سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے۔)

(البدر الطالع ج ۱ ص ۴۲۳ بحوالہ معارف ا ص ۳۷)

الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟

کتاب الذخائر والتحف مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مقدمے کے
ساتھ شائع ہوئی، اس پر معارف (اپریل و مئی ۱۹۶۰ء) میں مولانا قاضی اطہر صاحب
مبارکپوری کے قلم سے تبصرہ بھی شائع ہوا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کتاب کے مصنف کی نسبت مقدمہ میں لکھا کہ اس کا
حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، البتہ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم کی تصنیف ہے۔

معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں قاضی اطہر مبارکپوری نے ڈاکٹر حمید اللہ کی
رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی کہ القاضی الرشید بن [illegible] علی
کا تذکرہ تاریخ ابن خلکان میں ہے، اور وہ پانچویں صدی کے نہیں۔ چھٹی صدی کے عالم
ہیں۔ قاضی صاحب انہیں کو "الذخائر والتحف" کا مصنف مانتے ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب ان القاضی الرشید کی نہیں ہے،
جن کا تذکرہ ابن خلکان میں ہے، اس لئے کہ یہ چھٹی صدی کے عالم ہیں، اور کتاب
کی اندرونی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف پانچویں صدی میں تھا۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے معارف نمبر ۲ جلد ۸۷ (فروری
۱۹۶۱ء) میں اس مسئلہ پر "الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟" کے عنوان سے ایک
تحقیقی مضمون لکھا۔ اس مضمون میں مولانا نے ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر مبارکپوری
کے موقف اور دلائل کا محاکمہ و تجزیہ کیا اور اپنی ایک فیصلہ کن رائے پیش کی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ تین شخصیتیں ہیں جن کا لقب القاضی الرشید بتایا گیا
ہے۔ ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید ہیں، جن کا نام احمد ہے۔ دوسرے
کے والد علی ہیں، اور تیسرے کے دادا ابراہیم ہیں۔

مولانا کے مطابق آخر والے دونوں القاضی الرشید کا تذکرہ دوسری جگہ تو
نہیں مل سکا، حالانکہ ان دونوں کا تذکرہ الطالع السعید مطبوعہ مصر ۱۳۳۳ھ میں موجود
ہے۔ علی کی وفات ۵۲۵ھ میں ہوئی، اور ابراہیم کی نسبت مرقوم ہے کہ وہ [illegible]ھ میں
اطراف قوص کے حاکم تھے۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ احمد اور علی کا زمانہ
چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

مولانا اعظمی نے ہر دو محققین کی آراء کو دلائل و قرائن کی بنیاد پر پرکھا اور
جانچا، جس کا تفصیلی ذکر یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ مولانا اپنی تحقیق کی

روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچے کہ "الذخائر والتحف" کے مصنف پانچویں صدی کے ہیں، اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ارمانوس ۴۶۳ھ میں موجود تھا، اور مصنف ذخائر کی تصریح کے مطابق ابوالفضل ابراہیم نے ارمانوس کو دیکھا ہے، چنانچہ اس کے معاصر ہیں، اور ان کا زمانہ بھی پانچویں صدی ہے۔ مصنف ذخائر کا یہ بھی بیان ہے کہ "ابوالفضل نے مجھ سے فلاں واقعہ بیان کیا ہے" لہذا مصنف ذخائر ابوالفضل کے معاصر ثابت ہوئے۔

مولانا اعظمی کے بقول جب یہ بات ضروری ہوگئی کہ ذخائر کے مصنف پانچویں صدی کے اعیان میں ہیں، اور ابن خلکان والے قاضی رشید چھٹی صدی کے فاضل ہیں۔ اسی طرح ان کے باپ علی بن ابراہیم کا شمار بھی چھٹی صدی ہی کے فضلاء میں ہے۔ اور ہرچند کہ وہ پانچویں میں بھی موجود رہے ہوں گے، لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ ۴۵۸ھ کے لگ بھگ ان کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو، البتہ ابن خلکان والے قاضی رشید کے دادا ابراہیم چونکہ ۴۷۲ھ میں ولایت قوص کے حاکم تھے، اس لئے ۴۵۸ھ میں ان کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو سکتی ہے۔

بہرحال مولانا اعظمی نے ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے کو قرین قیاس قرار دیا اور اپنا رجحان بھی اس کی طرف ظاہر کیا کہ الذخائر والتحف ابن خلکان والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم کی تصنیف ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اپنے اس مضمون کے آخر میں چند مفید اور معلومات افزا نکات کا بھی اضافہ کیا ہے۔

سید مرتضیٰ زبیدی ہندوستانی تھے

سید عبد السلام احمد فراج نے تاج العروس کی تحقیق کی ہے۔ مقدمہ میں انہوں نے یہ بحث اٹھائی کہ تاج العروس کے مصنف سید مرتضیٰ زبیدی ہندی الاصل ہیں یا نہیں؟

سید عبد السلام کی تحقیق کے مطابق زبیدی عراقی الاصل ہیں، ہندوستانی نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں دلائل وشواہد بھی پیش کیے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی نے سید عبد السلام کی تحقیق پر عربی میں ایک تنقیدی مضمون تحریر فرمایا۔ انہوں نے اس مضمون میں محقق کی اس بات کی تحقیق سے تردید کی کہ زبیدی عراقی الاصل ہیں، ہندی نہیں ہیں۔ مولانا نے یہ تنقیدی مضمون عربی میں "السید مرتضى الزبيدي هندي لايحوم حوله شك" کے عنوان سے تحریر فرمایا۔

مولانا اعظمی کی تحقیق کے مطابق زبیدی ہندوستانی ہیں، ان کا وطن بلگرام ہے، پانچویں صدی کے قریب زبیدی کا خاندان یا آباء واجداد نے بلگرام کو اپنا وطن بنایا تھا، سید غلام علی بلگرامی اور سید مرتضیٰ زبیدی دونوں کا نسب سید محمد صغری واسطی ثم بلگرامی سے ملتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ وجیہ الدین صاحب بحر زخار جو زبیدی کے معاصر ہیں، ان کا بیان ہے کہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرام میں ۱۱۴۵ھ میں پیدا ہوئے، ایک زمانہ تک یہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر یہاں سے سندیلہ اور خیر آباد گئے اور وہاں کے اساتذہ سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد دہلی کا سفر کیا، جہاں انہوں نے شاہ ولی اللہ بن عبد الرحیم دہلوی سے اکتساب فیض کیا، پھر سورت گئے۔ وہاں انہوں نے شیخ خیر الدین بن زاہد سورتی سے استفادہ کیا، ان کے پاس ایک سال

تک قیام کیا، اس کے بعد وہاں سے حجاز کا سفر کیا۔

علامہ علی بلگرامی فرماتے ہیں کہ مرتضیٰ زبیدی کو کمسنی میں ہی حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی، مقامات مقدسہ میں حدیث کا علم حاصل کیا، ابتداء میں وہ زبید (یمن) میں مقیم رہے اور شیخ عبدالخالق زبیدی کی خدمت میں رہ کر سماع حدیث اور قرأت کتب میں مشغول رہے۔ مولانا نے اس تعارف کے بعد محقق علامہ سے سوال کیا کہ کیا یہ گفتگو زبیدی کے علاوہ کسی اور مرتضیٰ کے بارے میں ہو رہی ہے؟

مولانا نے اپنے موقف کی تائید میں زبیدی کی ایک تحریر کا حوالہ دیا جو انہیں کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ملی، اس تحریر میں انہوں نے اپنے بھتیجے سید باسط علی بن سید علی بن سید محمد بن سید قادری کو اجازت حدیث دی ہے، اور سید باسط علی بلگرام کے ہیں۔

مولانا ان تفصیلات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ زبیدی ہندی الاصل والمولد ہیں، اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں، اس حقیقت سے انکار مغالطہ پر مبنی ہوگا۔

استاذ سید عبدالسلام کا خیال ہے کہ زبیدی نے زبید میں تعلیم پانے کے بعد دہلی کا سفر کیا۔

مولانا عظمی نے محقق علامہ کے اس خیال کی بھی تردید کی، کیونکہ مورخین ومعاصرین کی تصریحات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے شہر سندیلہ، خیرآباد، دہلی اور سورت کا سفر زبیدی نے سفر حجاز سے پہلے کیا۔ زبیدی ٦٣ھ میں مدینہ اور ٦٤ھ میں مکہ میں تھے۔ اس کے بعد زبید منتقل ہو گئے اور وہاں ٦٦ھ تک قیام کیا، اسی سال حجاز گئے اور طائف میں مقیم ہوئے، اور حج وزیارت کر کے ٦٧ھ میں مصر کا سفر کیا، اس میں کہیں سے بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ زبیدی نے زبید میں تعلیم پانے کے بعد دہلی کا سفر کیا، بلکہ اس تفصیل میں تو اس کی نفی ہے۔

ان سب سے بڑھ کر اسی تحریر میں جو مولانا اعظمی کو تحت خانہ صعیب سے دستیاب ہوئی تھی زبیدی کے ہی قلم سے یہ تصریح موجود ہے کہ انہوں نے دہلی میں شاہ ولی اللہ کے آستانہ پر حاضر ہو کر اکتساب فیض کیا اور سماعت حدیث کی۔ شاہ صاحب نے ان کو اذکار و اوراد کی تلقین کی اور اجازت سے نوازا۔ یہ سب کچھ ۱۱۵۹ھ میں ہوا۔ (ص ۲۶)

ایک اور جگہ زبیدی اس ذکر کرتے ہیں کہ انہوں نے سید حسین عباسی مقیم اکبر آباد سے فیض حاصل کیا، انہوں نے بھی اذکار کی تلقین کی اور خرقہ خلافت سے نوازا اور اجازت دی۔ یہ واقعہ ۱۱۶۰ھ کا ہے۔ زبیدی ان تحریروں میں خود اقرار کر رہے ہیں کہ یہ سارے واقعات حجاز کے سفر اور زبید میں تعلیم حاصل کرنے سے پہلے کے ہیں۔

استاذ عبد السلام کا کہنا ہے کہ زبیدی نے (وسط) کے مادہ میں چند مقامات کو شمار کیا ہے، لیکن کسی ایک مقام کی طرف انہوں نے اشارہ نہیں کیا کہ وہ ان کی اصل ہے، بلکہ ایک خط میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی اصل عراق ہے۔

مولانا اعظمی اس کا جواب دیتے ہیں کہ زبیدی نے اگرچہ وسط کے مادہ سے مشتق مقامات میں سے کسی بھی مقام کی جانب اپنی اصل ہونے کا اشارہ نہیں کیا ہے، لیکن کئی جگہ زبیدی نے خود کو واسطی لکھا ہے۔ خود محقق عبد السلام نے زبیدی کا قول نقل کیا ہے (الحسيني الواسطي العراقي الأصل الزبيدي نزيل مصر) اسی طرح انہوں نے زبیدی کے بارے میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ خود کو معجم صغیر میں (الحسيني الواسطي) لکھ رہے ہیں

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ زبیدی کے عراقی الاصل ہونے سے ان کے ہندوستانی نہ ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بلگرام کے اکثر سادات کا دعوی ہے کہ ان کی اصل عراق کے واسط سے ہے، حالانکہ قطعی طور پر وہ ہندوستانی ہیں۔

سید غلام علی آزاد مآثر الکرام میں یہاں تذکرہ یوں لکھتے ہیں (الواسطي اصلاً

والبلگرامي منشأ) ج ا ص ۱۲، (الواسطي أصلاً، والبلگرامي مولداً و منشأ) ج ۲ ص ۲۹۔ مختصر یہ کہ بلگرام کے سادات عراقی الاصل ہیں، اور ان کا مولد اور وطن ہندوستان ہے۔

سید عبد السلام کہتے ہیں کہ اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ زبیدی ہندوستان میں پیدا ہوئے تو بھی ان کا قیام وہاں ایک مختصر مدت کے لئے رہا۔

استاذ عبد السلام کی اس بات پر مولانا اعظمی نے تعجب کا اظہار فرمایا، کیونکہ سید عبد السلام نے اپنے مقدمہ میں خود ہی یہ اعتراف کیا ہے کہ زبیدی نے پہلا سفر اٹھارہ سال کی عمر میں کیا، کیا یہ مدت مختصر ہے؟

مولانا فرماتے ہیں کہ جب غلام علی بلگرامی وغیرہ کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے محقق علام نے بخوشی یہ بھی تسلیم کر لیا تو نہیں ان تذکرہ نگاروں پر اعتماد کرتے ہوئے یہ بھی مان لینا چاہئے کہ زبیدی حصول علم کے لئے ہندوستان میں پھرے، اور سورت میں ایک سال قیام کیا، پھر وہاں سے حجاز کا سفر کیا، اور یہ کہ وہ ہندوستان میں بلوغ کے بعد طویل مدت تک رہے۔ اس مدت (عمر) تک جس میں ہمارے یہاں کے طلبہ تعلیم مکمل کرتے ہیں اور علوم نقلیہ وعقلیہ میں سند فراغ حاصل کرتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی نے مزید دلائل دیئے اور یہ ثابت کیا کہ سید مرتضی زبیدی ہندوستانی ہیں۔ اس حقیقت کا انکار ان کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہوگا۔ مولانا نے اس مضمون سے تاریخ میں در آنے والی غلطی کا ازالہ فرمایا اور تاج العروس جیسی مرجعی حیثیت کی حامل کتاب کے مصنف کے بارے میں جو مغالطہ اور شک وشبہ پیدا ہو گیا تھا اسکو دور کیا۔ تاریخ کی یہ ایک اہم خدمت ہے۔ مولانا کا یہ مضمون عربی مجلہ البعث الاسلامی ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ میں شائع ہوا۔

مضامین و مقالات

(تاریخ و تذکرہ سے متعلق)

تاریخ و سیر سے متعلق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی کے دستیاب مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ مضامین کی ایک فہرست پیش کی جا رہی ہے۔

۱۔ سیرت ابراہیم ابن ادہم اور انکے مدفن کی تحقیق (الفرقان اپریل ۱۹۷۹ء)

۲۔ امام شافعی کے دو سفرنامے

۳۔ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۵۴ء)

۴۔ تصحیح و استدراک بسلسلۂ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (معارف جنوری ۱۹۵۵ء، دارالعلوم مئی، جون ۱۹۶۲ء)

۵۔ جواد ساباط (معارف اپریل ۱۹۲۸ء)

۶۔ حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (برہان مارچ و اپریل ۱۹۵۳ء)

۷۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی کی حیات مبارکہ کے تین دور (الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر)

۸۔ دیوبند اور مشائخ دیوبند (معارف اکتوبر ۱۹۶۵ء)

۹۔ صحابہ کے مختصر تذکرے

۱۰۔ علم و فضل میں خواتین کا حصہ

۱۱۔ فتوحات حضرت معاویہ تاریخ کی روشنی میں (دارالعلوم اپریل ۶۵ء)

۱۲۔ مولانا عبدالرحمن جامی اور انکا سفر حج (الفرقان اکتوبر، نومبر ۷۹ء، بلاغ جنوری ۱۹۷۶ء)

۱۳۔ تذکرہ مشاہیر قوم (امومن شوال، ذیقعدہ، ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ)

۱۴- علمائے اہل کمال (المومن جمادی الاولی والاخری اور رجب ۱۳۲۳ھ)

۱۵- تذکرۂ علماء (ناتمام)

۱۶- حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ (المآثر رجب تا رمضان ۱۳۱۹ھ)

ادب

مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے کچھ ابعاد ایسے ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مفسر تھے، محدث تھے، محقق تھے، مفتی تھے، مفکر تھے، لیکن ان تمام اوصاف کے ساتھ ادب کی تخلیقیت ان کے پورے وجود کا لازمہ تھی۔ وہ شاعر، انشاء پرداز اور ادیب بھی تھے، چنانچہ آئندہ صفحات میں ان کی ادبی خدمات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا اعظمی کا یہ پہلو زیادہ تر لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے، حالانکہ زندگی کا یہ وہ رخ ہے، جس کے ذکر کے بغیر مولانا کی شخصیت اور علم وادب سے متعلق ان کی خدمات کا ایک اہم ترین باب تشنہ و نامکمل رہ جائے گا۔

عربی نثر

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کو عربی زبان و ادب سے ابتداء ہی خاص مناسبت تھی، اس دلچسپی اور انس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ انہیں حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عرفی مئوی جیسے متبحر عالم دین اور عربی زبان و ادب کے ماہر کی شاگردی نصیب ہوئی، مولانا اعظمی بچپن سے ہی ان کی زیر تربیت رہے، شامل نصاب عربی ادب کی کتابوں کے علاوہ ادب کی متعدد کتابیں بدیع الزمان ہمدانی کی 'مقامات'، زمخشری کی 'اطواق الذہب'، ابن قتیبہ کی 'الشعر والشعراء'، 'قصیدہ بانت سعاد'، 'دیوان ابو العتاہیہ' اور کتب بیان ومعانی وغیرہ آپ سے پڑھیں، مولانا اعظمی اعیان

انجمن میں مولانا عبد الغفار صاحب کے تذکرہ میں خود یہ اعتراف کرتے ہیں کہ

"ناچیز کو بھی آپ ہی کی خدمت میں کچھ شدبد حاصل ہوئی"[۱]

عربی زبان میں مولانا کی استعداد، صلاحیت اور پختگی کا اندازہ دارالعلوم دیوبند کے امتحان داخلہ میں پیش آئے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے، اس واقعہ کو مولانا عبدالحفیظ صاحب رحمانی نے براہ راست مولانا اعظمی سے سن کر نقل کیا ہے، ہم اس واقعہ کو تلخیصاً یہاں نقل کرتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں مولانا اعظمی کا امتحان داخلہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لیا اور مشورہ دیا کہ ادب کی کوئی کتاب ضرور پڑھ لیں، مولانا اعظمی نے جواب دیا کہ "مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے" مولانا کے جواب پر مفتی صاحب کو حیرت ہوئی اور مقامات حریری کھول کر ان سے ترجمہ کرنے کو کہا، مولانا نے کتاب حل کرکے دو مقامہ روانی سے سنا دیا، مفتی محمد شفیع صاحب طالب علم کی اس ذہانت و لیاقت سے بہت متأثر ہوئے اور شیخ الادب والتفسیر حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کو یہ رپورٹ بھیجی کہ "ان کو ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مزید اطمینان حاصل کریں"

جب یہ رپورٹ مولانا اعزاز علی صاحب کے یہاں پہونچی تو انہوں نے مقامات حریری دے کر فرمایا کہ کوئی مقامہ پڑھو اور ترجمہ کرو، مولانا نے ایک مقامہ روانی سے سنانا شروع کیا تو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے درمیان میں روک کر نحوی صرفی تحلیل کے ساتھ دو تین الفاظ کے معانی پوچھے، جنہیں مولانا نے بتا دیا، اس پر مولانا اعزاز علی صاحب نے آخر میں فرمایا کہ

"ہاں مولوی صاحب تم کو مزید عربی ادب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، تم جیسے لئے جو مناسب سمجھو وہ پڑھو"[۲]

---

۱ الجیات اعجاز ۳۰۳-۳۸

۲ حیات ص ۸۰

مولانا جب دارالعلوم مئو سے فارغ ہوئے تو دورہ کے خاص استاد حضرت مولانا کریم بخش سنبھلی نے آپ کو خصوصی سند عطا کی حمد و ثناء کے بعد اس سند کو یہاں سے شروع کیا: "ان الفاضل اللبیب والأدیب الأریب العالم الیلمعی" ۱ (فاضل دانا، ادیب اریب، عالم ذکی) مولانا اعظمی کو ادب سے کس حد تک دلچسپی تھی کہ وہ طرز اظہار اور اسلوب میں بھی جمالیاتی طرز و نزاکت کا خیال رکھتے تھے، یہ درست ہے کہ صرف تشبیہ واستعارہ سے کوئی شہ پارہ تحریری ادب نہیں ہوتی، مگر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تشبیہ و استعارہ، کنایہ واشارہ یہ سب وہ موتی ہیں جن سے ادبی تاج جگمگاتا ہے۔

مولانا کی ادبی قابلیت کا اندازہ دور طالبعلمی کے لکھے ہوئے بعض خطوط سے بھی ہوتا ہے، چند خطوط ہماری خوش قسمتی سے دستیاب ہوگئے، انہیں مکتوبات میں ایک مکتوب حضرت مولانا فیض الحسن صاحب مئوی کے نام ہے، مولانا فیض الحسن صاحب مولانا اعظمی کے خاص رفیق اور بے تکلف دوست تھے۔ مولانا نے یہ خط مدرسہ مظہر العلوم بنارس سے ۱۹۲۷ء میں لکھا ہے، وہ خط پیش خدمت ہے

من المهدي في العصيان، عبد الله حبيب الرحمن، إلى المبدع الأبجل، بقية الكرام الأول صاحب الأخلاق الزاكيات، والصفات المرضيات

من ذكره ينفي الشجن　　أعني أخي فيض الحسن
يحميه ربي ذو المنن　　عن رتع أحماء المحن

لا زالت أعلام علومه منشورة، وعيني باجتلاء محياه مقرورة، أهدي إليه تسليمات أرق من ماء الشبيبة وأندى

---

۱ حیات ص ۱۳، ۱۴

لقاء الحبيبة، يهيظ أريجها المسك الأذفر، ويفوت ريها
فوائح العنبر اهدي إليه تحيات أحلى من الشهد والعسل
واشهى من اجتناء جنى القبل

وبعد فقد ورد كتابك أيها الصديق المصافي، بعد أن
اشتد شوقي إليه وطال احتفائه عن عيني، فأزاح الهموم عن
قلبي المتبول وكشف البلابل عن فؤادي المتبول، الكتيب
الذي هذه الرمس المسمى بتسميته بالحسان الكواعب،
والغواني المشرفات الحقائب، فيفسي كتاب يزرى سر ده
بذوائب الخرائد، وبمحاسن حوالك الصب المعنى بحب
النواهد، ويعير بياضه على عوارض البيض الخدود وعلى
لوامع ثنايا الرشاق القدود، وكتاب ينبئ عن اختلاب كاتبه
من حليب الأدب وورده مشارع العلم والحسب.

فأشكر بك على أن ثنيت عنان عنايتك نحوهذا العبد
الخامل، وشرفتني بتلك الهدية الثمينة، والحال أني لست
من أهلها، ثم استطلع منك انك متى ترمع الترحل إلى دارك
أعظمي، أرحل معك إن شاء الله تعالى واقرأ السلام مني
على أخينا الفاضل المولوي قمر الدين الأعظمي، أن من
سرى فيه ألفتكم مسرى الراح من النشوان.

اقل عباد الله حبيب الرحمن

من بلدة بارس

وها انا الآن مشتغل بأشغال الامتحان العامي، ولكن آخر

كلماتي أن ألتمس منك التعجيل في ابلاغ جواب كتابي بزاد التشريف بإيراده وأدعو الله الكريم أن يوفقك لحيازة قصبات السبق في مضامير العلوم فقط

حرره العاصي حبيب الرحمن الاعظمي

من مظهر العلوم الكائن في مدينه بنارس

شعبان ۱۳۶۳ھ

(غرقاب بحر عصیاں، بندۂ خدا حبیب الرحمن کی جانب سے فاضل مکرم، بقیۃ السلف کی خدمت میں، جن کے اخلاق پاکیزہ اور اوصاف پسندیدہ ہیں، جن کی یاد سے رنج وغم کافور ہوتے ہیں، یعنی برادر مکرم جناب مولوی فیض الحسن صاحب، رب محسن ومنعم رنج وغم سے ان کی حفاظت فرمائیں، اللہ کرے ان کے علم کا جھنڈا لہراتا رہے، اور میری آنکھیں ان کے چہرے کی زیارت سے ٹھنڈی رہیں، میں ان کی خدمت میں سلام کا ہدیہ پیش کرتا ہوں، ایسے سلام کا جو رونق جوانی سے بڑھ کر لطیف وروصال محبوب سے زیادہ لذیذ ہے، جس کی خوشبو، مشک پر غالب ہے اور عنبر کی عطر بیزی سے بڑھ کر ہے، میری طرف سے ان کے جناب میں شہد وشکر سے شیریں، اور بوس وکنار سے زیادہ حلاوت بخش دعائیں

میرے مخلص دوست! آپ کا خط مجھے میں شدت شوق کے وقت ملا، چند عرصہ سے آپ کے مکتوب کی زیارت سے میری نگاہیں محروم تھیں، آپ کے خط نے میرے شکستہ دل سے غموں کی مدہوب چھانٹ دیں، اور قلب

؎ مولانا اعظمی کی حیات وخدمات سے متعلق مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے ۵۴ صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا مرتب کیا تھا، یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے، خوش قسمتی سے اس کا قلمی مسودہ راقم الحروف کو دستیاب ہوگیا، یہ خط اس مسودہ میں صفحہ ۹ پر ہے، اس مسودہ کا حوالہ "قلمی تحریر" کے عنوان سے دیا جائے گا۔

حزیں کے اضطراب کو دور کر دیا، وہ دل جس کو ظالم زمانہ نے پری پیکروں ورنازک اندامو ں کی آرزو میں الجھا کر برباد کر دیا تھا، بخدا! آپکے سود خط نے حسین دوشیزاؤں کے زلف سیاہ کو مات، اور عاشق نامراد کے بخت تاریک کو شکست دے دی، ور آپ کے بیاض خط نے خوبصورت گورے چٹے رخساروں، اور حسینوں کے چمکتے ہوئے دانتوں کی روشنی کو دبا دیا، یہ خط اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا لکھنے والا ادب کے آب زلال سے سیراب اور علم وشرف کی دولت سے مالا مال ہے۔

شکر ہے کہ آپ نے عنان توجہ اس بندۂ گمنام کی جانب پھیری اور یہ قیمتی تحفہ ارسال کیا، حالانکہ میں اسکے لائق نہیں تھا، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ گھر کب تک جائیں گے، مجھے اطلاع دیجئے، میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا ان شاء اللہ، میری طرف سے خوننا الفاضل مولوی قمرالدین اعظمی کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

وہ جس کی رگ وپے میں آپ کی محبت اس طرح سرایت کر گئی ہے، جیسے نشہ والے میں شراب سرایت کرتی ہے۔

یعنی بندۂ کمترین حبیب الرحمٰن

(نوٹ) میں اس وقت سالانہ امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں ورآخر میں عرض ہے، س خط کا جواب جلد دیں گے، میں اللہ کے حضور دعا کرتا ہوں کہ آپ کو میدان علم میں سبقت کی توفیق بخشتے رہیں۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

مظہر العلوم بنارس

(یکم شعبان ۱۳۴۷ھ)

جس طالبعلم کے ادبی ذوق اور شاعرانہ ذکاوت کا یہ حال ہو، جس کی خداداد
ذہانت اور علمی لیاقت کی شہادت اس کے اساتذہ اور مشاہیر علماء دے رہے ہوں اس
طالبعلم کے فضل وکمال کا کیا کہنا!

مولانا اعظمی کی عربی زبان میں تین کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے، جن کی تصنیف
سے آپ ۲۳ برس کی عمر میں فارغ ہو چکے تھے التوضیة بأسرار التسمیة،
تذکرة أدباء الهند، الإتحافات السنیة بذکر محدثي الحنفیة

ان کے علاوہ مزید تین تصنیفات ہیں: الألباني شذوذه وأخطاؤه،
تجرید شواهد أوضح المسالك، الحاوي لرجال الطحاوي

عربی قواعد سے واقفیت مولانا اعظمی نے نحوی، صرفی قواعد وغیرہ کی تعلیم اعلیٰ
صلاحیت سے حاصل کی اور اساتذہ سے اکتساب فیض کر کے زبان کی فصاحت
وبلاغت سے باخبر ہوئے، تاہم عربی قواعد کے اصول وفروع میں مولانا کو مہارت
حاصل ہو گئی اور ان علوم کے شاذ و نادر دقیق مسائل بھی ان کے حیطہ علم میں آ گئے۔ یہی
وجہ ہے کہ نحو وصرف کی تصحیح پر بہت زور رہتا، مولانا کے درس میں عبارت خوانی کی صحت کا
خاص اہتمام تھا، طالبعلم کی ادنیٰ سی غلطی بھی برداشت نہیں کی جاتی۔ حدیث وفقہ کی دیگر
کتابوں کے ساتھ عربی ادب کی بھی کتابیں مولانا کے پاس رہتی تھیں، خاص طور پر
حماسہ وغیرہ، حماسہ کا درس تو بہت مشہور تھا، مولانا اعظمی کے شاگرد مفتی ظفیر الدین
صاحب مولانا اعظمی کے تدریس کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

> "عبارت خوانی میں صحت کا پورا خیال تھا ... حضرت مولانا حبیب
> الرحمن صاحب کے یہاں عبارت اور ترجمہ وغیرہ کا غلط کرنا طالبعلم کے

راقم حروف کی نظر سے یہ کتابیں نہیں گزری ہیں، سوانح میں ان تصنیفات کی نسبت مولانا کی طرف
کی گئی ہے، ... فہرست میں ان کتابوں کے بھی نام ہیں

ذمہ ہوتا تھا اور ایک زیر زبر کی غلطی بھی معاف نہیں کی جاتی تھی ذرا سی
غلطی پر صرفی، نحوی ترکیب وتحلیل پوچھنا شروع فرمادیا کرتے تھے
جن طلبہ کی صرف ونحو کمزور ہوتی تھی وہ عبارت نہیں پڑھ سکتے تھے۔"[1]

نحو پر مولانا اعظمی کی ایک غیر مطبوعہ کتاب بھی ہے، جسکا نام 'تجرید شواہد اوضح المسالک' ہے۔ ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۱ھ کی نحو کی مشہور کتاب، اوضح المسالک میں بطور شواہد جو اشعار ہیں، مولانا اعظمی نے اپنی اس کتاب میں انہیں جمع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتب ورسائل کی فہرست میں 'مفتاح النحو' نام کی بھی ایک کتاب کا تذکرہ ملتا ہے۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی عربی قواعد پر اس قدر عمیق نگاہ تھی اور اس سلسلے میں اتنا وسیع مطالعہ تھا کہ جہاں کہیں بھی غلطی ہوتی آپ کی عقابی نگاہ اسے ڈھونڈ نکالتی۔ اس کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو

'الرفع والتکمیل' کے پہلے ایڈیشن کے صفحے پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی عبارت ہے "وعدم فرقهم بين الجرح المبهم والجرح الغير المبهم"
اس پر شیخ ابوغدہ نے تعلیق تحریر فرمایا

"وهكذا جاء في الأصلين، وهو استعمال خاطئ وغلط شائع لما جمع فيه من ادخال 'ال' على 'غير' مع الاضافة الى ما فيه 'ال'، وصوابه أن يقال (الجرح غير المبهم).

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں اصلوں میں یہی ہے، یعنی اضافت کی حالت میں 'غیر' پر 'ال' کے استعمال کے ساتھ، لیکن یہ استعمال درست نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ 'الجرح غیر المبہم' کہا جائے، یعنی 'غیر' پر 'ال' نہ ہو۔
شیخ ابوغدہ کی اس تحقیق پر مولانا اعظمی نے حاشیہ لگایا

---

[1] زندگی کا علمی سفر ص ۳۱ مفتی محمد ظہیر الدین

"كيف تقطع بكون هذا الاستعمال خاطئاً مع قول سيبويه والمبرد أن كلمة (غير) مشبهة لاسم الفاعل بمعنى الحال وأن (غيرك) بمنزلة (مغايرك) فعلى هذا يجوز دخول ال على (غير) المضاف إلى محلى باللام راجع شرح التصريح لخالد الأزهري (۲/۲۷) و(۲/۲۹) واجب أن تزيد كلامك هذا إيضاحاً وتعزيزاً (الأعظمي)"

(اس استعمال کے غلط ہونے کا فیصلہ قطعی طور پر کیسے کرسکتے ہیں، جبکہ سیبویہ اور مبرد کا یہ قول ہے کہ لفظ 'غیر' اسم فاعل کے مشابہ اور حال کے معنی میں ہوتا ہے، اور (غیرک) (مغایرک) کے درجہ میں ہوتا ہے لہٰذا اس صورت میں غیر پر الف لام کا استعمال جبکہ وہ مضاف ہو کسی ایسے لفظ کی طرف جس پر الف لام داخل ہو درست ہے، حوالہ کے لئے شرح التصریح خالد ازہری کی جلد ۲ صفحہ ۲۷ و ۲۹ دیکھئے۔ لہٰذا آپ کے اس قول کی مزید وضاحت اور تائید ضروری ہے۔)

پھر بھی اس توجیہ کے سلسلہ میں مولانا اعظمی نے شیخ ابوغدہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا

"لقد وجدت في (إصلاح الفاسد من لغة الجرائد) كلاماً مشبعاً على تعريف (الغير) أرجو أن تكونوا قد وقفتم عليه وفيه ما يقوي رأيكم، ومع ذلك فيه ما يقوي اعتذاري عن الشيخ عبد الحي رحمه الله"

("إصلاح الفاسد من لغة الجرائد" میں لفظ 'الغیر' کی تعریف سے متعلق بڑی مفصل گفتگو مجھے ملی، امید ہے کہ آپ بھی اس سے واقف

ہوں گے، اس کے مبحث سے آپ کے خیال کی تائید ہوتی ہے، تاہم اس بحث کے اندر مولانا عبدالحئیؒ کی جانب سے میری عذرداری کے لئے بھی تقویت کا سامان موجود ہے۔)

اس پوری بحث میں مولانا اعظمی کی علمی دیانت کی بھی شہادت ملتی ہے، انہوں نے لفظ ٔغیر ٔ پر بحث کی اور پھر جب انہیں شیخ ابو غدہ کے موقف کی تائید کا علم ہوا تو اس خط سے مطلع فرمایا۔ اس خط سے یہ اندازہ کرنا کہ مولانا اعظمی کی تحقیق صحیح تھی درست نہ ہوگا؛ کیونکہ مولانا اپنے موقف کے بارے میں خود یہ لکھ رہے ہیں

'تاہم اس بحث کے اندر مولانا عبدالحئیؒ کی جانب سے میری عذرداری کے لئے بھی تقویت کا سامان موجود ہے۔'[۲]

<u>زبان دانی</u> حدیث کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ سولہ کتابیں ہیں جن پر مولانا اعظمی نے حواشی وتعلیقات لکھی ہیں، ان کے علاوہ متعدد ایسی کتابیں ہیں جن کی احادیث کی انہوں نے تحقیق کی یا جن کی اشاعت مولانا اعظمی کی مرہون منت ہے، حدیث کا اہم اور قدیم ترین مرجع 'مصنف عبدالرزاق' کی تحقیق ان کے بلند ادبی معیار کی آئینہ دار ہے، 'مجمع بحار الانوار' کی تصنیف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی کا عظیم کارنامہ ہے، محدث پٹنی نے اس کتاب میں قرآن مجید اور حدیث شریف کے مشکل الفاظ کی تشریح وتحقیق کی ہے۔ مولانا اعظمی نے قرآن وحدیث کی اس لغت پر بھی کام کیا ہے۔

تعلیقات میں مولانا اعظمی الفاظ کی تشریح وتحقیق کرتے ہیں، عبارت کے سیاق وسباق سے سقطات کی نشاندہی فرماتے ہیں، احادیث میں واقع ہونے والی

۱۔ الماثر فروری تا اپریل ۹۸ء ص ۳۸-۳۹

۲۔ مولانا کے علمی تواضع کی یہ بڑی اچھی مثال ہے کہ اس علمی بحث میں انہوں نے معترض کے موقف کو اپنا کر اعتراض مع اعتراف کے مسلک کو اختیار کیا ہے۔

اس پر حاشیہ ملاحظہ ہو

"في هامش الفتنية وفي اللغة هو بفتحتين قال الأعظمي أما بمعنى التكبر فكلاهما معروف في اللغة وأما الفرقة الجبرية فالصواب فيها بفتحتين، راجع القاموس"

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ مجمع بحار الانوار کے ہندی نسخہ کے حاشیہ میں ہے کہ لغت میں "جبرية" جیم اور باء دونوں کے فتحہ کے ساتھ کبر کے معنی میں ہے۔ مولانا اعظمی نے اس پر حاشیہ لگایا کہ کبر کے معنی میں لغت میں دونوں معروف ہیں، البتہ "الفرقة الجبرية" جب کہیں گے تو اس وقت جیم اور باء دونوں پر فتحہ ہوگا، قاموس سے مراجعت کیجئے۔

۴- مجمع بحار الانوار ص ۴۷۵ پر ایک لفظ ہے "حديا الناس" مولانا اعظمی حاشیہ میں اسکی تشریح فرماتے ہیں "حديا الناس عمن يتعداهم، يقال أنا حدياك في هذا الأمر، أي معارضك"

یعنی "حديا الناس" اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں سے جھگڑا اور مقابلہ کرتا پھرے، کہا جاتا ہے "أنا حدياك في هذا الأمر" میں اس بارے میں تجھ سے مقابلہ کرنے والا ہوں۔

۵- ابو حفص عمر بن خلف بن مکی صقلی تونسی متوفی ۵۰۱ھ کی کتاب "تثقيف اللسان وتلقيح الجنان" ڈاکٹر عبد العزیز مطر کی تحقیق سے لجنۃ احیاء التراث الاسلامی قاہرہ سے شائع ہوئی ہے، یہ کتاب لغت کے موضوع پر ہے، مولانا اعظمی نے اس پر چند حواشی رقم کئے ہیں، ایک حاشیہ ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۴۹ پر عربوں کا ایک مقولہ ہے "أملاك المعجبس أحد الرئبعين" ڈاکٹر عبد العزیز مطر نے اسکی تشریح میں لکھا

"في غريب الحديث (ورقة ۲۲۳) وقول عمر بن الخطاب: أملكوا العجين فإنه أحد الريعين أي أجيدوا عجنه، والريع الزيادة، فالريع الأول الزيادة في الطحن والثاني في العجين"

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ آٹا اچھی طرح گوندھنے سے اس میں زیادتی ہوتی ہے، اس مسئلہ میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ اچھی طرح آٹا گوندھو کہ وہ دو زیادتیوں میں سے ایک ہے، ریع زیادتی کے معنی میں ہے، پہلی زیادتی آٹا پیسنے کی اور دوسری گوندھنے کی۔

مولانا اعظمی نے محقق کے اس حاشیہ پر حاشیہ لگایا کہ "الربیع بالفتح النماء" ڈاکٹر مطر نے "اسکون" کے ساتھ لکھا ہے، مولانا اعظمی نے "اسکون" کے ساتھ لکھا اور یہ بتایا کہ اس کے معنی زیادتی کے ہیں۔

۲- کتاب نسب قریش للزبیر بن بکار، ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء میں پہلی مرتبہ محقق علامہ محمود محمد شاکر مصری کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ منظر عام پر آئی، جب یہ کتاب مولانا اعظمی کے ہاتھوں میں پہونچی تو انہوں نے دوران مطالعہ جہاں جہاں کتاب کی تحقیق وتشریح یا کسی لفظ کی لغوی بحث میں علامہ محمود محمد شاکر مصری سے ذہول یا سہو ہو گیا تھا، اس کو قلم بند فرمایا اور ایک مضمون کی شکل میں ان استدراکات کو مرتب کر کے مجلہ 'الحج' مکہ مکرمہ اور 'البعث الاسلامی' ہندوستان میں بھیج دیا۔ آپکی اس تنقیدی استدراک کو علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا، ان استدراکات کی تعداد ۳۰ ہے۔ یہاں بطور نمونہ ایک استدراک پیش خدمت ہے

کتاب میں ایک عبارت ہے "أطعمها صدقة على المخدمين

۱؎ المآثر نومبر تا جنوری ۹۷-۱۹۹۸ء ص ۳۶

بمكة" علامہ محمود محمد شاکر نے اس پر تعلیق لکھی

"المخدمون هم المخدومون يكثر خدمهم و حشمهم"

مخدم سے مراد مخدوم ہیں، جنکے خدم و نوکر چاکر بہت ہوں، پھر آگے لکھتے ہیں

"نشـأ أن يجعل معنى المخدمين هم الخدم" (ص ۲۲۳) ممکن ہے کہ مخدم سے مراد خدام ہی ہوں۔

مولانا اعظمی نے علامہ محمود محمد شاکر کی گرفت کی اور لکھا

"أقول هذا كله تعسف وتكلف، والصواب أن تلك الكلمة أخطأ المحقق في قراءتها، ولا شك أن صواب العبارة أظنها صدقة على المجذمين بمكة، يعني المجذمين المصابين بالجذام"

(یہ تمام باتیں تعسف وتکلف ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ محقق نے اس کلمہ کی قرأت میں غلطی کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح عبارت "أظنها صدقة على المجذمين بمكة" ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مخدمین نہیں ہے بلکہ مجذمین (جذام زدہ لوگ) ہے۔)

۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۵۶ پر یہ عبارت ہے "عن ابن عمر انه كره أن يتلثم الرجل في الصلاة" مولانا اعظمی نے حاشیہ میں "تلثم" کی تشریح کی "شد الفم باللثام، واللثام ما كان على الأنف وما حوله من ثوب أو نقاب"

تلثم منہ پر کپڑا (ڈھاٹا) باندھنے کو بولتے ہیں، لثام اس کپڑے یا نقاب کو کہتے ہیں جو ناک اور اس کے ارد گرد باندھا جائے۔

اسلوب نگارش اسلوب نگارش میں سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مولانا کی عبارت

۱۔ البلاغ اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۹۱، البعث الاسلامی اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۱۳-۱۴

موضوع کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، اکثر سے مترادف مرتب ہوتے ہیں اور بعض مختلف
موضوعات پر لکھتے ہیں اس لئے ہر موضوع کی مناسبت سے ان کا جداگانہ طرز ہوتا ہے۔ انداز
پرواز بیان نہیں ہے۔ عربی زبان تک ہی محدود نہیں بلکہ اردو زبان میں بھی یہی صورت ہے۔

مولانا اعظمی کے متفرق مضامین و مقالات سے پتہ چلتا ہے۔ ان کے
بیان اور ادائے مطلب کی پختہ صلاحیت تھی۔ ان کی تحریر میں سلاست، سادگی اور متانت
ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضمون کو پڑھ کر قاری کے سامنے وہ مخصوص موضوع یا
مسئلہ جس پر وہ لکھ رہے ہوتے ہیں آئینہ کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ ابن المقفع کے
مطابق بلاغت کا یہی مزاج اور تعریف بھی ہے۔

"هي التي اذا سمعها الجاهل ظن انه يحسن مثلها"[1]

(جاہل جب سنے تو سمجھے کہ وہ بھی اسی طرح بہترین کلام یا عبارت
پیش کر سکتا ہے۔)

مولانا کی انشاء پردازی کی ایک دوسری اہم خصوصیت ایجاز ہے۔ مطول
اور مفصل باتوں کو مختصر انداز اور چھوٹے پیرائے میں بڑے سلیقے سے پیش کرتے ہیں۔
ایک جملہ میں وہ مفہوم قاری تک پہونچا دیتے ہیں جو کبھی کبھی طویل عبارت میں بھی ادا
نہیں ہو پاتا۔ محدث اعظمی کی تصنیفات، تحریرات، خطوط اور بیاض میں ان کی تحریر کی یہ
خوبی نمایاں ہے۔ حدیث کی کتابوں پر مولانا نے جو مقدمے لکھے وہ ان کی بہترین
عربی نثر کی نمونہ ہیں، عربی زبان کے ادیبوں نے ان مقدموں کی تعریف و توصیف کی
ہے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مجمع بحار الانوار کے مقدمہ کی بہت تعریف کی،
جسے ہم مجمع بحار الانوار کے تعارف میں نقل بھی کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت
سے حضرات ہیں جنھوں نے مولانا کے عربی طرز نگارش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

۱۔ تاریخ ادب العربی ص ۲۰۷ حسن زیات

دوسری تحریروں کو چھوڑیئے اصرف ان تحریروں کو دیکھ لیجئے جن میں ... نامور حضرات اور مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے، کتنا مختصر ہے یہ تذکرہ لیکن اس ... شخصیت سے متعلق تمام پہلوؤں پر کس قدر حاوی ہے! ان تحریروں میں ... نے متعدد شخصیات کی وفات پر اپنے تاثرات، خیالات اور تعلقات کا اظہار ... اس موقع پر مولانا کی نثری تحریر کے چند نمونے پیش کئے جا رہے ہیں تا کہ ... اسلوب قاری کے سامنے خود آشکار ہو جائے۔

۱- ابو الکلام آزاد، منشی مجلة الهلال والبلاغ ومصنف تذكرة اولاً، ووزير معارف حكومة مركزية هند آزاد آخراً، ولاشك أنه كان نابغة جيد الحافظة، قوي الفكر، ذا بلاغة رائعة، كاتباً قديراً ابتدع اسلوباً جديداً في الإنشاء الأردوي، رأيته مراراً وسمعت خطباته، وكان من اركان مجلس العمل لجمعية علماء الهند المركزية وأنا من اعضائه ايضاً، فجالسته في ذلك المجلس عدة مرات، أصيب بالفالج وتوفي في أوائل شوال سنة ۱۳۷۷ھ

(ابوالکلام آزاد اولاً مجلہ الہلال اور البلاغ کے بانی اور تذکرہ کے مصنف اور آخر میں آزاد ہندوستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم تھے، بلا شبہ وہ جودت حافظہ، قوت فکر اور حیرت انگیز زور بیان میں نابغۂ روزگار اور یکتا انشاء پرداز تھے، اردو انشاء پردازی میں انہوں نے نیا طرز ایجاد کیا، میں نے انہیں بارہا دیکھا اور انکی تقریریں سنیں، وہ مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، اس وقت میں بھی ممبر تھا، لہذا مجلس میں بارہا

ے حیات ص ۶۲۷

میں ان کا اہم نشیں رہا، حج کا حصہ ہوا اور شوال سنہ ۱۴۰۳ھ کے اوائل میں رحلت فرما گئے۔)

۲-مولانا سید أبو الأعلى المودودي أبو الأعلى المودودي، كان كاتباً بليغاً، وله اطلاع وسع وتفكير قوي، وله تصانيف كثيرة في مختلف الموضوعات، أجاد في بعضها وأصاب، وأخطأ في بعضها وزاغ عن منهج الصواب، وتحصلت فتنة في الإسلام لبعض آرائه الشاذة، توفي في سبتمبر سنة ۱۹۷۹ في أمريكا، ونقلت جثته إلى باكستان ودفن هناك، وياليتهم لو التزموا بسنة الإسلام في التجهيز والتكفين ۔[1]

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی زور دار انشاء پرداز تھے، وسیع معلومات اور قوی تفکیر کے حامل تھے، مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی تصنیفات ہیں جن میں سے بعض اچھی اور صحیح ہیں، لیکن بعض میں انھوں نے غلطیاں کیں اور صحیح رستے سے ہٹ گئے، ان کے چند شاذ خیالات کی وجہ سے اسلام میں ایک فتنہ پیدا ہوگیا، ستمبر ۱۹۷۹ء میں امریکا میں وفات پائی اور ان کی نعش پاکستان لائی گئی اور وہیں مدفون ہوئے، کاش کہ تجہیز وتدفین میں اسلام کے طریقے کی پابندی کی گئی ہوتی۔)

۳-عبد الرزاق مليح آبادي منشي مجلات عديدة في كلكته، وصديق أبي الكلام آزاد، ومنشي ثقافة الهند في دهلي أخيراً، زار مصر وصحب الأستاذ رشيد رضا

[1] حیات ص ۶۵-۴۵۲

المصري منشئ المنار، وترجم كتباً عديدة، منها "العلم والعلماء"، صادفته في دهلي وغيرها مرات، فلم يعجبني حبه للتجدد وانحرافه عن مسلك الصالحين من العلماء، كان يحلق لحيته وشاربه، توفي في ۲۳/جون (يونيه) سنة ۱۹۵۹، ۲۵/ذي الحجة سنة ۱۳۷۸ھ في بومباي، وكان مصاباً كتداوى من مرض السرطان.

(عبدالرزاق ملیح آبادی، کلکتہ میں مختلف مجلات کے بانی، ابو الکلام آزاد کے دوست، اور آخر میں دہلی میں ثقافۃ الہند کے بانی تھے۔ مصر کا سفر کیا اور منار کے بانی استاذ رشید رضا مصری کی صحبت پائی، متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں سے ایک "علم و علماء" ہے، دہلی وغیرہ میں بارہا ان سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر انکی تجدد پسندی اور علماء صالحین کے مسلک سے انحراف مجھے پسند نہیں، وہ داڑھی مونچھ منڈواتے تھے۔ ۲۳ جون ۱۹۵۹ء، ۲۵/ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ کو بمبئی میں وفات پائی، وہاں وہ کینسر کے علاج کے لئے مقیم تھے۔)

۱ حیات ص ۶۲۹-۶۳۰

عربی نظم

ہندوستان کے علماء نے علوم و فنون اور تحقیق و تنقید میں ہی اپنی امتیازی حیثیت پیدا نہیں کی بلکہ شعر و سخن میں بھی طبع آزمائی کی، اور اس میں اس حد تک آگے آگے کہ ان کا شمار کہنہ مشق اور صاحب طرز شاعروں میں ہونے لگا، یہی نہیں کہ مادری زبان اردو میں ہی شاعری کی بلکہ عربی و فارسی میں بھی اس کے کلام سے دفتر شعر و سخن بھرے پڑے ہیں۔

عربی زبان کے اسرار و رموز سے آگاہ ان علماء کا ذوق سلیم اس قدر نکھرا ہوا تھا کہ عربی میں بے تکلف اشعار کہتے، داخلی کیفیات و جذبات کو بآسانی قصیدہ، غزل اور مرثیہ وغیرہ مختلف اصناف ادب میں پیش کرتے۔

ان کی شاعری لہو و لعب اور فحشیات سے بے نیاز ہے۔ اس کی قدر دانی میں جذبات و احساسات کی پاکیزگی اور جمالیاتی حس کا ایک خوبصورت امتزاج دکھتا ہے، علماء کی شاعری میں اخلاق کی بلندی اور عظمت و دانائی کی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

چونکہ ان علماء کے پیش نظر اسلامی علوم و فنون کی بقاء و ارتقاء تھی، اس لئے اس جانب بطور خاص متوجہ نہ ہوئے اور اسے تختۂ مشق نہ بنایا، یہ حضرات اگر اس جانب بطور خاص توجہ فرماتے تو یقیناً عربی زبان کے بلند پایہ شعراء میں ان کا شمار ہوتا۔

ان علماء نے پھر بھی ہر صنف میں طبع آزمائی کی، قصیدہ، غزل، مرثیہ وغیرہ تمام میں، تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مثال کے طور پر دیوبند کے علماء کو ہی لیجئے، ان علماء میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے داخلی کیفیت کو اشعار کے قالب میں ڈھالا، مثلاً شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ان دونوں بزرگوں نے اشعار کہے ہیں۔ حضرت

مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، عربی میں انہوں نے مرثیے اور قصیدے دونوں کہے، ان کا قصیدہ "دعاء المضطر" بہت مشہور ہے، علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے بھی قصیدے کہے ہیں، حضرت مولانا یوسف بنوری عربی کے برجستہ گو شاعر تھے، ان کا قصیدہ "[illegible] والمعراج" کافی مشہور ہے۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی وفات پر عربی میں مرثیہ کہا، مفتی کفایت اللہ صاحب نے حکیم اجمل خاں کا مرثیہ کہا، حضرت قاری محمد طیب صاحب نے "قاسم العلوم والخیرات" کے عنوان سے قصیدہ لکھا، مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنے اساتذہ وشیوخ کی وفات پر عربی میں مرثیے کہے، ان کے کئی مرثیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے بھی شاعری کے لئے موزوں طبیعت پائی تھی، یہ موزونی طبیعت ایسی نہیں کہ صرف ایک ہی زبان میں رہی ہو بلکہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں طور پر تھی، مولانا نے شاعری کب سے شروع کی، خواہ وہ عربی میں ہو، فارسی یا اردو میں، اس بابت کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا، البتہ ان کے کاغذات میں انہیں کی تحریر کردہ ایک فارسی عبارت ضرور ملتی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ذوق شعر وسخن عنفوان شباب سے ہی تھا۔ مولانا اعظمی لکھتے ہیں

"در قدیم ایام اختر تخلص میکردم، در ایں وقت ایں حقیر بخدمت [illegible] بود"[1]

(دور گذشتہ میں اختر تخلص کیا کرتا تھا، اس وقت اس خاکسار کی تحریر [illegible] تھی۔)

مولانا سید اردوی مولانا اعظمی کے شاعرانہ ذوق کے بارے میں لکھتے ہیں

"مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک رخ شعروشاعری بھی ہے، جس سے بہت کم لوگ واقف ہیں، شعروشاعری انسانی فضل وکمال کا ہی ایک حصہ ہے، اس سے ذوق سلیم اور موزونی طبع کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن مولانا اعظمی نے

---

[1] قلمی تحریر

(میرے دوست! آپ کو عید مبارک ہو، جو آپ پر سایہ فگن ہے، مبارک
ہو کہ سعادت کے ستارے اس وقت روشن ہیں، یہ عید خوشیاں لائی، دلوں
کی فرحت لائی، یہ میرے دوست کے تمام رنج و غم کو دور کر رہی ہے، عید کا
یہ دن مجھے بھی نصیب ہوا ہے، لیکن ہنوز رنجیدہ اور مضطرب ہوں، آنکھیں
اشکبار ہیں، میرا دل وطن اور دیار میں اٹکا ہوا ہے، جہاں کی محبت سے
میں گھل رہا ہوں، جب میں چچا اور مخلص دوستوں کو یاد کرتا
ہوں، جن پر میں فدا ہوں، تو میرا دل محبت میں بے قرار ہو جاتا ہے، مجھے
میرے حال پر چھوڑ دو، اور تم سلامتی کے ساتھ رخصت ہو، رنج و غم کی
ہوائیں تمہارے پاس سے بچتی رہیں، میرے دوست! خدا کرے تم ہمیشہ
لذت اور آسائش میں رہو، اور خوشی سے بہرہ مند ہو)

اس نظم کے خاتمہ پر مولانا نے یہ لکھا تھا

"کتبته الی صدیقی المولوی فیض الحسن وانا یومذاک
معلم فی دار العلوم الدیوبندیة وسنی تسع عشرة سنة"[1]

(میں نے اپنے دوست فیض الحسن کو یہ نظم اس وقت لکھی جب میں دار
العلوم دیوبند میں معلم تھا، اس وقت میری عمر ۱۹ برس تھی۔)

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ محبت و الفت میں ترشی و تلخی بھی پیدا ہو جاتی ہے،
جس کا نتیجہ کبھی کبھی دو دوستوں کی دوری کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ مولانا اعظمی کو بھی
اپنے دوستوں سے کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا کسی سے کوئی بے وفائی صادر ہوئی ہو اور
اس سے متاثر ہو کر چند اشعار موزوں ہو گئے ہوں، اس جدائی و بے وفائی کا ان پر کیا
اثر ہوا، یہ اشعار اس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں

---

۱ حیات ص ۶۹

ورنہ یہ کھانے سے لطف اندوز ہو، تشریف لاؤ، ہم استقبال کر رہا ہے۔
اور تمہارے شکرگزار رہوں گے، تم ہمیشہ سلامت رہو۔)

کسی صاحب نے ایسے ہی کسی جشن میں مدعو کیا، تو انہیں جواب دیا

أيا شائق[1] اسمع سماك	أجباك إذ حييت داعيا
الا بها دعوة لا ترد	ولا سيما اليوم يوم اشتاء
فشكر سماك يا شائق	وآتي قبيل صلوة العشاء

۳۰/رجب ۱۳۲۸ھ

(حضرت شائق! ہم نے آپ کا ارشاد سنا، جب آپ نے دعوت دی ہے، تو ہماری طرف سے قبول ہے، یہ تو ایسی دعوت ہے، جسے رد نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص جبکہ آج سردی بھی خوب ہے، ہم آپ کی تکلیف فرمائی کے شکرگزار ہیں، ان شاء اللہ عشاء سے ذرا پہلے حاضر ہوں گے۔)

اسی طرح ایک غزل چھ اشعار پر مشتمل ایک پرانے بوسیدہ کاغذ پر لکھی ہوئی ملی، غالباً یہ بھی زمانہ طالب علمی کی ہی ہے، وہ چھ اشعار یہ ہیں

ألا يا لوعة الحب المبرح اقصري	كأنك قد أوقدت نارا بمجمر
حريق بنار الهجر قلبي وأضلعي	في عين رشيق بسمائك وانور
غداة غدت ليلى ناهب ظعنها	وشدت بها العيس لأمر مقدر
رمتني بعينيها فحلت كأنما	رمتني بسهم فوق قوس موتر
بنفسي جروح من أسنة جفنها	فها هي أبكي من أسنة سمهر

۱ شائق سے مراد مئو کے مشہور عالم دین اور محدث مولانا عبداللہ شائق ہیں، جو مدرسہ فیض عام کے صدر مدرس تھے۔ اس مدرسے سے الگ ہو کر انہوں نے دارالحدیث کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کا نام بعد میں جامعہ اثریہ دارالحدیث ہو گیا۔

عدت بغزادي ثم صبري بصحاة   فما قول وعاظ يقولون لي اصبر

(اے دیرپا محبت کی سوزش! تو رب جا گویا کہ تو نے انگیٹھی میں آگ جلا رکھی ہے، ہجر کی آگ میں میرا دل اور پہلو جل رہا ہے، اے آنکھ تو ان پر اپنے پانی کا چھینٹا ڈال کر اسے ٹھنڈا کر دے، جس صبح کو میں اپنے کجاوے کو تیار کر کے چلی اور جدائی کے لئے جو مقدر ہو چکی ہے، اس نے اپنی سواری کسی، اور میرے اوپر نگاہ ڈالی تو ایسا لگا کہ کمان سے مجھ پر تیر چلا دیا ہو، میرے دل میں اسکی آنکھوں کے نیزوں کے زخم ہیں، جو سپر کے بنے ہوئے تیروں سے زیادہ کاری ہیں، میرا دل چھینا پھر اب تک میرا صبر و قرار چھینا، ایسے میں واعظوں کی صبر کی تلقین کیا فائدہ دے گی۔)

مولانا اعظمی نے ایک عربی نظم دار العلوم یا مفتاح العلوم مئو کے کسی جلسے کے موقع پر کہی، اس جلسہ میں معروف علمی شخصیتیں، مولانا مرتضی حسن، مولانا عبد الشکور فاروقی، مولانا عبد الشکور مرزاپوری، سید سلیمان ندوی، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا احمد سعید دہلوی وغیرہ، مدعو تھیں۔ اس نظم میں سولہ اشعار ہیں، مولانا نے ابتدائی اشعار میں تمہید باندھی ہے، اور اس کے بعد مذکورہ بالا شخصیات کا نظم کے پیرایہ میں تعارف پیش کیا ہے۔ وہ نظم یہ ہے

لک الحمد اللهم رب البرية   فإنك أهل الحمد من غير شركة

فأنت الذي يقضي لنا كل حاجة   وأنت الذي ندعوه عند المصيبة

تتابعت النعماء حتى تجاوزت   عن الحصر والإحصاء وعمت وطمت

فأعجزت الآلاء يا رب أن نفي   بشكر لما قد دق منها وأعيت

فكيف بما قد جل منها وإنما   جلائلها عما عن الوصف جلت

۔ حیات گی ۴۲۰

مراثی

مرثیہ ادب کی ایک اہم صنف سخن ہے، عرب کی شاعری میں قصیدہ و مرثیہ کو خاص اہمیت وحیثیت حاصل تھی، ان سے عربوں کے حالات وواقعات اور تاریخ کے اہم ترین پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ قصیدہ میں مدح وتوصیف ہوتی ہے، اور مرثیہ میں مرنے والے کی اچھائیوں کو بیان کرکے درد وغم کا اظہار کیا جاتا ہے۔

غم کا خاصہ ہے کہ وہ احساسات میں شدت اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں رقت کے ساتھ ساتھ جوش وروانی بھی پیدا ہو جاتی ہے، جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ دل سے شعر بھی امنڈنے لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعراء اس موضوع پر ہر زمانے میں اظہار خیال فرماتے رہے ہیں۔

چنانچہ مولانا اعظمی کے قلب پر بھی اساتذہ، اکابر، اصحاب علم کی وفات اور اپنوں کی جدائی کا بہت گہرا اثر ہوا، اور آنسوؤں کے ساتھ دل سے اشعار بھی پھوٹنے لگے، مولانا نے نہایت پرسوز مرثیے کہے ہیں، انہوں نے قطعات بھی کہے ہیں اور مادۂ تاریخ بھی نکالے، اس فن میں انہیں خاص کمال حاصل تھا۔

مولانا اعظمی نے شاعری میں زیادہ تر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، کبھی کوئی غم پہونچا، دل کو کبھی کوئی ٹھیس لگی تو گویا خود بخود اشعار کی آمد ہونے لگی۔ امیر دروی نے مولانا کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ ایسا ہی لکھا ہے

''مولانا اعظمی کی شاعری اسی طرح کی ہے، جس طرح ایک انسان کے دل ودماغ پر کوئی حادثہ گزرتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے، کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے کوئی غم لاحق ہوتا ہے تو دوسروں سے بیان کرکے اپنے غم کو

ہلکا کر لیتا ہے، مولانا کی شاعری بھی اسی قبیل سے ہے مولانا نے اپنے
تاثرات دوسروں سے بیان کرنے کے بجائے شعر کا قالب دے دیا اور
اپنے تاثرات کی شدت کو ہلکا کر لیا۔[1]

مولانا عبدالغفار صاحب عراقی کا مرثیہ مولانا اعظمی کے مربی خاص اور
محبوب استاذ حضرت مولانا عبدالغفار صاحب عراقی مئوی کی ۱۳۴۱ھ میں وفات
ہوئی، مولانا کو اس سے سخت صدمہ پہونچا، اس حادثہ سے متاثر ہو کر انہوں نے عربی
میں مرثیہ کہا

علیک سلام الله یا ثاوي القبر ورحمته تعطیک من أوفر الأجر

لقد کنت أیم الله سلوی لنا عن الـعطارفة الماضین في سالف العصر

فکنت وکانت حین غبت تغیبت فنحن إذا یا شیخ فقدنا الصبر

رزایا عظام فاجعات کثیرة مصاب أبي الأنوار علامة الدهر

محط رحال المستفیدین منجع الأماثل مأوی کل أشعث مغبر

فقیه دیار الشرق مسند وقته ومرجع أعلام الهدی رحلة العصر

إلیه جزاه الله خیرا قد انتهت ریاسة أصحاب الإمام بذا القطر

أدیب أریب ینثر الدر نطقه وفي الشعر یأتي بالحلال من السحر

وفیه خلال لو ذهبت أعدها وجدت نطاق القول ضاق عن الحصر

قد ابتلي أسقاما فما زال حامدا لمولاه فیها واستقام إلی القبر

ثوی في جوار الحمد دارخت ملهما إذ رمت علم الموت و لا ألم بالصدر[2]

(اے قبر کے اقامت گزیں! آپ پر اللہ کی جانب سے سلامتی ہو، حق

---

۱ ترجمان الاسلام ص ۵۰۔ ۵۱

۲ حیات ص ۴۲۵ - ۴۲۶

تعالیٰ آپ کو اجر کثیر سے نوازے، بخدا آپ ہمارے لیے عہد گذشتہ کے
اکابر کے بعد سامان تسلی تھے، آپ تھے تو وہ بھی تھے، آپ گئے تو وہ بھی
گئے، اس وقت ہم صبر و قرار کھو بیٹھے ہیں، علامہ بنوری کا سانحہ وفات ایک
یک مصیبت نہیں ہے بلکہ بڑی سخت مصیبتیں (اس کے جلو میں) ہیں
استفادہ کرنے والوں کی منزل، علمائے اہل فضل کی پناہ گاہ، دور دراز سے
سفر سے آئے ہوئے غرباء، اور پراگندہ خاطر کے ماویٰ و ملجاء تھے، دیار
مشرق کے فقیہ، مسند وقت اور علماء و اسلاف کے مرجع تھے جو ہدایت
کے مینار اور سیاح زمانہ تھے، اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے، اس
علاقہ میں علمائے احناف کی ریاست انہیں حاصل تھی، وہ بہت باکمال
ادیب تھے، جن کا قلم گہر ریز تھا، اور ان کے اشعار تو سحر حلال تھے سب
میں وہ فضائل حمیدہ تھے کہ اگر میں انہیں شمار کرنا چاہوں تو قلم کا دامن
کے احصاء سے تنگ پڑ جائے، وہ بیماریوں میں مشکلات اور اپنے مولیٰ کی
حمد و ثناء میں رطب اللسان رہے، میں نے جب چاہا کہ ان کی تاریخ
وفات کا دیا تو میرے دل میں یہ بات آئی "**ثوی فی خیام**
الحمد" یعنی ہمیشہ کی جنتوں میں مقیم ہوئے۔)

علامہ انور شاہ کشمیری کا مرثیہ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری کی وفات پر
مولانا اعظمی نے یہ اشعار کہے

سقى جدثاً في ديوبند يضم لي	جوانبه شيخ الحديث الجهابذ
معيد لي استاذي وشيخي وسيدي	ومفتي الورى لحبر المدقق الحلاحل
وكان تقياً طاهر النفس حائزاً	فضائل شتى قد حلته فضائل
وما في الورى من ينكر قدره	ولا ينقصه إلا ظلوم وجاهل

الاد طلاب العلم درساً و خطبة وخطاً وتصنيفاً له الفضل جدًا

(میں خود کو اور اپنے دل کو رنجیدہ پاتا ہوں، اور آنکھوں سے اپنے آنسوؤں کو رکتے نہیں دیکھتا ہوں، مولانا خلیل احمد، مولانا محمود حسن، مولانا عزیز الرحمن، مولانا انور اور مولانا اشرف علی تھانوی ہمارے درمیان تھے، پھر ہم سے جدا ہو گئے، اور ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد ہمارے سردار امام ہمام مولانا شبیر احمد نے الوداع کہا، وہ رشد وہدایت کا مینار، شرافت کا پہاڑ اور خلق خدا کے لئے نمونۂ عمل تھے، ان کے سامنے گردنیں جھکی رہتی تھیں، طالبعلموں کو درس وتقریر اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ فائدہ پہنچایا، ان کی ذات فضائل وکمالات کا مجموعہ تھی۔)

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی علامہ شبیر احمد عثمانی پر مولانا اعظمی کے اس مرثیہ کو دیکھ کر رطب اللسان فرماتے ہیں

"تدل هذه المرثية على ان للشيخ قدرة كاملة على قرض الشعر باللغة العربية، غير انه قلما اعتنى بذلك فلا توجد له قصيدة او مرثية غير هذه التي تحتوي على ۳۷ بيتا"[۲]

(یہ مرثیہ اسکی دلیل ہے کہ شیخ (مولانا اعظمی) کو عربی زبان میں شعر گوئی پر کامل قدرت حاصل تھی، البتہ اس جانب انہوں نے توجہ کم دی، اس مرثیہ کے علاوہ جو ۳۷ اشعار پر مشتمل ہے، انکا کوئی اور قصیدہ یا مرثیہ نہیں ہے۔)

---

[۱] حیات ص ۶۲۸ - ۶۲۹

[۲] ثقافة الهند ج ۲۷ ش ۱-۲ ص ۹۳

ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی کا یہ کہنا کہ مذکورہ بالا مرثیہ کے علاوہ مولانا اعظمی کا کوئی دوسرا مرثیہ یا قصیدہ نہیں ملتا، ان کے علم واطلاع کی بنا پر ہے، ورنہ تو مولانا کے بہت سے عربی قصائد ومراثی کی تعداد اچھی خاصی ہے، جیسا کہ گزشتہ درج شدہ صفحات سے عیاں ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا مرثیہ مولانا اعظمی کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کا وصال ہوا، مولانا نے حضرت شیخ الہند کی وفات پر بھی عربی میں مرثیہ کہا اور تاریخ نکالی، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

أنباء ما السمع يهوى عنه قائلة ... أنعى بها نعي شيخ الهند محمود

فالناس مضطرموا الأحشاء وعينهم ... تسيل دمعاً وهل من غير مكمود

تكاد تصدع الأكباد من حزن ... وتنقلب بشبهه لحم بمسعود

وطار لبي إذ وافاني الخبر ... فصرت لست أميز البيض من سود

وأنطوي أو كأني قابض جمراً ... أقول للعين عيني الدمع أو جودي

فقدت فرداً وحيداً في مناقبه ... والله ما مثله فينا بمعهود

وكنت أفكر في تاريخه فإذا ... بجنة الخلد محمود ثوى [1]

۱۳۳۹

آخری شعر میں کاغذ کا تھوڑا حصہ پھٹ گیا ہے، جس میں نقطے لگا دیے گئے ہیں۔ ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ

(آج کچھ ایسی خبریں آئی ہیں، جن سے سماعت کو سخت دھکا لگا، معلوم ہوا کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا وصال ہو گیا ہے، اس خبر سے لوگوں کے جگر میں آگ سی لگ گئی اور آنکھ سے آنسو برس پڑے، ایسا معلوم ہوا کہ رنج وغم کی وجہ سے جگر پھٹ جائیں گے، اور دل کی تو وہ مثال ہے، جیسے سیخ پر کباب ہو، جب اندوہناک خبر مجھے ملی، تو میرے ہوش اڑ گئے، اور میں نے سیاہ وسفید کی تمیز کھو دی، میں تڑپ رہا ہوں، یا ایسا ہو گیا ہوں جیسے مٹھی میں انگارہ لے لیا ہو، میں آنکھ سے کہتا ہوں

---

۱ قلمی تحریر

کہ آنسو پی جاؤ یا بہاؤ (یہ مصرعہ نقل نہیں)، کیونکہ ایسا شخص ہم نے
کھو دیا ہے، جو اپنے فضائل و مناقب میں یگانہ تھا، بخدا ہمیں معلوم
نہیں کہ اس جیسا کوئی شخص ہم میں ہے، میں ان کی تاریخ وفات میں
غور کر رہا تھا کہ یہ سامنے آئی "بجنة الخلد محمود ثوی" (محمود
نے جنت میں اقامت اختیار کی۔)

مولانا سید حسین احمد مدنی کا مرثیہ

مولانا عثمانی کے کاغذات میں ایک عربی مرثیہ ملتا ہے، جس میں کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ کس کی شان میں کہا گیا ہے لیکن ڈاکٹر مسعود احمد نے اس مرثیہ کے مضمون سے یہ اندازہ لگایا کہ یہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کا مرثیہ ہے اور اسکو "مولانا سید حسین احمد مدنی کا مرثیہ" عنوان لگا کر پیش کیا ہے، چنانچہ ہم بھی اسی پر اعتماد کرتے ہوئے اس مرثیہ کو یہاں نقل کرتے ہیں

رزء عظيم دها الإسلام وأكربه　　شيخ الحديث وقطب العصر قد ذهبا

ولست أحسب إلا أن ناعيه　　نعى المكارم والأخلاق والأدبا

قد كان مجتمعاً فيه الخصائل من　　علم وحلم وعرفان ولا عجبا

فإنه قد تربى عند سيده　　رشيد أحمد يسعى عنده دأبا

وعند مرشد أهل العصر قاطبة　　كانوا هم العجم أو كانوا هم العربا

شيخ المشائخ إمداد الإله وقد　　قضى سنين طوالاً عنده صحبا

(ایک بڑی مصیبت نے اسلام کو صدمہ پہنچایا اور بے چین کر دیا کہ شیخ
الحدیث اور قطب وقت اس دنیا سے چلا گیا، میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس کی
موت کی خبر دینے والے نے شرافت، اخلاق و ادب کی موت کی خبر
سنائی، علم، معرفت اور بردباری جیسی بہت سی خوبیاں ان میں یکساتھ

۔ حیات ص ۲۳۳ ۲۳۵

جمع تھیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں تربیت پائی، عرب وعجم کے مرشد شیخ المشائخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں کئی برس رہے۔)

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا مرثیہ | مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں وصال ہوا، مولانا اعظمی کو ان کی وفات سے شدید جھٹکا لگا اور مرثیہ کے یہ چند اشعار موزوں ہوگئے

كان الفقيد أخونا حفظ رحمن — شهماً نبيلاً عظيم القدر والشان

عاش الفقيد نقي العرض عن دنس — فما له عائب فينا ولا شاني

وليس يوم رزئنا فيه صاحبنا — بيوم حزن ولكن يوم أحزان

فمن لمجلس شورى ديوبند ومن — لمسلمي الهند من قاص ومن دان

يحمي حقوقهم بالانتصار لهم — في البرلمان بتصريح وإعلان

(ہمارا گم شدہ بھائی حفظ الرحمٰن بہادر، شریف، بلند مرتبہ اور عظیم الشان شخص تھا، مرحوم پاکدامن، با آبرو تھے، انکا کوئی عیب جو اور دشمن نہ تھا، ہمارے ساتھی کی وفات کا دن کسی ایک غم کا دن نہیں بلکہ یوم حزن (بہت سے غموں کا دن) ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اور دیوبند کی مجلس شوریٰ کے لئے دور نزدیک کہاں سے ایسا شخص آسکتا ہے؟ جو پارلیمنٹ میں علی الاعلان مسلمانوں کی حمایت کرکے ان کے حقوق کی حفاظت کرسکے۔)

کاغذ کے جس ٹکڑے پر مندرجہ بالا اشعار لکھے ہوئے تھے، اس کی دوسری جانب دو شعر کا ایک قطعہ بھی لکھا ہوا تھا جس کے بارے میں ڈاکٹر مسعود احمد کا خیال ہے کہ غالباً یہ قطعہ بھی مولانا اعظمی نے اسی موقع پر کہا تھا۔ وہ دو شعر یہ ہیں

لو انهمرت عيني دما، وتقطعت ... أسى كبدي، والقلب مني تفطرا
لكان حقيقا، إن رزء أصابني ... بدهلي عنده لأمسى أعظم ما جرى[1]

(اگر میری آنکھ خون کے آنسو بہاتی، جگر غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا، دل پھٹ جاتا، تو یہ سب لائق سزا تھے، اس لیے کہ دہلی کے حادثہ کا وہ صدمہ جو کل مجھے پہونچا سب سے بڑا صدمہ تھا۔)

مولانا عبدالقادر رائے پوری کی وفات کا قطعہ تاریخ مولانا کا وصال ۱۹۶۲ء میں ہوا، ان کے انتقال پر مولانا اعظمی نے یہ قطعہ تاریخ کہا۔

قضى الشيخ عبدالقادر اليوم نحبه ... وكان أجل العارفين وأكرما
بكيت وما يغني البكاء فقيل لي ... ومن ذا رزئتم، قلت شيخا معظما[2]
۱۹۶۲ء

(شیخ عبدالقادر کی وفات ہوگئی، آپ عارفین میں بزرگ تر اور برتر تھے، مجھے رونا آیا لیکن میرا یہ رونا بے سود ہے، لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کس کی وفات کا صدمہ ہے؟ میں نے کہا، ایک عظیم شخصیت کی وفات کا۔)

مولانا عبداللطیف نعمانی کا قطعہ تاریخ آپ کی وفات ۱۳۹۲ھ میں ہوئی تھی، مولانا اعظمی نے یہ قطعہ تاریخ کہا۔

صاحبي عبد اللطيف الألمعي ... نال في الفردوس أعلى منزله
فإن تسئلوا له أرخ لنا ... موته، قلت اكتب المغفور له[3]
۱۳۹۲ھ

---

۱ حیات ص ۲۳۶-۲۳۷
۲ ایضاً ص ۲۳۷
۳ ایضاً ص ۲۳۸

(میرے دیرین دوست عبد لطیف جنت الفردوس میں اعلی مقام پائیں،
انکے ایک شاگرد نے مجھ سے تاریخ وفات نکالنے کو کہا تو میں نے کہا
مغفور لہ سے ان کی تاریخ وفات نکالو۔)

ان شعری تخلیقات سے جہاں مولانا کے شعری اکتسابات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ان کی نظر اپنے دور کی سیاسی شخصیات کے سلسلہ میں بھی دوررس تھی، انہوں نے اس دور میں یہ تصور دیا کہ سیاست کا اگر علم سے رشتہ ہو تو وہ شجر ممنوعہ نہیں ہے، اور سیاسی شخصیتیں بھی اپنے علم و فضل کی وجہ سے محبوب ہو سکتی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیقات کے لئے عربی کو وسیلۂ اظہار بنایا اور اسطرح یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عربی ان کی اختیاری یا اکتسابی زبان نہ تھی بلکہ مادری زبان تھی۔

اردو نثر

گزشتہ صفحات میں مولانا اعظمی کی عربی نثر و نظم کے ادبیانہ طرز نگارش اور نمونہ کلام کے چند نمونے پیش کئے گئے، جس سے عربی زبان و ادب میں مولانا کی مہارت کا اندازہ ہوا، اب ہم مولانا اعظمی کے اردو ادب کا جائزہ لیں گے، یعنی مولانا کی اردو نثر کا کیا معیار تھا اور ان کی اردو شاعری کس قدر رنگی تھی، ہم اس فصل میں یہ جاننے کی کوشش کریں گے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سترہ برس کی عمر سے ہی مولانا کے ذوق شعر و سخن کو جلا ملنے لگی تھی، اور اس قدر طبعی مناسبت ہوگئی کہ اسی دور میں شعر کہنے لگے تھے، اردو ادب سے اس فطری لگاؤ اور مشق سخن کا یہ اثر ہوا کہ ان کی نثر بھی اسی معیار کی ہوتی تھی، مولانا کی اردو رواں سہل و سلیس ہوتی، الفاظ مختصر مگر معانی و مفاہیم کو محیط ہوتے، تفہیم کا انداز بہت صاف ہوتا، پیچیدہ اور دقیق سے دقیق موضوع پر بھی اگر قلم اٹھاتے تو ایسا لکھتے کہ قاری کے سامنے بات بالکل آئینہ ہوجاتی، مولانا کی تحریر میں ایجاز کو خاص دخل ہے، اردو کے مشہور ادیب و انشاء پرداز عامر عثمانی مولانا اعظمی کے اردو اسلوب نگارش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مولانا اعظمی کا خداداد کمال یہ ہے کہ انتہائی دقیق و نازک نکات فن کو بھی اس سلاست و بلاغت کے ساتھ سپرد قلم فرماتے ہیں کہ ابہام اور ژولیدگی کے بغیر بات آئینہ ہوجاتی ہے۔"[1]

مولانا اعظمی کے رشحات قلم میں اردو زبان میں ایک سوانح، دو مضامین و مقالات ہیں، ان میں سے بعض مطبوعہ ہیں، اور بعض غیر مطبوعہ۔ اور تقریباً بیس کی

۱۔ تجلی دیوبند اکتوبر ۹۶۳ء ص ۵۵

تعداد میں مولانا نے اردو میں کتابیں اور رسائل لکھے، اردو تصنیفات میں اعیان الحجاج، دستکار اہل شرف، الاعلام المرفوعہ، نصرۃ الحدیث، دار الاسلام ودار الحرب اور تعدیل رجال بخاری وغیرہ مولانا کی اعلیٰ نثر کی آئینہ دار ہیں۔ مولانا نے ۱۳۴۹ھ میں 'تذکرہ' کے نام سے ایک علمی رسالہ بھی جاری کیا تھا، مولانا خود اسکے مدیر تھے، لیکن اسکا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ اس مجلہ کا قلمی نسخہ مکتبہ حبیب الرحمن الاعظمی مئو میں محفوظ ہے۔

مولانا کی اردو عبارت پوری طرح چست و درست رہتی ہے، جس موضوع پر لکھتے ہیں اس پر اس قدر مضبوط گرفت رہتی ہے کہ اس سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہٹتے ہیں، چونکہ عبارت میں متانت وصلابت کا رنگ غالب ہے، اس لئے آپ کی تحریر پرشکوہ معلوم ہوتی ہے۔ اور چونکہ مولانا محقق، نقاد اور مناظر ہیں، اس لئے اردو میں تنقیدی وتردیدی مضامین زیادہ ہیں اور ظاہر ہے کہ جوابی مضامین میں کچھ نہ کچھ تلخی کے اثرات ہو ہی جاتے ہیں، چنانچہ اُن کے یہاں بھی یہ اثر دکھتا ہے، مولانا اعظمی نے خود بھی ایک دو جگہ عبارت یا تحریر میں تلخ نوائی کا اعتراف کیا ہے، لیکن یہ تلخی خال ہی خال نظر آتی ہے۔

جناب ماہر القادری اردو زبان وادب کے مشہور محقق و بے باک نقاد ہیں، 'فاران۔ کراچی' میں کتابوں پر ماہر القادری کے ناقدانہ تبصرے انکے علم، دقت نظر اور سخن فہمی کے غماز ہیں۔ زبان پر ان کی مضبوط گرفت اور سخن فہمی کی ہی یہ دین تھی کہ جوش ملیح آبادی جیسے مشاق شاعر وادیب نے جب خودنوشت سوانح 'یادوں کی برات' ماہر القادری کے پاس تبصرے کے لئے ارسال کی تو اپنی کتاب پر یہ لکھا:

”حضرت ماہر لیجئے، بکرا حاضر ہے، شوق سے ذبح (کذا) فرمائیے، سر دوستاں سلامت۔“[1]

---

[1] ماہر القادری کے تبصرے ص ۱۷۶ طالب ہاشمی

اردو نظم

مولانا اعظمی کی فائلوں، کاغذات اور نوٹس میں بکھرے ہوئے منتشر اشعار دیکھے گئے تو زیادہ تر غزلیں، نظمیں ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۹ء سے ۱۳۴۲ھ م ۱۹۲۴ء تک کی ہیں، ان میں بھی بیشتر ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کی ہیں، یہ اطلاع اس سرمایۂ سخن کے بارے میں ہے جو ناقلین، محققین اور تلاش کرنے والوں کے ہاتھ لگ سکا اور جسے وہ محفوظ کر سکے۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے قدیم ترین کرم خوردہ کاغذات بھی ملے جن پر مولانا کی نظمیں یا غزلیں وغیرہ تھیں، لیکن افسوس کہ ان کے پورے اشعار نہیں پڑھے جا سکے، جتنا حصہ پڑھا جا سکا انہیں محفوظ کر لیا گیا۔

کاغذات میں مولانا اعظمی کا تخلص کہیں اختر، کہیں شوق اور کہیں حبیب لکھا ہوا ملتا ہے۔ بعض اشعار میں تخلص منجز بھی نظر آتا ہے، لیکن زیادہ تر غزلوں میں اختر ہی تخلص ہے۔

مولانا اعظمی کے یہاں اپنے کہے ہوئے اشعار کو محفوظ رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نظر نہیں آتا، اگر ان کی حفاظت کا اہتمام برتا جاتا تو یقیناً ہمارے سامنے مختصر سہی مگر ایک قیمتی مجموعۂ کلام ہوتا۔ طبیعت میں جولانی تھی، ذوق سلیم پایا تھا اور صلاحیت بھی تھی چنانچہ سترہ برس کی عمر میں ہی شعر کہنے لگے، عمر کی سترہویں بہار میں شعر و سخن کا طوفان بڑے زوروں سے اٹھا لیکن جلد ہی مولانا نے اس پر قابو پا لیا اور اس سیل رواں پر بند باندھ دیا، اور خود کو سنجیدہ علمی و تحقیقی مشاغل کی طرف موڑ دیا۔

تجربے سے یہ بات ثابت بھی ہے کہ یہی عمر ہوتی ہے، جس میں جذبات جوش اور احساسات برانگیختہ ہوتے ہیں، اور فطری شعراء کے یہاں اسی بہار حیات میں شعر شروع ہو جاتی ہے۔ عربی زبان کے مشہور ادیب احمد حسن زیات کے بقول

"عهدنا بالشعراء الوجدانيين ينبغون في زهرة الشباب و ربيع العمر"![1]

(ہمارا تجربہ ہے کہ فطری شعراء عین شباب اور بہار عمر میں ہی مقام بلند حاصل کر لیتے ہیں۔)

غزلیں

شعر گوئی کے لئے بھی مولانا نے دیگر علوم کی طرح استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، تاکہ اشعار کی پرکھ ہو سکے اور اس فن کی باریکیوں سے مکمل آگاہی ہو جائے۔ اس زمانہ میں غزل کی دنیا میں داغ دہلوی اور امیر مینائی کی شہرت زیادہ تھی، اور تازہ واردان ہوئے دل انہیں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ مولانا اعظمی نے امیر مینائی کے حلقے کی طرف رخ کیا اور انکے مشہور شاگرد سید محمد عسکری وسیم خیرآبادی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔[2]

چنانچہ مولانا کی غزلیں وسیم صاحب کے پاس جاتیں اور وہ بڑے اہتمام سے اصلاح کر کے واپس کرتے، تین چار غزلیں جن پر وسیم صاحب کے قلم سے اصلاح ہے، مولانا کے بوسیدہ کاغذات میں محفوظ ہیں۔ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی نے ان کاغذات سے وسیم خیرآبادی کے چند خطوط اور مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی اصلاح شدہ غزلیں نوٹ کی تھیں۔ مولانا اعجاز احمد صاحب کے شکریہ کے ساتھ وسیم خیرآبادی کے خطوط اور مولانا کی اصلاح شدہ غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔

---

[1] تاریخ الادب العربی ص ۴۹
[2] فراق گورکھپوری نے بھی وسیم خیرآبادی سے اصلاح لی تھی۔

وسیم خیرآبادی مولانا کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"محبی شفیقی، سلام مسنون، آپ نے طبع سلیم اور فکر رسا پائی ہے، چند دنوں غزلوں کے بعد آپ شیوا بیان ہو جائیں گے۔"

وسیم خیرآبادی ۲۶ رجنوری ۱۹۳۰ء کے ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں

"قدردان ومہربان من، شفیقی اختر سلمہ اللہ الاکبر

بعد سلام مسنون، مدعا یہ ہے کہ یہ غزل آپ کی ڈاک خانہ لکھنؤ کی سیر کرتی ہوئی ڈاک خانہ خیرآباد سے میری عدم موجودگی میں میرے گھر تک آئی، کسی نے یہ خط مرسلہ آپکا لے کر طاق پر رکھ دیا تھا، اور بھول گیا تھا، پرسوں کسی طرح سے مجھکو ملا، میں نے کل سے آج تک اس غزل کو دیکھا میں نہایت شرمندگی اور انفعال کے ساتھ یہ غزل آپ کو بھیج کر معافی کا خواستگار ہوں، خدا نے آپکو طبع رسا ور فکر بلند دی ہے، مضمون آفرینی کی طرف بہت آپکو توجہ ہے، امید ہے اگر آپ اپنا کلام مجھکو دکھاتے رہے، تو بہت جلد آپ کو فائدہ پہونچے گا، اور اپنے ہم چشموں سے گوئے سبقت لے جائیے گا، میں آپ کی یہ غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا، کیا کیا شعر نکالے ہیں، آپکا کلام میں بشوق دیکھا کروں گا۔ آپ ہونہار ہیں۔"[1]

وسیم خیرآبادی کے اس خط سے واضح طور پر اشارہ ملتا ہے کہ ان کو مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی سے بڑی توقعات تھیں، وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے اس ہونہار شاگرد میں شعروفن کا جو ہر موجود ہے، اسی لئے خصوصی توجہ فرما رہے تھے، استاذ گرامی کا یہ مکتوب شاگرد کی اعلیٰ صلاحیت اور فکر بلند کا پتہ دیتا ہے۔ دوغزلیں ہمارے

---

[1] قلمی تحریر

سامنے ہیں جن کی استاد نے اصلاح کی ہے۔ ان کے چند اشعار اور چند اصلاحیں سے ناظرین بھی محظوظ ہوں۔ ہمارے سامنے یہ بات بھی ہونی چاہیے کہ یہ ایک نوخیز طالب علم کی کاوش ہے۔

ادھر ساقی، یہ کیوں رکھی ہے پیمانوں میں ۔۔۔ چھا گیا ابر، بہار آئی گلستانوں میں
اس قدر جوش جنوں ہے ترے دیوانوں میں ۔۔۔ گھر میں اک پاؤں ہے، اک پاؤں بیابانوں میں

ان دونوں کے بارے میں وسیم صاحب نے لکھا ہے کہ

”کیا خوب مطلع ہے“

دل ویراں کو وہ آباد کریں تو کیونکر ۔۔۔ گھر بنایا نہیں کرتے کبھی ویرانوں میں
محو ہیں لذت آزار میں آزار پسند ۔۔۔ وہ نہیں جانتے کیا لطف ہے احسانوں میں
ہے مرے عشق کے افسانے میں جو سوز و گداز ۔۔۔ وہ نہیں کوہکن و قیس کے افسانوں میں

اس شعر میں استاد نے اصلاح کی ہے، پہلا مصرعہ یوں کر دیا ہے۔

ع ہے مرے قصۂ درد میں جو سوز و گداز

اور اس پر تحریر فرمایا کہ

”دونوں مصرعوں میں فسانے کی تکرار بے سود تھی۔“

پاس داران کا ہے دل کہنے کو ہے پاس مرے ۔۔۔ سمجھوں اپنوں میں اسے یا کہوں بیگانوں میں

استاد نے دوسرا مصرعہ یوں کر دیا ہے۔

ع سمجھوں اپنوں میں کہ سمجھوں اسے بیگانوں میں

دیکھ عشاق نے کیا چاک گریباں تیرا ۔۔۔ ایک دھجی نہیں اب ان کے گریبانوں میں

اس کے پہلے مصرعہ میں استاد نے اصلاح کی۔

ع کیا ترے وحشیوں نے چاک گریباں دیکھ

اس پر تحریر فرماتے ہیں کہ

"ویکی اور آیا وغیرہ کا حرف سب کے یہاں دبا، استاذ مرحوم، اس پر نظر رہے۔"

فخر کرنے کو مرے کم نہیں اتنا اختر　　میں ہوں خمخانۂ مینائی کے مستانوں میں

اسکو تسلیم مرحوم نے بدل کر اس طرح کر دیا

کیا نئے تحفہ ہے میخانۂ مینائی کی　　میں ہوں اختر اسی خمخانے کے مستانوں میں

اس پر تحریر فرمایا

"مینائی کی یا دبانا غلط تھا، یہ عیب نکل گیا، آپ نے مقطع لاجواب کہا تھا، اب شان اور بڑھ گئی۔"

دوسری غزل کے چند اشعار جن کی استاد نے اصلاح کی ہے ملاحظہ ہوں۔

دل جلے عاشق نے آہ ایسی دم تقریر کی　　تیغ پگھلا کر بہا دی قاتل بے پیر کی

اصلاح

..　　اڑ گئی آب اے ستم پرور تری شمشیر کی

"قاتل بے پیر نہیں بت پیر مستعمل ہے۔"

فکر زخموں کو ہوئی جو چارۂ تدبیر کی　　کیا نمک پاش اس پہ ہے خندہ لبی تقدیر کی

ایڑیاں اپنی رگڑتا رہ گیا بیمار غم　　ہائے آنے میں قضا نے بے طرح تاخیر کی

اصلاح

ایڑیاں اپنی رگڑتا ہے کوئی بیمار غم　　..

لکھی جوش سے شراب زعفرانی کی صفت　　ہے زمین شعر بھی گویا زمیں کشمیر کی

میکدہ کے روبرو بادہ خواروں کے لئے　　ہم نے ڈیڑھ اینٹوں کی اک مسجد الگ تعمیر کی

اصلاح

میکدے　..　　ہم نے تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کی

خودی سے پردہ میں ہر اک نکتۂ آیاتِ حسن — مصحفِ رخ کے لئے حاجت نہیں تفسیر کی

اصلاح

ہے

"ہر اک کے ساتھ واحد کہنا چاہئے"

محوِ حیرت، منہ کھڑے تکتے ہیں اختر واہ رے — دلفریبی، دلکشی، خامہ تری تصویر کی

اصلاح

محوِ حیرت سب ہیں کہتا ہے یہ اختر وہ شوخ — دلفریبی، دلکشی، دیکھی مری تصویر کی؟

مولانا کی کہی ہوئی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

روشن ہے ایک داغ دلِ داغدار کا — جلتا نہیں چراغ ہمارے مزار کا
اتنی کڑی تھی، ہوئی مدت پئے ہوئے — ساقی ہے آج تک وہی عالم خمار کا
چھوڑی گیا جو میکدے میں جامِ مے تو رند — کہتے ہیں کام ہے یہ کسی ہوشیار کا

اختر گن رہا ہوں میں تاروں کو صبح تک
اچھا یہ مشغلہ تھا شبِ انتظار کا

نہ بھولی ہے، نہ کبھی دل سے وہ بھولے گی — ادا کسی کے دبے پاؤں چھپکے آنے کی
صبا کی چھیڑ پہ چٹکا کے بول اٹھا غنچہ — یہ بار بار بری لت ہے گدگدانے کی
سمجھ سکے گا وہی مرے دل کی حسرت کو — جو تکتا رہتا ہو راہیں کسی کے آنے کی
کہاں میں اور کہاں دیوبند اے اختر — کشش سے کھینچ کے پہنچی یہ آب و دانے کی

ذی الحجہ ۳۳ھ ۱۵ نومبر ۹۹ء

آپ کیا چہرہ پہ ہے اس بت شعلہ رو کے — معجزہ ہے کہ جہاں آگ وہیں پانی ہے
قدرداں بول اٹھے سن کے کلام اختر — کوئی اعجاز ہے یہ طرز سخندانی ہے

کیے کی اپنے سزا پائی دل لگا کر کے — جنوں نے مجھ کو پھرایا برہنہ پا کر کے
گلے میں ڈال دے باہیں جو شوق میں آکر — تو بولے دیکھئے صاحب ذرا بچا کر کے
مرید پیر مغاں خود بھی ہوگئے جاکر — گئے تھے شیخ جی کیا کرنے آئے کیا کر کے

چھوڑ دے باتیں کہ باتیں تو بہت کیں تو نے اب — ہو سرگرم عمل پیکر کردار تو بن
زندگی کی طلب تجھکو ہے تو مرنے سے نہ ڈر — شاہی چاہے تو گدائے شہ ابرار تو بن

بوسہ لیا ہے میں نے چراتے ہیں آنکھ وہ — کوئی کرے قصور کوئی شرمسار ہو

مرثیہ وقطعۂ تاریخ

مولانا نے اردو میں بھی مرثیے کہے ہیں، جنہیں ایسی بہت سی شخصیات نظر آتی ہیں جن پر مولانا اعظمی نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مرثیے کہے۔ مولانا کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی کمال حاصل تھا، جیسا کہ ان کے چند نمونے عربی مراثی کے ضمن میں آپ دیکھ بھی چکے ہیں۔ طوالت کے خوف سے اس موقع پر نمونہ کے طور پر صرف ایک مرثیہ اور ایک قطعۂ تاریخ پیش کیا جا رہا ہے۔

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا مرثیہ:

وارث علم نبی، حضرت استاذ جلیل — وائے برما کہ ہوا آج جہاں سے رخصت

وہ کہ تھا اپنے زمانہ میں بخاری کا مثیل
وہ کہ تھا ابن معین پایہ و سفیاں شوکت

وہ کہ تھا فقہ میں بو یوسف قاضی کی نظیر
وہ کہ تفسیر میں اس وقت تھا حبر الامت

ماتریدی زماں، اشعری وقت تھا وہ
وہ کہ فارابی دوراں تھا بطل حکمت

جس سے تازہ ہوئی یاد ذہبی و مزی
بن تیمیہ کی زندہ ہوئی جس سے سیرت

وہ کہ آئینۂ پیکر میں تھے جس کے بخدا
جلوہ گر زیلعی و ابن حجر کی صورت

وہ کہ تھی منبر رشد کو جس پہ نازش
وہ کہ تھی مسند تدریس کو جس سے زینت

جس پہ نازاں عرب و مصر و عجم شام و عراق
ہند کی خاک کو تھی جس کے قدم سے عزت

وہ کہ تھا تخت دل قاسم خیرات علوم
وہ کہ تھا مردمک چشم رشید امت

آہ صد آہ ہوا نیر انور روپوش
حیف بر حیف کہ عالم میں ہے پھیلی ظلمت

قہر ہے بزم معارف ہوئی درہم برہم
اور سونی ہے پڑی مجلس درس حکمت

علامہ سید سلیمان ندوی کا قطعۂ تاریخ وفات

فاضل علامہ سلیمان آج
ہوگئے افسوس کہ ہم سے جدا

آہ کہ اب ہند میں کوئی نہیں
فاضل و علامہ سلیماں سا

ماہر تاریخ و حدیث و سیر
واقف اسرار کتاب خدا

اردو تو اردو عربیت میں بھی
ان کو بہت دخل بڑا درک تھا

کس کو نظر آتا ہے کہیں وہ کمال
ان کو جو انشاء و کتابت میں تھا

حیف یہ گنجینۂ علم و ادب
دفن تہ خاک کراچی ہوا

فقرۂ تاریخ کا جویا تھا میں
دل نے کہا، فاضل یکتا گیا [2]

۱۳۷۳ھ

---

۱ حیات ص ۶۲۷ - ۶۲۸

۲ ایضاً ص ۶۳۳ - ۶۳۴

نعتیہ کلام

یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کو ارشادات نبویہ سے کس قدر شغف تھا، ان کا مقصد حیات ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ایک ایک پہلو ورخ کی تحقیق کرنا تھا، انہوں نے حضور کے کلام میں در آنے والی زیر وزبر تک کی زیادتی کی نشاندہی کرنے کی عادت کی۔

ظاہر ہے جس نے اپنی زندگی اس میں وقف کر دی ہو، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکی محبت والفت کا کیا عالم ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی کا ہی یہ اثر تھا کہ جب بھی نام نامی آتا، عقیدت سے دل میں رقت اور تڑپ کے ساتھ اشعار پھوٹ پڑتے' اور جب یہ سلسلہ شروع ہوتا تو پھر کیا تھا اشعار موزوں ہوتے جاتے اور اوراق پر نقوش چھوڑتے چلے جاتے'

مولانا اعظمی کے سرمایہ شعر وسخن میں چار، دو نعتیں ملتی ہیں کچھ ابتدائی زمانہ کی ہیں، اور کچھ اس زمانہ کی ہیں جب وہ شاعری چھوڑ چکے تھے۔ مولانا کی نعت میں عقیدت ومحبت کی معراج کے ساتھ ساتھ تلمیح، واقعہ نگاری اور اسلامی تاریخ کے پس منظر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مولانا کا نعتیہ کلام "حیات ابوالمآثر" سے مستعار لے کر دیتے میں پیش خدمت ہے۔

نعت میں رطب اللسان ہے احمد مختار کی
دھوم ہو کیونکر نہ میرے خلعۂ دربار کی

ہو غلامی کا مجھے تمغہ عطا روحی فداک
عزت افزائی ہو اتنی شاعر دربار کی

کھا رہی تھی موج ضلالت کے تھپیڑے دم بدم
آپ نے آکر سنبھالا اور کشتی پار کی

جس نے دیکھا ہوگیا وہ کشتۂ تیغ ادا
کیا ضرورت آپکو خنجر کی اور تلوار کی

اک نگاہ لطف سے دیکھا جہاں سرکار نے
بھر گئی جیب مراد اس اختر نادار کی

ابتدائی عمر کی ایک اور نعت ملاحظہ ہو

مرے ماں باپ مری جان رسول عربی | ترے صدقے، ترے قرباں رسول عربی
ہر ادا پر تری اور سنت بیضا پہ تری | میں ہوں جاں سے قربان رسول عربی
حق تعالیٰ کا تو محبوب ہے للہ اللہ | کیا نرالی ہے تری شان رسول عربی
کہیں بڑھ چڑھ کے تھے سیرت میں ملائک سے حضور | اور صورت میں تھے انسان رسول عربی
شب معراج سر عرش بریں پہونچے نبی | ہوئے اللہ کے مہمان رسول عربی
اس سے بڑھ کر کوئی بدبخت نہیں دنیا میں | جو بھلا دے ترے احسان رسول عربی
آرزو ہے دل بے تاب ہے مدت سے یہی | ہوں میں آپ کا مہمان رسول عربی
صرف اک تیری غلامی و محبت کے سوا | مغفرت کا نہیں سامان رسول عربی
مدعا ہے کہ رہے آپ کا ذکر محمود | ورد ہر لحظہ ہو ہر آن رسول عربی
شوقؔ پر اک نظر لطف و کرم ہو شاہا! | آپ کا ہے یہ ثنا خوان رسول عربی۔

مزید یک نعت پیش خدمت ہے

وہ جہاں کا رمز وجود ہے، وہ مدار کار نظام ہے
وہ خدا کی شان جمال کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
وہ خدا کا قہر و جلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
وہ ہلال چرخ کمال تھے مرا شاہ بدر تمام ہے
جو غلام رہیں بسکون دل سے انھیں کی پاک حدیث ہے

۱؎ یہ نعت قلمی تحریر میں دستیاب ہوئی۔ حیات و المآثر میں یہ نعت چھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں دس اشعار ہیں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں

جو مریض دل کے لئے شفا ہے انھیں کا پاس کلام ہے
جو مجھے ملا وہ ملا انھیں کی نگاہ لطف و کرم سے
قلم و زبان حبیب کیا ہے انھیں کا فیض دوام ہے

آپ پر دل کا دورہ پڑا، حالت نا گفتہ بہ ہوگئی، موت و حیات کی کشمکش میں تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کیا

میں وہ شیدا ہوں نبی عربیؐ کا — مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی کا
پیارا ہے مجھے زمزمہ خواں صدر خلافت — صدیقؓ، عمرؓ، حضرت عثمانؓ و علیؓ کا
ہر بیت کا مصداق سنا القدم و دب — اور نانوی سے اہل عبائے نبوی کا
جو آنکھیں تھیں انوار نبوت سے منور — خاک ان کے پاؤں میں ہر اک شیخ و صبی کا
چہروں کی ہیبت اور عجب میں سے کشش تھی — یہ جادو تھا جب حدیث نبویؐ کا
ہے خلق نبیؐ خاصہ ختم رسالت — دنیا میں علم ہے کہ اخلاق نبیؐ کا
کتنی اثر انگیز تھی ہجرت کی وہ تاریخ — بس تین ہی فقرے کا تھا یہ خطبہ نبیؐ کا
تھے ابن سلامؓ کہ بڑے ذی علم یہودی — موجب ہوا اسلام کا یہ خطبہ نبیؐ کا
آمد کی صدا کانوں میں اک نخل پہ آئی — بے خوف و خطر کود کے سنا کلمہ نبیؐ کا
کھلاؤ مساکین کو پھیلاؤ سلام آپ — اٹھ جاؤ کہ جب سب ہو خواب سحری کا
چہرے پہ نظر پڑتے ہی بے ساختہ بولے — ممکن نہیں یہ چہرہ ہو کذاب شقی کا

اس انس و تعلق کی بنا پر ہوں پر امید
دیوانہ ہوں مدت سے حدیث نبوی کا

مولانا کی یہ نعت سوز دروں، پاکیزگی فکر اور حضور کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی و فریفتگی کا مرقع ہے۔ خلفاء اور صحابہ کرام کے لئے احترام بے پایاں کی روشن مثال ہے۔ مولانا نے اس نعت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے واقعہ اسلام کو بھی مختصر

پیرایہ میں بڑے سیقہ سے ذکر کیا ہے۔

موج کوثر اور داد تحسین مشہور شاعر اقبال سہیل کی ایک شاہکار تخلیق 'موج کوثر' ہے، سہیل کا یہ نعتیہ کلام ہے، اس میں ۸۷ اشعار ہیں، "یہ نعت دراصل نعتیہ شاعری کے خزانے میں گوہر شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہے۔"[۱] اس نعت کی خوبی اسیر ادروی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو

"اس نعت کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کی رانی کی خوشبو نرم رو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پنے بے آواز پروں سے اڑتی ہوئی چلی آرہی ہے، مشام جاں معطر ہو جاتا ہے، روح سرشار ہو جاتی ہے، پورا وجود کیف و سرور میں ڈوب جاتا ہے۔"[۲]

اس نعت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں

احمد مرسل فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
مظہر اول مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

جسم مزکی روح مصور قلب مجلی نور مقطر
حسن سراپا خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم

کفر کی ظلمت جس نے مٹائی دین کی دولت جس نے لٹائی
ہرایا توحید کا پرچم صلی اللہ علیہ وسلم

باغ جہاں کا عارض نامی جس نے مٹائی رسم غلامی
پھر سے سنوارا گلشن آدم صلی اللہ علیہ وسلم

بزم ملل تھی نظم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے والی
اس نے کئے سب آکے منظم صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ اقبال سہیل حیات اور شاعری ص ۲۸۳ ڈاکٹر منور انجم

۲۔ ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء ص ۳۶

سہیل کی یہ نعت بہت مشہور و مقبول ہوئی، اس پر مشاہیر فن اور ادباء و علماء نے اس کو کھل کر داد دی۔ مولانا اعظمی نے بھی سہیل وان کی مدح نگاری پر داد تحسین دی، اور نایاب ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار حسب ذیل خط میں کچھ اس طرح کیا

"مدرسہ مفتاح العلوم مئو

۲۸ر فروری ۱۹۴۳ء

مکرم!

السلام علیکم!

آپ کی تازہ نعت نبوی اتفاقیہ ایک صاحب سے مل گئی، اسکو پڑھ کر میں اتنا محظوظ ہوا کہ بے ساختہ یہ چند اشعار موزوں ہو گئے، اب نہ میں شاعر ہوں نہ یہ شاعری ہے بلکہ میرے تاثرات ہیں جو موزوں ہو گئے ہیں۔

اے اقبال! اے شاعر ملت، نازش قوم اور فخر جماعت

مدح نگار مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم

لکھی تو نے کتنی اچھی، کتنی بلند، اور کتنی پیاری

نعت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم

اس نے روحوں کو گرمایا، جوش عقیدت اس نے بڑھایا

سب کی زبانوں پر ہے پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

تجھ کو مبارک مدح نگاری، تجھ پر سایہ رحمت باری

تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم

لک ان تقراہ علیہ یوم المحشر حین تراہ

ارجو منہ أن یبسم صلی اللہ علیہ وسلم

(حبیب الرحمن الاعظمی)[1][2]

مولانا اعظمی کا یہ شاعرانہ کمال ہی تھا کہ اقبال سہیل نے جس رنگ و آہنگ اور آب و تاب میں یہ عقیدہ کلام پیش کیا ہے بالکل اسی آہنگ اور شوکت الفاظ کو برقرار رکھتے ہوئے مولانا نے انہیں داد دی۔ آخر میں عربی شعر نے مولانا کے اس بدیہہ تبریک میں اور جان پیدا کر دی۔

فن شاعری مولانا اعظمی کی شاعری تک بندی نہ تھی بلکہ وہ اپنے کلام میں زبان کی صحت، بندش الفاظ، اوزان و بحور اور عروض وغیرہ کی پوری رعایت برتتے تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ فن شاعری سے واقفیت و باخبری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات پر مولانا اعظمی نے ایک تعزیتی نظم کہی، اور اشاعت کے لئے 'انقلاب' کے مدیر مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس ارسال فرمایا۔

قاضی صاحب کو اس نظم میں کچھ فنی نقص معلوم ہوا، اور انہوں نے اپنی طرف سے اس میں کچھ تصرف کر دیا اور پھر 'انقلاب' میں شائع کیا۔ جب مولانا اعظمی نے اپنی یہ نظم بدلی ہوئی صورت میں دیکھی تو قاضی اطہر مبارکپوری کے پاس مندرجہ ذیل تحریر بھیجی

"آپ کے 'تصرفات' کی نسبت گزارش ہے کہ صلاح اگر موجہ ہو تو میں

---

[1] آخری شعر کا مطلب یہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور روز محشر اگر یہ نعت آپ پڑھیں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ ﷺ سن کر مسکرا دیں گے۔

[2] اقبال سہیل حیات اور شاعری ص ۲۹۱

صرف خوش نہیں بلکہ شکر گزار بھی ہوتا ہوں، مگر آپ نے اپنے تصرفات کی کوئی وجہ نہیں لکھی، میں نے یہ وجہ سمجھی ہے کہ آپ نے اس نظم کو مثنوی مولانا روم کے وزن پر بحر رمل مسدس محذوف میں خیال کیا، اس سے جو مصرعے وزن سے گرتے تھے، آپ نے اس وزن پر بنا ڈالا، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، میری نظم قران السعدین، مخزن اسرار، مطلع الانوار اور سبحۃ الابرار کے وزن پر بحر سریع مطوی سے موقوف ہے، جسکا عروض وضرب مختلف یعنی ایک مطوی مکسوف (فاعلن) اور دوسرا مطوی موقوف فاعلان ہوسکتا ہے، اس بحر میں یہ بات ہوئی ہے، اس کے بعض شعر یا مصرعے بحر رمل کی پڑھے جاسکتے ہیں، جیسے مولانا جامیؒ کے یہ اشعار

(۱) رفتن او جستن تیر از کماں — جستن او جستن ملے مکاں

(۲) توبہ دہ از سرکشی ایام را — باز خر از خوشی اسلام را

(۳) دیدۂ عالم بتو روشن شود — گلخن گیتی بتو گلشن شود

(۴) ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت — بلکہ جہاں جملہ ماتم گرفت

مصرعہ اولی بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے۔

(۵) چوں شہ بزرگ ست و شہر عشق حسن — منبر او بر سر او خورد کن

اس میں صرف مصرعہ ثانیہ بحر رمل میں پڑھا جاسکتا ہے، حالانکہ سبحۃ الابرار جامی بحر سریع میں ہے اور اس کا پہلا مصرعہ "ہست صلائے برخوان کریم" ہے، اور اسی مثنوی کا یہ مشہور شعر ہے۔

اے ہمہ پردۂ یثرب بخواب — خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب"[1]

قاضی صاحب نے مولانا الاعظمی کی اس فنی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور

[1] روزنامہ انقلاب ۳۰ دسمبر ۱۹۵۳ء بحوالہ حیات ص ۲۰۰-۲۰۱

۳۰ ر دسمبر ۱۹۵۳ء کے 'انقلاب' میں "ایک علمی اورادبی مکتوب گرامی، بحر سریع اور بحر رمل کی ناقدانہ تشریح" کے عنوان سے شائع فرمایا۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے شعری اکتسابات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چاہے نعت ہو یا غزلیں اس دور کے مزاج و مذاق کے مطابق زبان پر دسترس ہے۔ مضمون آفرینی، نزاکت خیال، قافیہ پیمائی اور مشکل زمینوں میں جوہر سخن کو نمایاں کرنے کا انداز نظر آتا ہے۔ یہاں یہ لکھنے کی بھی جسارت کی جارہی ہے کہ مولانا کو شاعری سے فطری مناسبت تو ضرور تھی مگر کہاں مدرسہ اور کہاں میکدہ! اس لئے بہت دنوں تک اردو میں مشق سخن جاری نہ رکھ سکے۔

فارسی نثر

مولانا اعظمی فارسی زبان کی بھی واقفیت رکھتے تھے، فارسی سے ان کا تعلق واقفیت تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ باقاعدہ فارسی میں پوری روانی کے ساتھ لکھا بھی کرتے تھے، ہمیں مولانا کی بہت سی ایسی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں، جو خالص فارسی زبان میں ہیں۔ مولانا کی لکھی ہوئی بیاض میں 'وفیات الاعیان' کا جو حصہ ہے اس میں بیشتر تحریریں یا تذکرے فارسی میں ہیں۔

مولانا ایک ذہین شخص تھے، انہیں زبان کی باریکیوں کے سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا مزاج عربی فارسی اور اردو ادب سے پوری طرح وابستہ تھا، انہیں ان زبانوں سے فطری انس تھا، کیونکہ جب آنکھیں کھولیں تو گرد وپیش جو ماحول پایا اس میں یہی تینوں زبانیں لکھی، پڑھی اور بولی جاتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ ذہین ہو، جسکا ذہن زبان کے ادب کو قبول کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، تو اسکے لئے فارسی زبان کو اوڑھنا بچھونا بنانا تعجب کی بات نہیں! جی چاہتا ہے کہ مولانا کی فارسی نثر کے بھی ایک دو نمونے اس موقع پر پیش کردیے جائیں۔

مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ وفیات الاعیان میں مولانا اعظمی نے حضرت شاہ صاحب کا تذکرہ فارسی میں کیا ہے۔ انکی چند ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں:

"از خلفائے حضرت مرشدنا حکیم الامت تھانوی بود، زاد بوم او فتحپور تال نرجا کہ از مئو ہشت یا نہ میل دور جانب شمال واقع است، ودر ۱۳۳۶ھ از دارالعلوم دیوبند سند فراغ یافت، وبعد فراغ بہ دامن دولت پیر مرشدنا

وابستہ گردید، مدتہا در خانقاہ امدادیہ اقامت کرد و فیضہائے فراواں برد، باز بفتحپور آمدہ پائے عزلت شکست، ابتداء بغایت عسرت زندگی بسری برد، چندے در مبارک پور و ساہپائے در کانپور بتدریس قیام نمود، و آخر باز بخانۂ خود منزوی شدہ بارشاد طالبین و اصلاح اوشاں مشغول گشت، در چند سال چناں حسن قبول یافت کہ طالبین اصلاح از مسافتہائے دور دراز رخت سفر بسوئے فتحپور بستند و داخل حلقۂ او شدند، و از انجا کہ در مزاج شریف وے حدت بود بارے از اہل فتحپور چناں رنجید کہ تاب اقامت نداشت و در کوپا گنج منتقل گردید، بارے دیگر در گورکھپور بخانۂ مولوی ستار اللہ اقامت گزید، و بعد چندے از انجا بالہ آباد منتقل شدہ، و ہمانجا مستقل طرح اقامت ندخت، حویلیٔ بزرگ و یک قطعۂ زمین خرید کرد۔

باز برائے تبدیل آب و ہوا بہ بمبئی رفت، و ایں سفر و بسیار مبارک و سود مند افتاد، بسیارے از تجار بمبئی راہ ہدایت یافتند، در کرلا بخانۂ یکے از متمولین بمبئی اقامت می کرد، و ہمانجا نیز یک قطعۂ زمین خریدہ بود کہ دراں عمارت خانقاہ و مسجد خواہد کرد، در ۱۳۸۷ھ شوق زیارت حرمین غالب آمد، و بتاریخ نوزدہم شعبان ۱۳۸۷ھ بہ جہاز مظفری روانۂ حجاز شد، این فقیر بہ تقریب مشایعت و تودیع او در جہاز با او ملاقات کرد و دو ساعت ہمانجا ماند و وقت رخصت تا دیر معانقہ کرد، و حضرت شیخ از غایت محبت و شفقت سر و دست فقیر را بوسہ دادند، و یک شیشی عطر عود ہدیہ نمودند، فقیر ہمانروز از بمبئی روانہ شد و بروز جمعہ وارد منو گردید، و بروز شنبہ بساعت ہشتم بعد مغرب ایں خبر رسید کہ مولانا در جہاز جان بجان آفریں سپردند، ایں خبر بذریعۂ ٹیلیگرام از بمبئی آمدہ بود، مپرس کہ ازیں خبر بر من چہ

گزشت، بعد ازیں بذریعۂ اخبارات معلوم شد کہ ۲۵ رشعبان بعد از نماز تہجد بحق واصل شدند، دوراں لمحہ کسے دیگر حاضر نبود، چوں خادم چائے آورد، دید کہ روح از قفس عنصر پرواز کردہ است، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

پس تحقیق رسید کہ بتاریخ ۲۴ رشعبان بعد نماز مغرب بمرض عالج مبتلا شدند، ہیچ تدبیر وعلاج سودمند نیفتاد، ہماں شب بوقت ساعت دوازدہم روح از قفس عنصری پرواز نمود، خواستہ شدہ بود کہ در مکہ یا مدینہ تدفین سرانجام پذیرد لیکن نزدیک جدہ رسیدہ جثۂ مبارک وے سپرد آب دریائے شور کردہ شد۔[1]

(حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوریؒ، ہمارے مرشد حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے، مئو سے آٹھ یا نو میل شمال میں واقع تال نرجاان کی جائے پیدائش ہے، ۱۳۲۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اور فراغت کے بعد ہمارے مرشد کے دامن دولت سے وابستہ ہوگئے، خانقاہ امدادیہ میں مدتوں قیام رہا، وہاں انہوں نے فیوض وبرکات حاصل کیں، پھر واپس فتحپور آکر خلوت نشیں ہوگئے، شروع میں بہت تنگی کی زندگی گذاری، چند برس مبارکپور اور کئی سال کانپور میں تدریسی خدمات انجام دیں، اور ایک بار پھر اپنے گھر میں گوشہ نشیں ہوگئے اور سالکین ومریدین کی اصلاح میں مشغول ہوگئے، چند سالوں میں ہی آپ کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ راہ سلوک کے سالکین نے دور دراز علاقوں سے اپنا رخت سفر فتحپور کے لئے باندھا، اور آپکے حلقۂ

[1] حیات ص ۲۸۷-۲۸۹

عقیدت میں داخل ہوئے۔ چونکہ آپ کے مزاج شریف میں حدت تھی ایک بار اہل فتحپور سے اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ وہاں اقامت کی تاب نہ رہی اور کوپا گنج منتقل ہوگئے، دوسری بار گورکھپور میں مولوی نثار اللہ کے گھر پر اقامت گزیں ہوئے، اور کچھ ہی مدت بعد وہاں سے الہ آباد منتقل ہوگئے اور وہاں مستقل طریقے سے اقامت ڈالی اور ایک بڑی حویلی اور قطعۂ زمین خریدا۔

پھر آب وہوا کی تبدیلی کے لئے بمبئی گئے، آپ کا یہ سفر بہت مبارک اور سودمند ثابت ہوا، اور بمبئی کے بہت سے تاجروں نے راہ ہدایت پائی، کرلا میں بمبئی کے ایک مالدار آدمی کے گھر قیام فرمایا اور وہیں ایک قطعۂ زمین خرید لیا کہ اس میں خانقاہ اور مسجد کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ ۱۳۸۷ھ میں حرمین کی زیارت کا شوق غالب آیا اور ۱۹ر شعبان ۱۳۸۷ھ کو مظفری جہاز سے حجاز کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ناچیز ان کی مشایعت اور رخصت کرنے کی غرض سے جہاز میں ان سے ملاقات کرنے گیا اور دو گھنٹے وہاں رہا، رخصت کے وقت دیر تک معانقہ کیا، حضرت شیخ نے بیحد درجہ محبت وشفقت کی وجہ سے ناچیز کے سر اور ہاتھوں کا بوسہ لیا اور عطر عود کی ایک شیشی ہدیہ کی، ناچیز اسی دن بمبئی سے روانہ ہوا اور جمعہ کے دن مئو وارد ہوا، سنیچر کے دن مغرب کے بعد ۸ر بجے یہ خبر پہنچی کہ مولانا نے جہاز میں جان جان آفریں کے سپرد کردی، یہ خبر بمبئی سے بذریعۂ ٹیلی گرام موصول ہوئی تھی، مت پوچھو کہ اس خبر سے مجھ پر کیا گزری، اس کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ ۲۵ر شعبان کو سحر کے وقت نماز تہجد سے فراغت کے بعد واصل بحق ہوئے، اس وقت کوئی دوسرا شخص حاضر

خدمت نہیں تھا، جب خادم چائے لایا تو دیکھا روح قفس عنصری سے
پرواز کرگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی بے پایاں رحمت کا سایہ فرمائیں۔
پھر تحقیق سے یہ خبر ملی کہ ۲۴ شعبان کو نماز مغرب کے بعد فالج سے
مرض میں مبتلا ہوئے، کوئی تدبیر وعلاج سودمند نہیں ہوا، اور اسی رات
۱۲ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، یہ چاہا گیا کہ مکہ یا مدینہ میں
تدفین انجام پائے لیکن جدہ کے قریب پہنچ کر جسد مبارک سمندر کے سپرد
کردیا گیا۔)

جگر مرادآبادی سکندر علی جگر مرادآبادی اشہر واشعر شعرائے عصر بود، بارہا مرا اتفاق صحبت وسماع غزلیات او افتادہ، در گونڈہ رخت اقامت انداخت، ومدتے دراز کہ بیش از سی سال باشد ہمانجا ماند، وبالآخر ہمانجا پیوند خاک شد، ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ) روز جمعہ بود کہ ازیں جہاں درگذشت، من ابیاتہ المستحسنۃ قولہ[1]

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی!

(سکندر علی جگر مرادآبادی اپنے زمانے کے سب سے مشہور اور بڑے
شاعر تھے، بارہا مجھے ان کی صحبت اور غزل سننے کا اتفاق ہوا، گونڈہ میں
رخت اقامت ڈالا، اور عرصۂ دراز یعنی ۳۰ سال سے زیادہ وہاں فروکش
رہے، اور بالآخر وہیں پیوند خاک ہوئے، ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء (۱۶ ربیع الاول
۱۳۸۰ھ) جمعہ کے دن اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کے پسندیدہ
اشعار میں یہ شعر ہے۔

مرگ عاشق تو کچھ نہیں لیکن اک مسیحا نفس کی بات گئی

---

[1] حیات ص ۶۵۴

فارسی نظم

فارسی میں بھی مولانا اعظمی کا شاعرانہ کلام دیکھنے میں آتا ہے، فارسی نظموں میں بھی وہی خوبیاں، وہی سلاست زبان اور نزاکت بیان ہے، جو عربی اور اردو کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ فارسی میں مولانا کی ایک نعت شریف اور متعدد قطعات تاریخ ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ایک فارسی نعت اور ایک قطعۂ تاریخ پیش خدمت ہے

نعت شریف

ز آستانت با سر اشک غم بعودت می روم — با دل صد چاک و با صد یاس و حسرت می روم

گر تو استم نمی بودم زپائے تو جدا — می روم لیکن بقصد و عزم عودت می روم

می روم سوئے وطن و ز درد دل بے اختیار — نالہ دارم نہ می گوئی بہ غربت می روم

یا رسول اللہ جئنا اذ ظلمنا فنحمد — رہنما با ہر دو وصف ختمیت می روم

نعش اباہ یہ مولی الحبیب الأعظمی
خستہ افتادہ تمہید چوں رکوبیت می روم

مولانا ابوالکلام آزاد کا قطعۂ تاریخ وفات

مولانا اعظمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا۔

وزیر دولت جمہوری ہند — زعیم انقلاب ہند آزاد

نہ گفتارش کہ گوہرہائے تاباں — نہ تحریرش کہ یاد از سحر می داد

دریغ ایں جہاں رخت سفر بست — بر او صد رحمت و رضوان حق باد

اگر تاریخ او خواہی نوشتن بگو سہ بار اختر موت آزاد

مولانا اعظمی نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع کو "گوہر ہائے تاباں" اور "گوہر ہائے شہوار" دونوں طریقوں پر لکھا ہے۔ اسی طرح آخری شعر کا پہلا مصرع اس طرح بھی لکھا ہے "اگر پرسد کسے سال وفاتش" "موت آزاد کی گنتی ۴۵۹ آتی ہے۔ اگر اس کو تین سے ضرب کریں "بگو سہ بار اختر" سے جس کی طرف اشارہ ہے، تو مجموعی اعداد ۱۳۷۷ آ گئے۔[۱]

مولانا نے عربی فارسی اور اردو میں اپنی تحقیقات کو پیش کیا ہے۔ وہ بہت عظیم شاعر یا ادیب تو نہ تھے، شاید وہ اپنی شناخت اور پہچان اس حیثیت سے چاہتے بھی نہ تھے، لیکن ادب پر ان کی گرفت اور ان کا خوبصورت طرز نظر اور ان سب سے بالا تر فن پر ان کی عمیق نظر (جس کا ثبوت قاضی اطہر مبارکپوری کے نام ان کا خط ہے)، ان کا وسیع مطالعہ، ان کے اندر چھپی ہوئی ایک تخلیقی شخصیت مندرجہ بالا مثالوں میں دیکھی جا سکتی ہے، چاہے وہ نثر ہو یا نظم، عربی ہو یا فارسی، یا پھر اردو، ان تمام زبانوں میں مولانا کو دسترس حاصل تھی۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک مرد باخبر اور عالم حق آگاہ کی حیثیت سے انہوں نے اپنے لئے اور اپنی دنیوی اور اخروی زندگی کے لئے جو شناخت اور پہچان اور انفرادیت بنائی وہ دین و مذہب کی وسیع دنیا تھی۔

☆ ☆ ☆

۱؎ ایضاً، ص ۲۳۵

باب چہارم

متفرقات

باب چہارم

متفرقات

اقبال نے جب کہا تھا۔

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا

اور زمانے بھی ہیں جنکا نہیں کوئی نام

تو انہوں نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ اگر بے نام زمانے ہیں تو بے عنوان افسانے بھی ہیں۔ اور جب کسی گراں قدر علمی شخصیت پر قلم اٹھایا جاتا ہے، تو یہ بے عنوان افسانے کثرت سے سامنے آتے ہیں، اس لئے انہیں کوئی عنوان نہ دے کر متفرقات کی صف میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

ان میں باہمی ربط صرف مصنف کی شخصیت ہوتی ہے، اور انہیں اس لئے جگہ دی جاتی ہے کہ گلزار تخلیق میں صرف پھول، کانٹے، پتیاں اور رنگ ہی نہیں ہوتے بلکہ کیاریاں اور تھالے اور اڑتا ہوا سبزہ کا رنگ، یہ سب بھی اہم ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر تحقیق و تعلیق اور تشریح و تبصرہ وغیرہ کی اہمیت ہے تو وہ نقل و حواشی بھی اہم ہیں جو کسی کتاب کے متن کے سلسلہ میں تصحیح کرتے ہوئے لکھوائے گئے، مختلف موضوعات پر لکھے گئے وہ رسالے اور کتابچے بھی اہمیت کے حامل ہیں جو اگرچہ حجم میں چھوٹے ہیں مگر موضوع کے اعتبار سے گراں قدر ہیں، اسی علمی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے "متفرقات" کے عنوان کے تحت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کی

اس طرح کی علمی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلے سوال نا کی کتاب ''حسن ادب اور اسکی اہمیت'' کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

حسن ادب اور اسکی اہمیت

اسلام جس اعلیٰ تہذیب وتمدن اور جن پاکیزہ خلاقی قدروں کا داعی ہے، وہ اسی وقت وجود میں آسکتے ہیں، جب ہم صالح معاشرہ کی تعمیر کریں اور پاکیزہ ماحول کو تشکیل دیں، اور پاکیزہ معاشرہ کی تعمیر وتشکیل اسی وقت ممکن ہے جب زندگی کا سیقہ جانتے ہوں، اور اسکے آداب واطوار سے واقف ہوں، اور ہم زندگی کا سلیقہ اور اس کے اصول وآداب اسی وقت جان سکتے ہیں، جب ہم اسلام کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں گے۔

اس تیز رو ترقی کے ماحول میں جب ہم ارد گرد دیکھتے ہیں، اور اپنے معاشرہ کا جائزہ لیتے ہیں، تو پوری انسانیت بڑی تیزی سے تنزلی کی طرف ڈھلکتی نظر آتی ہے، اسکی صرف اور صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہم اسلام کے بتائے ہوئے نظام حیات کو چھوڑ چکے ہیں۔

بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جس قوم مسلم نے دنیا کی تاریک رہگزر پر ترقی کی قندیلیں روشن کیں، جس نے اقوام عالم کو پستی وبسماندگی کے گڈھے سے نکال کر ترقی کی سطح پر گامزن کیا، آج وہی قوم مسلم سب کی نظروں میں پست سمجھی جارہی ہے، بلاشبہ ہمیں پست کہنے والے خود پستی کے دلدل میں ایسے پھنسے ہیں کہ ہزارہا کوششیں بھی ان کو اس دلدل سے نہیں نکال سکتیں، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کامیاب زندگی کا جو لائحہ عمل پیش کیا تھا،

اور جس کو ہمارے اسلاف نے عملی زندگی میں برت کر دین و دنیا کی سرخروئی حاصل کی تھی، آج اس پاکیزہ دستور زندگی کا دامن ہم سے چھوٹتا نظر آرہا ہے۔

تواضع، انکساری، بڑے چھوٹوں کا ادب ولحاظ، ہمدردی، مردم خوئی اور ایثار وقربانی وغیرہ جن میں ہماری کامیابی کا راز پنہاں تھا، اب ہم میں یہ خوبیاں اس طرح کہاں، جس طرح ہمارے بزرگوں اور اسلاف میں تھیں، غرض کہ ہمارے اخلاق وعادات مائل بہ زوال اور انحطاط پذیر ہیں، بڑے ادب کے ساتھ ہم یہ کہنے کی بھی جرأت کریں گے کہ یہ اخلاقی انحطاط عوام تک ہی محدود نہیں بلکہ حلقۂ خواص بھی اس مرض میں مبتلا ہے۔

معاشرہ کی اصلاح اور سماج کی بہتر سے بہتر تعمیر وترقی کے لئے ہر دور میں غور وفکر کیا جاتا رہا ہے، اور زندگی کے اسلامی آداب کی روشنی میں اس انحطاط وزوال کا حل پیش کیا جاتا رہا ہے، چنانچہ آداب زندگی پر بہت سی کتابیں بھی لکھی جاتی رہیں، انھیں کتابوں میں ایک کتاب ''حسن ادب اور اسکی اہمیت'' بھی ہے، جسکو مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے تصنیف فرمایا ہے۔

مولانا اعظمی نے اس کتاب میں ان چیزوں کو ذکر کیا ہے، جن پر ایک طرح سے معاشرہ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کتاب کے عنوان یہ ہیں استاذ کا مرتبہ، استاذ اور رہبر عام کے حقوق، احترام علم وعلماء، اجلال علم وتعظیم، استاذ کا لحاظ پہلے لوگوں میں، استاذ کے ساتھ عقیدت، بات چیت میں تمیز اور ادب کی تعلیم، تذکرۃ السامع کی ایک فصل کا خلاصہ، حضرت علی کی نصیحتیں طلبہ کو۔

مولانا اعظمی مدارس دینیہ کے طلبہ کے گرتے ہوئے اخلاق کو دیکھ کر بہت مایوس تھے، ان کے اخلاق وعادات کی اصلاح کی فکر دامنگیر رہتی، اس لئے اس کتاب میں ان کو اپنے اخلاق کی اصلاح کی طرف بطور خاص متوجہ فرمایا ہے۔ اس

کتاب کا دوسرا نام بھی مولانا نے "الهدية السنية لطلاب العلوم الدينية" رکھا۔

مولانا کی یہ تحریر پہلی دفعہ 'دارالعلوم' دیوبند شعبان ۱۳۱۷ھ میں شائع ہوئی، 'دارالعلوم' نے دوبارہ ۔ ذیقعدہ، ذی الحجہ ۱۳۱۹ھ میں شائع کیا، تیسری مرتبہ مجلہ 'المآثر' نے محرم، صفر، ربیع الاول ۱۳۱۵ھ میں شائع کیا، اور اب ۱۴۲۲ھ م ۲۰۰۱ء میں اس رسالہ کو مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو نے شائع کیا ہے۔

اسرار المحبة

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ (۱۱۶۳ھ-۱۲۳۳ھ) سرچشمہ علم وفن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صاحبزادے ہیں۔ شاہ رفیع الدین دہلوی بڑے پایہ کے محدث ومحقق اور فقیہ ہیں، ادب اور فنون لطیفہ میں بھی آپکو ملکہ تامہ حاصل تھا، گرانقدر اور مرجعی حیثیت کی حامل کتابیں آپ کی تصنیفی یادگار ہیں، ان تصنیفات میں ایک اہم نام 'اسرار المحبة' کا ہے۔

'اسرار المحبة' موضوع اور نوعیت کے اعتبار سے ایک اہم اور انوکھی تصنیف ہے، یہ کتاب محبت کے موضوع پر لکھی گئی ہے، جیسا کہ اسکے نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے، اس میں محبت کے ہر نشیب وفراز سے بحث ہے، اقسام، نتائج اور اثرات وغیرہ پر کلام کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس کتاب میں صرف محبت کی ہی بات ہو بلکہ اس موضوع کے ذیل میں بہت سے مسائل دقیقہ، اور اسرار غامضہ سے بھی بحث ہے، اس میں ولی اللہی فکر وحکمت کی بعض الجھی ہوئی گتھیاں بھی سلجھائی گئی ہیں۔ شیخ محسن ترہتی نے اس کتاب کی اور اسکے مصنف کی خوب تعریف کی ہے، اور آخر میں لکھا کہ:

"فلما اتفق مثله ممن تكلم عليها" ۱؎ یعنی شاہ رفیع الدین کے علاوہ چند ہی لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے محبت کے اسرار و رموز پر اس طرح کلام کیا ہو۔

'اسرار المحبۃ' کے تین اجزاء ہیں (۱) تحصیل (۲) تذئیل (۳) تفصیل۔ پھر ان اجزاء کے بھی ذیلی اجزاء ہیں۔ آخری جزو 'تفصیل' میں عربی قصائد بھی ہیں ان میں سے کچھ دوسرے شعراء کے ہیں اور کچھ خود حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کے ہیں۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت بھی بلند ہے، ادبی نقطۂ نظر سے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالحمید سواتی مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ لکھتے ہیں

"اس کتاب کا شمار یقیناً ادبیات عالیہ میں ہوگا، اس لئے کہ موضوع کی عظمت کے علاوہ اس میں زبان کی پاکیزگی اور سلاست انتہائی درجہ کی پائی جاتی ہے، فصاحت و بلاغت اور اظہار مافی الضمیر کے لئے جس قسم کے الفاظ شاہ صاحبؒ نے چنے ہیں وہ نہایت ہی قیمتی ذخیرہ ہے۔" ۲؎

یہ کتاب اب تک نایاب تھی، اسکے نسخے بھی دسترس سے باہر تھے، کچھ ملے بھی تو کرم خوردہ یا بوسیدہ۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کو جنہیں نادر قلمی نسخوں اور قدیم علمی کتابوں کے سلسلہ میں ہمیشہ تجسس رہتا تھا، 'اسرار المحبۃ' جیسی اہم کتاب کا ایک نسخہ دستیاب ہوگیا، جسے انہوں نے نقل کرکے مجلس علمی کراچی روانہ فرمایا، مولانا اعظمی نے ایک مکتوب میں اسکے بارے میں یوں انکشاف فرمایا ہے

"اسرار المحبۃ کی نقول بھی مجلس علمی کے پاس میری ہی بھیجی ہوئی ہیں، جسکو مجلس کے سرپرستوں کی خواہش پر میں نے نقل کرایا اور بھیجا ہے۔" ۳؎

۱؎ الیوانع الجنی ـ علی ہامش، سائر رجال البخاری ص ۷۶

۲؎ اسرار المحبۃ ص ۱۱

۳؎ ایضاً ص ۱۵

مولانا عظمی نے 'اسرار الحجۃ' کے قلمی نسخہ کو حاصل کر کے نہ صرف یہ کہ اس کو نقل کرایا بلکہ اس نسخہ کی جا بجا تصحیح بھی کی۔ ان کی تصحیحات اس کتاب میں کافی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسکے باوجود اس نسخہ کی مکمل تصحیح نہ ہو سکی۔ مولانا مذکورہ بالا خط میں آگے لکھتے ہیں:

''اسرار الحجۃ کے حاشیہ پر بھی جگہ جگہ میرے قلم سے تصحیحات ہیں فرصت نہیں تھی ورنہ اس سے زیادہ مکمل تصحیح ہو گئی ہوتی۔''[1]

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ مغربی پاکستان نے جب اس کتاب کی نشر و اشاعت کا ارادہ کیا تو مجلس علمی کراچی سے ہندوستان سے بھیجے ہوئے مولانا عظمی کے نسخہ کو مولانا عبدالحمید صاحب سواتی نے حاصل کیا، اسکے علاوہ ایک نسخہ ڈاکٹر محمد شفیع ڈائرکٹر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے بھی انہیں ملا۔ اسرار الحجۃ کی تصحیح و تنقیح میں مولانا سواتی نے مولانا عظمی کی تصحیحات سے فائدہ اٹھایا، اور جہاں جہاں مولانا اعظمی کے حواشی تھے انکو کتاب کے حاشیہ میں 'الاعظمی' کے رمز کے ساتھ نقل فرمایا۔ مولانا عبدالحمید سواتی مولانا عظمی کا شکریہ اس انداز میں ادا کرتے ہیں:

''حضرت مولانا اعظمی دامت برکاتہم کے بھی ہم از حد ممنون ہیں، جنکی تصحیحات سے ہم نے فائدہ اٹھایا اور جو اپنے گرانقدر علمی مشوروں سے ہم جیسے کم علم لوگوں کو نوازتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، ادام اللہ فیوضہم و برکاتہم۔''[2]

اس طرح سے مولانا اعظمی 'اسرار الحجۃ' جیسی اہم اور نایاب کتاب کی اشاعت کا بھی وسیلہ بنے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ مولانا عبدالحمید سواتی کی تصحیح و مقدمہ

---

[1] اسرار الحجۃ ص ۱۷

[2] ایضاً

کے ساتھ ۱۳۸۳ھ میں اشرف پریس لاہور سے چھپ کر ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے شائع ہوئی۔

تکمیل الاذہان

تکمیل الاذہان شاہ رفیع الدین دہلوی کی غالباً آخری تصنیف ہے۔ یہ کتاب عقلیات اور منطق و فلسفہ کے موضوعات سے متعلق ہے۔ منطق کی کیا ضرورت ہے، علوم میں علم منطق کی کیا اہمیت ہے، ان تمام امور پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے: باب اول منطق کے بارے میں، باب دوم فن تحصیل کے بارے میں اور باب سوم امور عامہ کے ان خاص مباحث کے بارے میں ہے جو کثیر الاستعمال ہیں، جن میں انسان کو اکثر اشتباہ ہو جاتا ہے۔ باب چہارم تطبیق آراء کے سلسلہ میں ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اس کتاب میں پیچیدہ اور اہم نکات و مسائل دقیقہ پر بحث کی ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر شاہ صاحب کے علم کی رفعت و بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے ایسے پرپیچ مسائل جمع کئے ہیں اور ایسے مباحث سے بحث کی ہے کہ مولانا عبد الحمید سواتی نے صاف لفظوں میں یہ تنبیہ فرما دی کہ:

> "یہ کتاب شاہ رفیع الدینؒ نے مبتدی حضرات کے لئے نہیں تصنیف کی بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ذہنی بالیدگی اور تکمیل کے لئے تصنیف کیا ہے، اور اصلی غرض اس سے امام ولی اللہ کے فلسفہ کو ہمہ گیر کرنے اور

---

۱ کتاب کے شروع میں طباعت کا سن محرم الحرام ۱۳۸۸ھ درج ہے لیکن یہ سن صحیح نہیں ہے بلکہ ۱۳۸۳ھ ہے۔ یہاں تصحیف ہو گئی ہے، کیونکہ عبد الحمید سواتی مقدمہ کے آخر میں جو سن درج کرتے ہیں وہ شوال ۱۳۸۲ھ کا ہے۔

اس کی مشکلات کو آسان کرنے کے لئے تقریب الاذہان کی خاطر یہ اہم
کتاب تصنیف فرمائی ہے۔"[1]

تکمیل الاذہان کے کچھ حصے ابجد العلوم میں شائع ہوئے تھے لیکن اب تک یہ کتاب مکمل طبع نہیں ہوئی تھی، اس کتاب کی بھی تصحیح وتحقیق مولانا عبدالحمید سواتی نے کی ہے۔ اسکے قلمی نسخے جو مولانا سواتی نے حاصل کئے ان میں ایک نسخہ مجلس علمی کراچی کا بھی تھا، مجلس علمی کو یہ نسخہ بھی مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کے ذریعہ حاصل ہوا تھا، اس نسخہ کی بھی مولانا اعظمی نے تصحیح کی ہے۔ مولانا سواتی اس نسخہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"تکمیل الاذہان کا نسبتاً ایک بہتر اور جامع قلمی نسخہ ہمیں مجلس علمی کراچی کے ناظم حضرت مولانا محمد طاسین صاحب مدظلہ سے حاصل ہوا، یہ بڑا صحیح اور مکمل نسخہ ہے، دراصل یہ نسخہ فخر المحدثین، سید الفقہاء، و تاج العلماء حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی دیوبندی دامت برکاتہم کے توسط سے حاصل کیا گیا ہے، اور آپ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔"[2]

مولانا اعظمی نے جو تصحیحات کی ہیں، مولانا عبدالحمید سواتی نے انکو حاشیہ میں "م" کی علامت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کتاب پر سنہ اشاعت تو درج نہیں ہے، لیکن مولانا سواتی نے تکمیل الاذہان کے مقدمہ میں جو تاریخ درج کی ہے، وہ ۲۹ رشعبان ۱۳۸۳ھ ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی کے آس پاس "تکمیل الاذہان" کی اشاعت ہوئی ہوگی۔ شرف پریس لاہور سے یہ کتاب پہلی مرتبہ مکمل چھپی ہے۔

---

[1] تکمیل الاذہان ص ۱۵

[2] ایضاً ص ۱۲

فیض الحق ملقب بہ دمغ الباطل

شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے اس کتاب میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے مسئلہ پر کلام کیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس مسئلہ کی اصل حقیقت اور عقائد میں اسکی اہمیت وضرورت سے بحث کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود دونوں ایک ہی چیز ہے، صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔

مولانا غلام یحییٰ بن نجم الدین بہاری نے بھی اس موضوع پر 'کلمات الحق' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا، اس رسالہ میں انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تطبیق بین وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کی تردید کی ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی نے اپنی کتاب میں مولانا غلام یحییٰ صاحب بہاری کے موقف کی تردید کی، اور اس سے متعلق تمام اشکالات واعتراضات کے جوابات دیئے۔ شاہ صاحب کی کتاب کا نام 'فیض الحق' ہے اور لقب 'دمغ الباطل' ہے، لیکن یہ کتاب اپنے لقب سے معروف ہے۔ بہت ہی حساس اور نازک موضوع پر شاہ رفیع الدینؒ نے قلم اٹھایا، اور الجھے ہوئے مسئلہ کی یک صاف ستھری شکل پیش کی، شاہ صاحب نے جس چیز کو ثابت کرنا چاہا سے بڑے پختہ شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

محسن ترہتی نے 'دمغ الباطل' کی توصیف یوں فرمائی

"وكتابه دمغ الباطل في بعض المسائل الغامضة من علم الحقائق معروف اثنى عليه أهله"[1]

(علم الحقائق کے بعض دقیق مسائل سے متعلق انکی کتاب دمغ الباطل بہت مشہور ہے، اہل علم حضرات نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔)

[1] الیانع الجنی ۔ علی ہامش اسماء رجال الطحاوی ص ۷۵

دمغ الباطل فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ جتنا حصہ عربی میں ہے تو کچھ حصہ فارسی میں ہے۔

شاہ رفیع الدین کی دوسری کتابوں کی طرح اس بہترین کتاب کی بھی اشاعت کی ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو فکر ہوئی، اور مولانا عبدالحمید سواتی اس کے نسخوں کی تلاش میں ایک بار پھر متحرک ہوئے۔ انہوں نے مولانا اعظمی سے اس سلسلہ میں رابطہ قائم کیا۔

مولانا اعظمی نے اس کے نسخوں کے بارے میں پتہ لگایا، انہیں حاصل کیا، ان کی نقل و تصحیح کرائی اور مولانا سواتی کے پاس ارسال فرما دیا۔ مولانا عبدالحمید سواتی دمغ الباطل کے سلسلہ میں مولانا اعظمی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

> "ہم شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت برکاتہم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں، جنہوں نے اس کتاب کی نقل کرانے اور پھر اس کے مختلف نسخوں سے تقابل کرانے میں اور پھر خود بھی اس کتاب کے ایک اچھے خاصے حصے کی تصحیح فرمانے میں جو کوشش و سعی فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور تا دیر ان کو صحت و عافیت سے رکھے۔"[1]

مولانا سواتی نے مندرجہ بالا اقتباس میں تحریر فرمایا ہے "اچھے خاصے حصے کی تصحیح فرمانے ... الخ" اچھے خاصے حصے سے یہاں کیا مراد ہے؟

جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دمغ الباطل کے ڈیڑھ سو صفحات کی تصحیح مراد ہے، جیسا کہ مولانا سواتی مقدمہ میں ہی ایک دوسری جگہ کی

[1] دمغ الباطل ص ۹

تصریح فرماتے ہیں

''مولانا اعظمی نے خود بھی دفع الباطل کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات دیکھے اور تصحیح بھی فرمائی۔''[1]

یہ کتاب مولانا عبدالحمید سواتی صاحب کی تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ نفیس پرنٹرز لاہور سے مارچ ۱۹۷۶ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی۔

عظمت صحابہ

جناب خلیل احمد صاحب چشتی صابری امجدی نے ''اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معاویہ کی صحابیت'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، اس کتاب میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کی صحابیت کا انکار کیا تھا، اور ان پر معاندانہ طعن وتشنیع کی تھی۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے ''اصحاب رسول اللہ اور معاویہ کی صحابیت'' نامی اس کتاب کا رد ''عظمت صحابہ'' لکھ کر کیا۔ مولانا اعظمی نے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص حضرت معاویہؓ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، یا جو اِن پر الزام تراشیاں کی جاتی ہیں، اس کو دفع کیا ہے۔

یہ کتاب غیر مطبوعہ تھی، پہلی دفعہ مجلہ المآثر نے چھ قسطوں میں اس کو شائع کیا ہے، اس کے بعد اس رسالہ کو مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو نے شائع کیا ہے۔

---

[1] دفع الباطل ص ۳۰

رشحات قلم

مولانا الاعظمی کے قلم سے نکلی ہوئی بہت سی تحریریں تو ضائع ہو گئیں جیسا کہ اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، لیکن الحمدللہ اب بھی قلمی مسودات میں موجود بہت سی تحریریں کتب، رسائل اور مضامین کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے متعدد مضامین 'المآثر' میں شائع بھی ہو چکے ہیں، اور مزید یہ سلسلہ جاری بھی ہے۔

مولانا اعظمی کے مسودات میں موجود تحریروں، رسالوں میں شائع مضامین ومقالات اور خود مولانا کی تیار کردہ فہرست سے مختلف مضامین اور کتب ورسائل کی ایک فہرست مرتب کی گئی ہے، جو حیات ابوالمآثر کے حوالے سے قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ فقہ، تاریخ ومناظرہ کی فصلوں کے ضمن میں بھی مولانا کے فقہی مقالات، تاریخ سے متعلق مضامین اور مناظرانہ تحریروں کی علیحدہ علیحدہ فہرستیں پیش کی گئی ہیں۔

۱- ابوعبید کی غریب الحدیث (معارف اکتوبر ۱۹۲۶ء)

۲- ارسال الصحیفہ کا رد

۳- استدراک بر فضل اللہ الصمد

۴- اسلام اور صنف نازک (المومن کلکتہ صفر، ربیع الثانی اور جمادی الاولی ۱۳۴۳ھ)

۵- امام اعظم اور خطیب بغدادی

۶- امام شافعی کے دو سفرنامے

۷- استفسارات انجمن ادبی سندھی

۸- انتقاد صحیح پر تجلی کا تبصرہ پڑھ کر

۹- اوزان ومثاقیل

۱۰- بحث ناسخ

۱۱- بحر رمل اور بحر سریع

۱۲- بسملہ "قافلہ اہل دل" (الفرقان دسمبر ۱۹۷۳ء)

۱۳- پیٹ پر پتھر باندھنے کی حدیث

۱۴- تاج التراجم فی تفسیر القرآن للاعاجم

۱۵- تبصرہ بر تصحیح الاغلاط الکتابیہ (الفرقان شعبان ۱۳۷۱ھ)

۱۶- تبصرہ بر زجاجۃ المصابیح (الفرقان محرم ۱۳۷۷ھ)

۱۷- تحقیقات مفیدہ (الفرقان سالنامہ ۱۳۵۵ھ)

۱۸- تخریج زیلعی (معارف جولائی ۱۹۳۰ء، الفرقان رجب ۱۳۵۹ھ، المآثر محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۱۳ھ)

۱۹- تردید اہل قرآن

۲۰- تردید سرسید

۲۱- جمع قرآن

۲۲- چہ دل ورست وزدے کہ بکف چراغ دارد

۲۳- حجیت حدیث (القاسم ۱۱ اپریل، ۱۰ مئی ۱۹۲۳ء)

۲۴- حضرت معاویہ کی شان میں سوء ادبی اور اسکا جواب (النجم جمادی الاولی والآخرۃ ۱۳۴۹ھ، المآثر ج ۱ ش ۳، ۴ بعنوان حضرت امیر معاویہؓ کا مرتبہ و مقام)

۲۵- حضرت معاویہ کے متعلق ایک سوال

۲۶- خدا نور ہے

۲۷- الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ کا نادر نسخہ (معارف اگست ۱۹۵۰ء)

۲۸- دو متبرک اجازت نامے (معارف ۱۹۳۷ء)

۲۹- رجال بخاری کا دندان شکن جواب (الداعی رجب و شعبان ۱۳۶۰ھ)

۳۰- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی زندگی

۳۱- زراعت و جاگیرداری

۳۲- سید الشہداء کی تحقیق (الماثر ربیع الآخر تا جمادی الاخری ۳۶ھ)

۳۳- سیرۃ النبی شبلی پر ایک نظر

۳۴- السیف لباتر

۳۵- سیف و قلم (دارالعلوم اپریل ۱۹۵۵ء)

۳۶- عباسی کا رد قاضی اطہر مبارکپوری کے قلم سے

۳۷- عظمت صحابہ، خواجہ حسن نظامی کے باطل خیالات کی تردید (العدل ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء)

۳۸- علم رجال کی اہمیت

۳۹- "عہد زریں" پر تبصرہ

۴۰- غریب الحدیث (معارف فروری ۱۹۶۸ء)

۴۱- فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (معارف اپریل ۱۹۷۹ء)

۴۲- قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند پر ایک نظر

۴۳- قرون اولیٰ میں حفظ حدیث کا اہتمام (بلاغ جون ۱۹۵۴ء دارالعلوم مارچ ۱۹۵۹ء)

۴۴- قیامت کے دن پہلا سوال

۴۵- محدثین پر سنت کی ہو خوری کا الزام (دارالعلوم محرم و صفر ۱۳۶۱ھ)

۴۶- مذہب حنفی کی عالمگیر مقبولیت (ارشد کیم مئی ۱۹۲۷ء)

۴۷- مضمون خلفاء شاہ غلام علی پر کچھ اضافہ

۴۸- مقامات تصوف پر تبصرہ و تنقید

۴۹- مناقب اعظمیہ

۵۰-مولوی سامرودی کے سوالات کا مسکت جواب

۵۱-واعتصموا بحبل اللہ (القاسم ۲۵ راگست، ۱۰ ستمبر ۱۹۲۴ء)

۵۲- وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین یا شان رحمۃ للعالمین (ارشاد یکم مئی ۱۹۲۷ء،

المآثر محرم تا ربیع الاول ۱۴۳۰ھ)

۵۳-ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات (برہان فروری ۱۹۵۳ء)

۵۴-ہندوستان میں علم حدیث اور قاضی اطہر

۵۵-معجزات وکرامات (الفیض امرتسر ربیع الاول تا جمادی الثانیہ اور رجب ۱۳۴۳ھ)

۵۶-بناء عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

۵۷-ترجمہ کتاب الترغیب والترہیب

۵۸-سیرۃ طحاوی

۵۹-قاضی نامہ بجواب جولاہہ نامہ

۶۰-لغات حدیث

۶۱-مفتاح النحو

۶۲-ترجمہ موطا امام مالک

باب پنجم

مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں

باب پنجم

مولانا اعظمی اہل علم کی نظر میں

مولانا اعظمی نے ہمہ گیر علمی وتحقیقی، سیاسی وسماجی خدمات انجام دیں، ایک طرف علمی، تصنیفی اور مطالعاتی مشغولیت تھی، تو دوسری جانب وقت کی سیاست وقیادت میں عملی شرکت، ایک طرف اکابر امت علماء وفضلاء کے ساتھ علمی مشاورت تھی، تو دوسری جانب رمز شناس ونبض آشنائے سیاست کے ساتھ مل کر مقتضائے حال کے مطابق لائحہ عمل کی ترتیب وتہذیب کی فکر تھی، ظاہر ہے جس کا میدان عمل اتنا وسیع ہو، جس کے کام کی جہتیں متنوع ہوں، اسے معتقدین واحباب، مدح وتنقید بھی کرتے رہے ہوں گے۔

مولانا میں آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے ہر طبقہ علم ومکتب فکر کو ان کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے کام کے دائرے میں وسعت پیدا کی؟ اگر اس سوال کے جواب کے بارے میں سوچا جائے تو شاید ہمیں صرف اور صرف ایک ہی جواب ملے گا ”جوہر علم“، جس نے دور دراز ملکوں کے صاحب فضل وکمال کو ہندوستان کے ایک گوشہ مئو ناتھ بھنجن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیا۔

مولانا اعظمی کا شہرہ دور طالب علمی سے ہی ہونے لگا تھا، خواہ اس شہرت کا سبب ان کی قوت حافظہ ہو یا علمی لیاقت واستعداد، اساتذہ نے اسی زمانہ میں شاگرد کے تابندہ مستقبل کی پیشین گوئیاں کردی تھیں۔ جب مولانا مسند درس پر بیٹھے تو ان

کے اردوں میں بھی شہرت ہونے لگی، اور جب قلم سنبھالا تو قلم گہر بار سے کئی تصنیفات وتحقیقات وجود میں آئیں کہ پورے ملک میں ان کا چرچا ہونے لگا، چنانچہ بڑے بڑے علماء مولانا اعظمی کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اور اس طرح علم وتحقیق میں ان کی ایک امتیازی شناخت بن گئی۔

اور جب عالم اسلام کے محققین پر مولانا کے بعض تنقیدی مضامین ومقالات شائع ہوئے تو پھر کیا تھا گویا ان کی شہرت ومقبولیت کو بال وپر لگ آئے، عالم اسلام کے ممتاز محدثین، محققین اور ناقدین مولانا اعظمی کو جلالت وقدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے، پیچیدہ مباحث میں ان کی رائے کے منتظر ومشتاق رہنے لگے، مصر وشام، حجاز اور افریقہ وغیرہ کے اہل علم وفضل مولانا کے ایسے شیدا ہوئے کہ ان کی خدمت میں نیاز مندانہ انداز میں حاضر ہوکر استفادہ کرتے اور قدماء کے طریقہ پر ان سے حدیث کی روایت کی سند لیتے[1] ایک عرب عالم کا بیان ہے کہ ہم مولانا اعظمی کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے باپ دادا کو جانتے ہیں[2]

عرب کے ارباب نظر اور اصحاب فضل جن کی سرشت میں سخاوت ہے، نے مولانا کے تبحر علمی کا بعد تک میں اعتراف کیا ہے۔ سخاوت کا مفہوم یہی نہیں کہ کسی کی بھرپور ضیافت کرائی جائے یا جو مانگے دے دیا جائے، بلکہ سخاوت وفیاضی یہ بھی ہے کہ سامنے والے کے علم وفضل اور کمال کا بے لاگ اعتراف کیا جائے۔

عرب کے دلوں میں مولانا کے لئے عزت واحترام کا یہ جذبہ تھا کہ جب مدینہ یونیورسٹی کے صدر کا عہدہ خالی ہوا تو مجلس منتظمہ نے متفقہ طور پر یہ تجویز پاس کی کہ صدارت کے لئے ۲۰ ہزار روپے مشاہرہ پر مع لوازم رہائش مولانا اعظمی کو بلایا

۱ ترجمان الاسلام ۱-۱۲ ص ۴۷

۲ ایضاً ص ۲۲

چاہئے لیکن مولانا نے شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو واپس فرما دیا۔[1]

علمی کارناموں کی بنیاد پر آپ کو عرب ممالک کی متعدد یادگار کے موقر عالمی اداروں اور اکیڈمیوں نے مولانا کو اپنا رکن اور ممبر بنانا باعث فخر سمجھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی بغداد کا مشہور علمی ادارہ المجمع العلمی العراقی ہے، جس نے ۱۹۸۹ء میں مولانا کو اپنا رکن منتخب کیا، المجمع العلمی العراقی (IRAQI ACADEMY) کے چیئرمین ڈاکٹر صالح احمد العلی نے مولانا کے نام کے انتخاب کے بعد انہیں یہ مکتوب ارسال کیا

"يسرني أن أبلغكم بأن مجلس المجمع العلمي العراقي في جلسته العاشرة المنعقدة في الثاني والعشرين من شهر رجب سنة ۱۴۰۹هـ الموافق للثامن والعشرين من شهر شباط سنة ۱۹۸۹م قرر انتخابكم عضواً مؤازراً فيه تقديراً لمكانتكم العلمية الرفيعة ومجهوداتكم في ميادين اللغة والثقافة مما يعنى المجمع بدراسته

وإنني إذ أهنئكم بهذا الانتخاب الذي يوثق العلاقة العلمية والثقافية أرجو تزويد المجمع بموجز عن سيرتكم العلمية وعناوين أبحاثكم المنشورة ليحتفظ مع الاعتزاز به في سجلاته"[2]

(میں مسرت کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ المجمع العلمی العراقی کی کمیٹی نے ۲۲ رجب ۱۴۰۹ھ، ۲۸ فروری ۱۹۸۹ء کو منعقد ہونے والے اپنے دسویں اجلاس میں آپ کے بلند علمی مقام اور ادب وثقافت کے

---

[1] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۴، ص ۱۶۸

[2] حیات ص ۳۲۳

میدان میں آپ کی کاوشوں کی قدردانی کرتے ہوئے اکیڈمی کا معاون ممبر منتخب کیا ہے۔

آنجناب کو اس انتخاب کی مبارکباد دیتے ہوئے، جو علمی و ثقافتی رابطے کو مضبوط کرے گا، امید کرتا ہوں کہ اکیڈمی کو اپنی علمی زندگی اور شائع شدہ تحقیقات کے ناموں سے مختصر معلومات فراہم فرمائیں گے، تاکہ اسے فخر کے ساتھ اکیڈمی کے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جائے۔)[1]

شیخ ابوغدہ تو مولانا کے شیفتہ و گرویدہ تھے، جب ۱۹۷۹ء میں ندوۃ العلماء کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے تو ندوہ کی انتظامیہ نے مولانا اعظمی کو بھی تشریف لانے اور شیخ کے ساتھ قیام فرمانے کی گزارش کی، جس کو مولانا نے قبول فرمایا، اور شیخ کے ساتھ طویل قیام فرمایا۔ مولانا نور عالم خلیل امینی کا بیان ہے کہ

"دونوں شہ مردوں کے قران السعدین اور اجتماعی قیام کی مدت ایسا لگتا تھا کہ علم و کمال کی بارش برس رہی ہو۔"

شیخ کے مولانا سے قوی ارتباط کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ مولانا اعظمی سے ملاقات کرنے ان کے شہر مئو تشریف لے گئے۔

بہرحال جنھوں نے مولانا کو دیکھا، اور وہ جو انھیں نہ دیکھ سکے، خواہ وہ اسی ملک کے ہوں یا ایشیا کے، سبھی مولانا اعظمی کے علم، وسعت مطالعہ، قوت حافظہ، ذہانت اور بے باک نقد کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اس باب میں مولانا کے بارے میں ان کے اکابر و اصاغر، اور معاصر اہل علم کی کچھ منتخب آرا پیش کی جارہی ہیں، تاکہ قاری کو مولانا کی مقبولیت، شہرت اور علم میں ان کے مقام بلند کا اندازہ ہو سکے۔

---

[1] دار العلوم اپریل ۱۹۹، ص ۴۵

دوسروں کی آراء سے کسی شخصیت کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ زبان خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے۔ ان آراء سے بہرحال کسی شخص کی مرجعیت کا اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے۔ اور اس طرح سے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا حبیب الرحمن اعظمی اپنے وقت کے ایسے مرجع تھے جن کی وسعت مطالعہ، اجتہاد فکر، تحقیقی نکتہ رسی اور اپنے انداز نظر سے خدمت دین کا اعتراف عرب و عجم سبھی کو تھا۔

شیخ احمد محمد شاکر | شارح مسند احمد بن حنبل مولانا اعظمی کی علمی جلالت و وجاہت سے کس قدر متاثر ہیں، اسکا اندازہ شکریہ کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے استدراکات کے ملنے پر مولانا اعظمی کو لکھا، اس خط کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

"حضرة الأخ العلامة الكبير المحقق الأستاذ حبيب الرحمن الأعظمي أما بعد جاء ني كتابكم الأول الممتع باستدراكاتكم فكلها نفيسة عالية، ولا أقول هذا مجاملة وأشكركم خالص الشكر على هذه العناية الجيدة، وأرجو أن تزيدوني من إشاراتكم وارشاداتكم خدمة للسنة النبوية المطهرة وأنتم كما رأيت من عملكم من أعظم العلماء بها في هذا العصر فالحمد لله على توفيقكم ثم أكرر الرجاء أن لا تحرموني من آرائكم النيرة وتحقيقاتكم النفيسة، حفظكم الله وبارك فيكم.

كتبه المخلص

احمد محمد شاكر"[1]

---

[1] المآثر جولائی تا ستمبر ۹۹۳ء، ص ۳۷-۳۸

(آپ کا فیض گرامی نامہ ملا، آپ کے تمام استدراکات نہایت عمدہ اور مفید ترین ہیں، میں یہ بات محض آپ کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں، اس عظیم توجہ فرمائی پر خلوص کے ساتھ آپ کا شکرگزار ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سنت نبویہ مطہرہ کی خدمت کے جذبے سے مجھے مزید مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازیں گے، اور جہاں تک میں نے آپ کے اس کام کو دیکھ کر سمجھا ہے، میرا خیال ہے کہ آپ اس زمانہ میں سنت نبویہ کے عظیم تر علماء میں سے ایک ہیں، والحمد للہ!)

<u>شیخ عبدالفتاح ابوغدہ</u> شیخ ابوغدہ کو مولانا اعظمی سے بے حد محبت و عقیدت تھی، وہ مولانا کے گرویدہ و مداح تھے، شیخ کو مولانا سے کس قدر محبت تھی، اسکا اندازہ پروفیسر اجتبا ندوی (جنہیں شیخ ابوغدہ کی رفاقت میں کئی برس تدریسی کام کرنے کا شرف حاصل ہے) کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ

"علماء ہند کے تذکرہ کے وقت حضرت محدث اعظمی کا ذکر ضرور آتا اور ان کا نام آتے ہی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، شیخ ابوغدہ مدظلہ حضرت محدث اعظمی کے بے حد مداح، فریفتہ اور گرویدہ و قدرداں ہیں۔"[1]

مولانا اعظمی کی تحقیق سے جب مسند حمیدی شائع ہوئی، تو شیخ نے مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق میں اس پر شاندار ریویو لکھا، جسکو مسند حمیدی کے تذکرہ میں نقل کیا جا چکا ہے، اسی طرح جب شیخ ابوغدہ کی تحقیق سے الرفع والتکمیل شائع ہوئی، اور جب مولانا نے اس پر چند استدراکات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے، تو شیخ نے انہیں بعد کے ایڈیشن میں شکریہ و ستائش کے الفاظ کے ساتھ شائع کیا۔ شیخ مولانا اعظمی کے فضل و کمال کے کس قدر معترف تھے، اس سلسلہ میں شیخ کی ہی رقم کردہ یہ تحریر ملاحظہ ہو

[1] ترجمان الاسلام جنوری تا مارچ ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۶

"العلامة المحدث البارع الفقيه الشيخ حبيب الرحمن الاعظمي صاحب التصانيف البديعة، والتحقيقات النادرة، العالم بالرجال والعلل وتعليقاته وتحقيقاته السنية على "سنن سعيد بن منصور" و "الزهد" لابن المبارك و "مسند الحميدي" و (استدراكاته) على الشيخ احمد شاكر في تعليقه على "مسند أحمد" ثم (تعليقاته الحافلة) على "مصنف عبد الرزاق" الذي يطبع الآن بعون الله، كلها تنطق بسمو قصده وسعة يديه في العلم الشريف "[1]

(علامہ محدث ماہر فقیہ شیخ حبیب الرحمن اعظمی، نادر اور انوکھی تعلیقات وتحقیقات کے مالک، فن رجال وعلل کے عالم ہیں، سنن سعید بن منصور، ابن مبارک کی کتاب الزہد، مسند حمیدی پر ان کی تعلیقات وتحقیقات، مسند احمد کی تعلیق وتحقیق میں شیخ احمد شاکر پر ان کے استدراکات، پھر زیر طبع مصنف عبدالرزاق پر جامع حواشی، علم وفضل میں ان کی بلندی اور اس متبرک علم میں ان کی دسترس کی شاہد ہیں۔)

شیخ زاہد الکوثری زاہد الکوثری محقق، محدث اور بلند پایہ عالم تھے۔ ان کی زندگی علم کے فروغ، دفاع حنفیت، اور حق گوئی کے لئے وقف تھی، اسی حق گوئی کی پاداش میں انہیں جلاوطنی کی سزا سے بھی دوچار ہونا پڑا، شیخ کی ولادت 'استنبول' ترکی میں ہوئی تھی، جلاوطنی کے بعد مصر کو اپنا مستقر بنایا۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے جب در بھنگہ کے ایک قلمی نسخہ سے قاسم بن قطلوبغا کے استدراکات کو نوٹ کر کے زاہد الکوثری کے پاس ارسال فرمایا، جس کی تفصیل 'مدینۃ العلم' کے تذکرہ میں ملاحظہ ہو، تو زاہد الکوثری نے

---

[1] فقہ اہل العراق وحدیثہم ص ۸۲

حاصل تھی، ان کے یہاں شریعت وطریقت کا حسین امتزاج دکھتا ہے شیخ الازہر کے عظیم منصب پر بھی فائز رہے مولانا اعظمی کے علم سے متعارف اور مداح تھے

حج کا موسم تھا، شیخ الازہر عبدالحلیم محمود اور عالم اسلامی سے بہت سے علماء حج وزیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ مصر، سعودیہ، ہندوپاک کے علماء کے ایک مجمع میں جس میں علامہ محمود حسنین مخلوف، علامہ اعظمی، علامہ سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی بھی موجود تھے، شیخ الازہر نے علماء کے اس مجمع میں حدیث شریف اور فن رجال میں مولانا اعظمی کے مقام بلند کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

"إني أشهد أنه إذا كان في العالم كله من يستحق أن يلقب بالمحدث الأعظم، فهذا هو"[1]

(میں شہادت دیتا ہوں کہ پوری دنیا میں محدث اعظم کے لقب کا اگر کوئی مستحق ہے تو یہ شخص ہے۔)

ڈھاکہ کے ایک جلسہ میں جس میں شیخ الازہر بھی موجود تھے، شیخ محمد حسین ذہبی وزیر اوقاف مصر نے تقریر کرتے ہوئے مولانا اعظمی کے بارے میں فرمایا

"أعتقد أنه ليس له مثيل في علم الحديث في كافة الهند"

(میرا خیال ہے کہ علم حدیث میں پورے ہندوستان میں ان کی کوئی نظیر نہیں۔)

شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم نے اس پر ٹوکتے ہوئے اضافہ فرمایا

"بل في الدنيا كلها فيما نعلم"[2]

(بلکہ ہمارے علم کے مطابق پوری دنیا میں ان کی کوئی مثال نہیں۔)

---

[1] البعث الاسلامی اپریل مئی ۱۹۹۳ء ص ۸۷، حیات ص ۵۷۱، الماثر جون تا ستمبر ۱۹۹۳ء ص ۳۴

[2] البعث الاسلامی ۱۹۹۳ء ص ۹۰

شیخ محمود محمد شاکر | آپ شیخ احمد شاکر کے چھوٹے بھائی ہیں، محقق، مورخ اور صاحب نظر عالم ہیں، انکو بھی مولانا اعظمی سے تعلق و مناسبت تھی، انکی شہادت صدق جدید لکھنؤ کے مراسلہ بعنوان "علماء مصر و علماء ہند - ایک سرسری تقابل" میں ملتی ہے۔

قاہرہ یونیورسٹی سے ایک ہندوستانی ندوی طالبعلم نے مراسلہ میں لکھا

"یہاں کے مشہور فاضل محمود شاکر صاحب مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی بڑی تعریف کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ بعض اعتبار سے انکے بھائی مشہور محدث احمد شاکر صاحب مرحوم سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔"[1]

شیخ ناصر الدین الالبانی | شیخ البانی مشہور محدث ہیں، تشدید و تردید میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود مولانا اعظمی کے علم و تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، صحیح الترغیب والترہیب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں

ومما زادني رغبة في الإقبال عليه أن محققه الفاضل الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي"[2]

(اس (کتاب) کی طرف میری توجہ اس لئے بھی بڑھ گئی کہ اس کے محقق فاضل شیخ حبیب الرحمن الاعظمی ہیں)

شیخ علوی بن عباس مالکی | شیخ مالکی نہایت متقی اور بلند پایہ عالم تھے، حرم شریف میں درس دیا کرتے تھے، ۱۹۶۵ء میں شیخ سے انکے گھر پر مولانا اعظمی کی پہلی ملاقات ہوئی، شیخ نے مولانا کا اکرام کیا اور اپنی بعض کتابیں ہدیہ کیں، ۱۹۷۱ء میں شیخ مالکی اور مولانا اعظمی کے مابین دوسری ملاقات ہوئی، مولانا اعظمی کا بیان ہے کہ شیخ نے ان کا اس مرتبہ زبردست اکرام کیا، ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور مصنف

---

[1] صدق جدید لکھنؤ ۱۰ جون ۱۹۶۰ء ج ۱۰ ش ۳۱ ص ۷

[2] صحیح الترغیب والترہیب ص ۹۵

عبدالرزاق کی طباعت کو مکمل کرانے کی ترغیب دی۔[1]

مولانا اقبال اعظمی لندن سے ایک خط مکتوبہ ۲ راکتوبر ۱۹۸۹ء میں تحریر فرماتے ہیں

"شیخ علوی مالکی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑے علماء جانتے ہیں، وہ، شیخ حسن مشاط اور شیخ ابراہیم کردی، کہنا چاہئے کہ حرم پاک کے بلند پایہ علماء، محدثین کی یہ آخری تین یادگار تھیں، ان تینوں کو حضرت مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی) مدظلہ کی معیت میں ہی دیکھنے کی اس ناچیز کو بھی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ شیخ علوی جو سید بھی تھے مولانا سے لپٹے ہوئے ہیں اور بلک بلک کر رو رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں

'میں یقین رکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی ہیں۔'"[2]

شیخ عبداللہ زمزمی مکی راہ سلوک کے سالک، عالم باعمل اور صاحب الرائے بزرگ تھے۔ اصلاً لاہور کے تھے، آپ کے والد ماجد مکہ آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ مولانا زمزمی کو مولانا اعظمی سے فریفتگی کی حد تک تعلق تھا، دونوں بزرگوں کی باہم کوئی ملاقات نہ تھی، محبت و عقیدت کا یہ رشتہ خط و کتابت سے شروع ہوا، مولانا اعظمی کی مولانا زمزمی سے پہلی ملاقات ۱۳۶۹ھ م ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ مولانا زمزمی کو مولانا اعظمی سے کس درجہ قلبی لگاؤ اور ان کے دل میں کس قدر مولانا کا احترام تھا، اس کا اندازہ مولانا زمزمی کے خطوط سے ہوتا ہے۔

مولانا زمزمی سنیچر ۲ ر رمضان ۱۳۶۹ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں

---

۱ حیات ص ۶۷۷

۲ المآثر جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء ص ۳۳

"صاحب الفضيلة سيدي الجليل مولانا حبيب الرحمن الأعظمي أيده الله تعالى آمين

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وصل كتابكم الكريم وفي شدة السرور وضعته على رأسي وعيني، لله الحمد والشكر وله الثناء الحسن، ووفقك وأعانك، إن يوماً يجتمع بك فيه لهو يوم الحياة الخالد وحبيها وعزة أيامها، إن يوماً أراك فيه لهو يوم السعادة والهناء"[1]

(فضیلت مآب، بزرگوار مولانا حبیب الرحمن اعظمی اللہ آپ کی تائید ونصرت فرمائے

سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ موصول ہوا، جوش مسرت میں سر آنکھوں پر اس مکتوب کو رکھا، اللہ کی حمد وثنا اور اسکا شکر واحسان ہے، اللہ آپکو توفیق دے اور مدد فرمائے، جس روز ہم ایک دوسرے سے ملیں گے وہ دن سب سے یادگار اور شاندار دن ہوگا، جس دن ہم آپ کو دیکھیں گے وہ سعید ومبارک دن ہوگا۔)

مولانا رمزی نے جب مولانا اعظمی کی کتاب 'عیان الحجاج' دیکھی، تو اس کے مطالعہ کے بعد مولانا اعظمی کے نام خط میں 'عیان الحجاج' پر شیخ رمزی نے اپنے یہ تاثرات لکھے

"يا صاحب الفضيلة قيل في كشف الظنون عن كتاب الفوائد لابن رجب إنها من عجائب الدهر، وإن كتابكم أعجب من عجائب الدهر في بابه وأسلوبه ومحتوياته،

[1] حیات ص ۵۸۱

واتشد الكم فيه بأشرف المخلوقات حمله من أعجب العجائب إلهاماً من الله سبحانه وتعالى

هذا أول كتاب من نوعه، فجزاكم الله عن الأمة الإسلامية خير الجزاء، وهو من الفنون التي يميل إليها قلبي ودائماً أبحث فيها فكأنه صنف لي، لقد اهتز قلبي له وفرح فؤادي به، وانشرح صدري منه، فجزاكم الله عني خير الجزاء، وأثابكم على عملكم وبارك لي فيكم وفي علومكم، وكثيراً ما كنت أرجع كتب الطبقات لهذه العجيبة فأغناني الله بكتابكم هذا، بارك الله في تصنيفكم، وبارك الله في حياتكم وبارك الله في أعمالكم "[1]

(فضیلت مآب! کشف الظنون میں ابن رجب کی کتاب الفوائد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ عجائبات زمانہ میں سے، آپ کی یہ کتاب بھی موضوع، اسلوب اور مضامین کے اعتبار سے عجائبات زمانہ میں سے ہے، الہامی طور پر اشرف المخلوقات صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کتاب کی ابتداء نے اس کو عجائبات میں سے بھی ایک عجوبہ بنادیا ہے۔

یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اللہ آپ کو امت مسلمہ کی جانب سے بہترین جزاء دے، اور یہ ان فنون سے متعلق ہے جنکی طرف میرا قلبی میلان ہے، ہمیشہ (کچھ نہ کچھ) کمیں ڈھونڈتا ہی رہتا ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے اسے میرے لئے تصنیف کیا ہے، دل اس سے خوش اور طبیعت منشرح ہوئی، اللہ آپکو بہترین جزاء سے نوازے، آپ کے اس

[1] حیات ص ۵۸۴

جیسے آپ نے اسے میرے ہی لئے تصنیف کیا ہے، دل اس سے خوش اور
طبیعت منشرح ہوگئی، خدا آپکو بہترین جزاء سے نوازے، آپ کے اس
کام کا علم ہوا، عمر دراز فرمائے، اور آپکے علوم سے ہمیں نفع پہنچائے۔
اس مقصد کے لئے اکثر مجھے طبقات کی کتابوں کی طرف مراجعت کرنی
پڑتی تھی، لیکن اب آپکی اس کتاب نے مجھے ان سے بے نیاز کردیا ہے۔
اللہ آپ کی تصانیف عمر اور آپکے کاموں میں برکت نصیب فرمائے۔)

ڈاکٹر عبدالسعید نے بہ خلیل صاحب مئوی کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ

"ایک بار میں مولانا رمزی صاحبؒ کے پاس ملاقات کے لئے گیا،
میرے ہاتھ میں مولانا (حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی) کی کتاب رہبر
حج تھی، انہوں نے پوچھا کون سی کتاب ہے، میں نے کہا مولانا اعظمی
کی رہبر حج ہے، کتاب لے کر کھڑے ہوگئے اور سر پر رکھ لیا اور کئی بار
فرمایا کہ مولانا تو رہبر عالم ہیں، مولانا تو رہبر عالم ہیں۔"[1]

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حدیث وفقہ میں آپ کی شخصیت محتاج
تعارف نہیں، عالم عرب کیا پوری دنیا میں آپ کے علم اور زہد وتقویٰ کا شہرہ تھا، مولانا
اعظمی کے علم کے معترف وقدر دان تھے، مولانا افضال الحق قاسمی علامہ ابن باز اور
مولانا اعظمی کی ملاقات کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"حضرت مولانا ایک مرتبہ حج کے لئے تشریف لے گئے، مولانا اسعد
صاحب بھی وہاں موجود تھے انہوں نے شیخ عرب علامہ ابن باز کی
زیارت کا وقت مانگا اور وہ مقرر ہوگیا، جانے لگے تو حضرت مولانا کے
پاس آئے اور علامہ کے پاس چلنے کے لئے کہا، حضرت مولانا تیار ہوگئے

---

[1] الاکسائی شمارہ [illegible]

وہاں پہونچے تو حسب معمول ہر شخص نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا، یہ علامہ ابن باز نابینا محدث ہیں، ان کے یہاں ہر شخص کو اپنا نام اور مختصر تعارف کرانا ہوتا ہے، جب کئی آدمی اپنا اپنا تعارف کرا چکے تو آخری نمبر حضرت مولانا کا تھا، مولانا نے فرمایا "انا حبیب الرحمن الاعظمی من الهند" تو شیخ عربیا اٹھ کر کھڑے ہو گئے حضرت مولانا سے معانقہ فرمایا اور معذرت کی کہ آپ نے یہاں آکر مجھے شرمندہ کیا، مجھے معلوم ہوتا تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، پھر اپنی مسند پر مولانا کو بٹھا کر انہوں نے سکون پایا۔"[1]

شیخ سید یوسف ہاشم الرفاعی کویت کے جید عالم دین اور سابق وزیر مواصلات ہیں۔ مولانا اعظمی کی مقبول ترین کتاب "الالبانی شذوذہ واخطاؤہ" کے مقدمہ میں صفحہ ۲ پر مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"إنه إمام كبير، ومحقق جليل، ومحدث نبيل شهير، وهو العلامة الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الهندي خادم السنة النبوية بحق وعلم وأدب وورع وتقوى الله سبحانه، وهو يقوم بتحقيق كتب السنة النبوية وشرحها، دون جعجعة وطنطنة، أو دعايات وادعاءات فارغة جوفاء"[2]

(وہ امام کبیر، محقق جلیل اور محدث نبیل وشہیر علامہ حبیب الرحمن الاعظمی ہندی ہیں، علم وادب اور زہد وتقویٰ کے ساتھ حدیث شریف کی خدمت جیسا کہ اس کا حق ہے، انجام دے رہے ہیں، کتب حدیث کی تحقیق

[1] الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ص ۲۹۲ ۲۹۳

[2] حیات ص ۵۹۳

سے لگے رہتے ہیں۔)

اصحاب علم و فضل کے نزدیک مولانا اعظمی کا علمی مقام کیا ہے؟ شیخ سید یوسف رفاعی کا تذکرہ کر چکے، وہ اسی انداز میں اسی مقدمہ میں کہتے ہیں کہ

"فإن اسم الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي مقرون عند كل عارفيه في المشرق والمغرب بالفضل والتقدير والإجلال والمحبة، والخضوع لعلمه ومعرفته بالسنة النبوية، وكبير خدمته لها وعظيم أدبه مع العلماء والأئمة الأجلاء"[1]

(شیخ حبیب الرحمن الاعظمی کا نام مشرق و مغرب میں ان کے جاننے والوں کے نزدیک بہت ہی اہمیت و عظمت و محبت و تعظیم کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ان کے علم و معرفت اور اس سلسلہ میں ان کی عظیم خدمات اور علماء و جلیل القدر ائمہ کے ساتھ ان کے غایت ادب کے سبب، ان کے سامنے گردنیں جھک جاتی ہیں۔)

شیخ شعیب الارناؤوط نامور محقق و محدث ہیں، حدیث کی بہت سی کتابیں آپ کی تحقیق و تعلیق سے مزین ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں علی بن بلبان کی "الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" بھی ہے۔

بخاری کی "فیہ نظر" کی اصطلاح کی بحث اور اس سلسلہ میں مولانا اعظمی کی رائے متعدد نکات کے ذیل میں پیش کی گئی ہے، اصطلاح بخاری فیہ نظر کے بارے میں مولانا اعظمی کی تحقیق اور رائے کی داد دیتے ہوئے شیخ شعیب ارناؤوط نے "الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" میں لکھا

"قلت وهذه فائدة نفيسة تنبئ عن إمامة هذا الشيخ حفظه

[1] الاعتصام شذرہ ۱۰، شمارہ ۸۱

الله ونفع به علم الجرح والتعديل، ودراية واسعة بقضاياه" ۱؎

(میں کہتا ہوں کہ یہ ایک مفید اور عمدہ بحث ہے، اس بحث سے علم جرح و تعدیل میں شیخ کی امامت اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کی وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔)

شیخ عبد الحئی الفہری فاس (مراکش) کی مشہور لائبریری خزانہ جامعۃ القرویین کے محافظ دیگر اہل علم و فضل مخلص ہیں، مصنف عبد الرزاق مولانا اعظمی کی تحقیق سے شائع ہو کر ان کے پاس پہونچی، تو انہوں نے ۳۰ رجولائی ۲ے۱۹ء کو مکتب اسلامی بیروت کے پتہ پر ایک خط لکھا، جسکو بیروت والوں نے مولانا اعظمی کے پاس بھیج دیا، اس خط کا ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"إن الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي هو أحد الناس بتحقيق كتب السنة والتعليق عليها، فهو أحد أفراد هذا العصر الذي هيأه وهياه الله تعالى لتجديد هذا الدين تصديقاً لقول النبي عليه السلام إن الله يبعث على رأس كل مائة من يجدد لهذه الأمة أمر دينها" ۲؎

(شیخ حبیب الرحمن اعظمی کتب حدیث کی تحقیق و تعلیق کے سب سے زیادہ حقدار ہیں، اس زمانہ کے وہ ایک ایسے فرد ہیں جنہوں نے خود کو آمادہ کیا، اور اس دین کی تجدید کے لئے اللہ نے بھی انکو تیار کیا، نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کا مصداق بنا کر کہ اللہ تعالیٰ ہر سو سال پر ایک ایسا شخص پیدا کرے گا جو اس امت کے لئے دینی معاملات کی تجدید کرے گا۔)

۱؎ الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان ۴ ۲۹۲-۲۹۳

۲؎ حیات ص ۵۹۳

ڈاکٹر محمود طحان | صاحب نظر عالم ہیں، علوم حدیث میں ان کی معلومات وسیع ہیں، اصول التخریج ودراسۃ الاسانید ان کی مشہور کتاب ہے، مولانا اعظمی کے علم پر ان کو جس درجہ اعتماد اور بھروسہ ہے ان کی اس تحریر سے اسکا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"هذا وإن التعليقات التي يضعها بعض العلماء الذين لهم عناية بالحديث وعلومه في هذا العصر أثناء تحقيقهم لبعض الكتب المشتملة على أحاديث غير معروفة المخرج، يمكن الاستفادة منها لمعرفة مخارج تلك الأحاديث "

ومن هؤلاء العلماء على سبيل المثال، الشيخ أحمد شاكر رحمه الله، وأخوه الشيخ محمود شاكر، والشيخ عبد الفتاح أبو غدة، والشيخ حبيب الرحمن الأعظمي، والشيخ محمد فؤاد عبد الباقي رحمه الله وغيرهم جزى الله تعالى الكل أفضل الجزاء وأجزل مثوبتهم "[1]

(اس زمانہ کے بعض وہ علماء جن کی حدیث وعلوم حدیث پر نظر اور توجہ ہے، غیر معروف المخرج احادیث پر مشتمل کتابوں کی تحقیق کے دوران جو تعلیقات لکھتے ہیں، احادیث کے مخارج جاننے میں ان تعلیقات سے استفادہ کیا جائے۔

ان علماء میں مثال کے طور پر شیخ احمد شاکر، ان کے بھائی شیخ محمود محمد شاکر، شیخ عبد الفتاح ابوغدہ، شیخ حبیب الرحمن الاعظمی، شیخ محمد فواد عبد الباقی رحمۃ اللہ علیہم ہیں، ان سبھی حضرات کو اللہ تعالیٰ بہترین جزاء اور اجر جمیل عطا فرمائے۔)

---

[1] اصول التخریج ودراسۃ الاسانید ص ۱۴۵ ڈاکٹر محمود طحان

شیخ محمد عوامہ، مدینہ منورہ | شیخ محمد عوامہ مولانا اعظمی کے انتقال پر اپنے مکتوب میں مکرم حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے نام تعزیتی خط میں تحریر فرماتے ہیں

"آپ تنہا اس مصیبت میں گرفتار نہیں ہیں، بلکہ یہ تمام امت مسلمہ کے لیے بڑی مصیبت ہے، اعلی اللہ مقامہ [illegible] کی حیات میں تو ہمیں حلقوں میں کوئی خلا محسوس ہی نہیں ہوتا تھا، لیکن آپ کے انتقال کے بعد اب ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ اس کا پر ہونا موجودہ حالات میں ممکن نظر نہیں آتا۔"

خیر رمضان یوسف | عربی مآخذ و مراجع میں [illegible] علام [illegible] کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ خیر الدین زرکلی نے اس کتاب میں مشاہیر زمانہ کے تذکرے اور حالات کو مختصر ترین مگر جامع انداز میں مرتب فرمایا ہے۔ 'الاعلام' کا تتمہ باکمال خیر رمضان یوسف نے لکھا ہے۔ خیر رمضان یوسف نے تتمہ میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی کا اس طرح تعارف کرایا

"حبيب الرحمن الأعظمي العالم البحاثة المدقق، أحد أبرز علماء الحديث في شبه القارة الهندية وهو مؤسس المعهد العالي للعلوم الدينية في مئو ورئيس هيئة التدريس بجامعة مفتاح العلوم في المدينة نفسها التابعة لولاية اوتار براديش

وقد درس العلوم العربية والإسلامية على أيدي أساتذة أجلاء، وقضى شطر عمره في التدريس والتأليف، كما كان من الناشطين في حركة الاستقلال، ومثّل بلدته ما بين عام

۱؎ تتمہ الاعلام ۱/۱۳۰ ص ۲۹۲

۱۹۵۲-۱۹۵۷ في المجلس النيابي المحلي للولاية ولجهوده البارزة في التعليم والتأليف في مجال اللغة العربية منحته الحكومة الهندية جائزة رئيس الجمهورية الهندية."[1]

(حبیب الرحمن الاعظمی عالم، اسکالر، محقق، مدقق، اور برصغیر ہند کے ممتاز محدثین میں سے ایک ہیں۔ مئو میں ایک دینی ادارہ المعہد العالی کے بانی اور اتر پردیش کے اسی شہر میں قائم جامعہ مفتاح العلوم کے صدر مدرس تھے۔ جلیل القدر اساتذہ سے عربی اور اسلامی علوم حاصل کیے اور اپنی عمر کا (ایک اچھا خاصہ) حصہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں گزارا۔ اسی طرح تحریک آزادی میں بھی سرگرم تھے۔ اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک صوبائی اسمبلی میں اپنے شہر کی نمائندگی کی۔ عربی زبان وادب میں ان کی نمایاں تعلیمی اور تصنیفی کوششوں اور خدمات کے لئے حکومت ہند نے انہیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا۔)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی: رحمۃ اللہ علیہ تھانوی علم وورع اور سلوک وتصوف میں آپ کو جو مقام عالی حاصل ہوا، اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی، تصوف وسلوک میں آپکو امامت کا درجہ حاصل ہے۔ حضرت تھانوی سے مولانا اعظمی کا دیرینہ تعلق تھا، مولانا کے والد ماجد مولانا محمد صابر صاحب حضرت تھانوی سے بیعت تھے، مولانا خود بھی طالبعلمی کے زمانہ میں ہی بیعت ہو گئے تھے۔ حضرت تھانوی مولانا کے علم وفقہ پر اعتماد تھا، فقہی مسئلہ میں آپکی طرف رجوع کرنے کو کہا کرتے تھے۔

جب پروفیسر عبد الحی کی کتاب پر مولانا اعظمی کی تنقید 'التنقید السدید علی

[1] تتمۃ الاعلام ص ۱۲۵ محمد رمضان یوسف

التنقید السدید کے نام سے شائع ہوئی تو مولانا اعظمی کے پاس ۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ کو مولانا تھانوی نے ایک خط لکھا کہ

"احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ نے اس تنقیدی مضمون کو غایت شوق سے حرفاً حرفاً دیکھا اور اس حدیث کا مصداق پایا قال رسول اللہ ﷺ یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین (مشکوۃ عن البیهقی)

ماشاء اللہ قوت استدلال، حسن ادا، دفع شبہات، میں کلام غرض ہر پہلو سے بے تکلف اس شعر کا نمونہ ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"

بارک اللہ فی الافادات لمصنف والافاضاته

۲۴ صفر ۱۳۴۹ھ تھانہ بھون

وقاہ اللہ تعالیٰ عن الفتن"[1]

مولانا تھانوی نصرۃ الحدیث پر اپنا یہ تاثر پیش کرتے ہیں

"میں اپنے ضعف اور عذر سے خود شرمندہ ہوں اور ہدیہ بسر و چشم قبول کرتا ہوں اور دعاء موافقت کرتا ہوں، جس جس جگہ سے رسالہ نظر پڑا بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسا جامع اور محقق نہ لکھ سکتا۔"[2]

مولانا عبد الغفار عراقی مئوی مولانا عبد الغفار صاحب کا تذکرہ سوانح میں پیش کیا جا چکا ہے، انہوں نے اپنے عزیز شاگرد کو جو سند عطا کی تھی وہ قابل ملاحظہ

---

۱ التنقید السدید ص ۴۸ (انجم ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ)

۲ نصرۃ الحدیث (تاثر و تبصرہ)

ہے، مولانا عراقی سند کیا دے رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل نکال کر دے رہے ہوں

"إن العزيز الحفي المجتني من أزهار البساتين، بستان العلوم والفنون والراغب إليه بالجنان، هو مع حداثة سنه وغضاضة غصنه قد هز الدوحة المورقة، والشجرة المثمرة، حتى فاق في العلوم والفنون على الأقران بانعام جيبه منها والأردان، حبي وفلذة كبدي، أعني المولوي حبيب الرحمن بن المولوي محمد صابر المئوي الأعظمي"[1]

(خرمن علم وفن سے خوشہ چینی کرنے والے اور دل سے اس کی طرف راغب رہنے والے عزیز مکرم نے اپنی کم عمری اور صغر سنی کے باوجود علم کے شاداب و پھلدار درخت کو حرکت دی، یہاں تک کہ علم وفن میں سب ہمسروں پر فائق و برتر ہوگئے، اور اپنے جیب و دامن کو اس سے اچھی طرح بھرلیا، میرا محبوب اور میرے جگر کا ٹکڑا، مولوی حبیب الرحمن بن مولوی محمد صابر مئوی اعظمی۔)

علامہ انور شاہ کشمیری | جب مولانا اعظمی 'ای وی رجال الطحاوی' کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اس کا کچھ حصہ علامہ کشمیری کے پاس نظر ثانی کے لئے بھیجا، لیکن اسی دوران علامہ سخت بیمار پڑ گئے، اور ڈابھیل سے دیوبند تشریف لے آئے، جب مولانا اعظمی کو علامہ کی علالت کی خبر ملی تو عیادت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، بعد نماز عصر شاہ صاحب کے پاس حاضری ہوئی، چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے، فرمایا کہاں سے

[1] حیات ص ۱۴-۱۵

آنا ہوا، مولانا نے فرمایا، اعظم گڑھ سے، شاہ صاحب نے فرمایا، مولانا حبیب الرحمن اعظم گڑھی کون ہیں، جنہوں نے طحاوی کے رجال پر کام کیا ہے، مولانا نے فرمایا یہ خادم حاضر ہے، یہ سننا تھا کہ شاہ صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے، کن کن کتابوں سے آپ نے مدد لیا ہے، فلاں کتاب کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوئی۔ غرض کہ بہت تعجب کے لہجہ میں اس طرح کے مختلف سوالات کرتے رہے، اس کے بعد فرمایا کہ پورا مسودہ لے کر ڈابھیل تشریف لایئے، ان شاء اللہ ضرور نظر ثانی کروں گا۔ لیکن افسوس کہ چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ آپ کی وفات ہوگئی۔[1]

علامہ شبیر احمد عثمانی علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا اعظمی کے استاذ ہیں، استاذ و شاگرد میں باہم علمی تبادلہ خیال ہوتا رہتا تھا، علامہ عثمانی علمی و تحقیقی امور میں مولانا اعظمی کی صائب رائے کے معترف تھے، مولانا اعظمی کے نام علامہ عثمانی کے خطوط اس کے شاہد ہیں۔ ۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۲ھ کو دیوبند سے مولانا اعظمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

''آپ کے دو خط اور مضمون پہونچا، میں بے حد عدیم الفرصت ہوں، اس لئے مضمون اب تک پورا نہیں دیکھ سکا، جس قدر دیکھا ہے میرے نزدیک صحیح ہے، مکمل مضمون مطالعہ کے بعد واپس کروں گا''[2]

۱۱ رمضان سنہ ۱۳۴۵ھ کے ایک مکتوب میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں

''آپ نے جو دو مضمون لکھے ہیں خدا تعالیٰ جزائے خیر دے اور لوگوں کو ان سے متمتع کرے، کیا ان کو رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کا خیال ہے، یا کسی اخبار میں بھیجئے گا، الحاوی کے لئے کچھ صفحے میں ضرور محفوظ رکھئے گا''[3]

---

[1] ترجمان الاسلام ۱۱-۱۲، ص ۲۰۶

[2] مآثر مئی تا جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۳

[3] ایضاً ص ۸۶

مولانا اعظمی کے نام ۲؍محرم ۱۳۹۱ھ کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں

"دل آویز یادیں" اور "نصرۃ الحدیث" حصہ اول سے محظوظ ہوا، اللہ تعالیٰ
خدمت دین کی مزید توفیق بخشے۔"[1]

جب الحاوی کی تصنیف سے مولانا اعظمی فارغ ہوگئے، تو علامہ عثمانی نے انہیں مبارکباد کا ایک خط لکھا، وہ خط ملاحظہ ہو

"از بندہ شبیر احمد عثمانی عفی اللہ عنہ

بخدمت برادر عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون آنکہ بھی واپس آیا ہوں، اس لئے خط کے
جواب میں تاخیر ہوئی۔ بشغل تاتار تمام و کمال اور معانی الآثار کے
مختصر حصہ کے رجال قلمبند ہوجانے کی آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں،
بیحد خوشی ہوئی حق تعالیٰ آپ کو ہمت اور ارادوں میں برکت دے اور
خدمت سنت کی مزید توفیق بخشے۔ ان شاء اللہ شعبان میں آنے کی پوری
کوشش کروں گا۔ قطعی بات رجب کے آخر میں لکھ سکوں گا۔

از ڈابھیل ضلع سورت

۹ ربیع الثانی ۱۳۶۸ھ"[2]

تین طلاق کے مسئلہ پر علامہ کو مولانا اعظمی کی کتاب "الاعلام المرفوعہ" کے مطالعہ کا مشورہ دیا کرتے تھے، علامہ کے الفاظ "الاعلام المرفوعہ" کے ذیل میں نقل بھی کئے جاچکے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی | مولانا لدھیانوی عالم دین، عظیم رہنما اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ آپ علامہ انور شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں تھے، مولانا اعظمی

[1] المآثر مئی تا جولائی ۱۹۹۹ء ص ۹۲

[2] ایضاً ص ۸۷

کو ۱۶ر جنوری ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں

" آپ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین ہیں، میرے دل میں آپ کے تقویٰ، علم و پرہیزگاری کی وجہ سے بہت زیادہ عزت ہے "[1]

ایک دوسرے مکتوب میں رقمطراز ہیں

" حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے آپ سے یک تعلق ہے کیونکہ آپ ان کے علم کے وارث ہیں، اس لئے مجبور ہوں کہ آپ سے اپنا تعلق رکھوں۔"[2]

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی شیخ الاسلام مولانا مدنی اور مولانا اعظمی کے تعلقات باہم بہت مضبوط و مستحکم تھے، مولانا اعظمی شیخ الاسلام پر فریفتہ اور شیخ الاسلام مولانا اعظمی کے علم کے گرویدہ تھے، ان دونوں حضرات میں کافی حد تک فکری ونظریاتی ہم آہنگی تھی، غالباً یہی مناسبت تھی کہ سیاست میں مولانا مدنی نے جو مسلک اختیار کیا تھا، مولانا اعظمی نے بھی اسی کو اپنایا، اور آخر تک اس پر قائم رہے، مولانا مدنی کو مولانا اعظمی کے علم وتفقہ پر ناقابل بیان حد تک اعتماد تھا۔ مولانا مدنی اہم مذہبی وسیاسی امور میں مولانا اعظمی کے مشورہ اور رائے کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے، ۱۰ر محرم ۷۲ھ کے ایک مکتوب میں مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں

"محترم المقام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ باعث عزت افزائی ہوا، یاد فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں،

---

[1] المآثر ج ۶ ش ۳ ص ۹۲

[2] ایضاً

بوقت تشریف آوری مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند سب کے سامنے اس مقصد کا اظہار فرمائیں جو طریقہ اس مقصد کی کامیابی کے واسطے مناسب ہوگا وہ سب حضرات کی موجودگی میں طے ہوجائے گا، دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام[1]

مولانا مدنی نے جب مولانا اعظمی کی تصنیف "رکعات تراویح" دیکھی تو مولانا کو اس انداز میں داد دی

"مدعیان حدیث کی کندم نمائی اور جو فروشی کی وجہ سے بہت سے اشخاص اس غلطی میں مبتلا تھے کہ "۸ رکعات تراویح" کا ثبوت شرعی موجود ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی زید مجدہم کی اس حقیقت نمائی نے جو موصوف نے اس رسالہ میں فرمائی ہے، باطل کے پردوں کی دھجیاں اڑا دیں اور کالشمس فی رابعۃ النہار ظاہر کر دیا کہ مدعیان حدیث کے دعاوی باطلہ ہرگز قابل التفات نہیں ہیں، میں نے رسالہ مذکورہ کا ابتداء سے اخیر تک مطالعہ کیا ہے۔ میں حضرت مؤلف ممدوح کی تحقیقات انیقہ اور دلائل قویہ پر حضرت کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے ان مدعیوں کے جو شبہات ترویہ پر صواعق محرقہ برسا کر نیست و نابود کر دیا ہے، جزاہ اللہ احسن الجزاء فی الدارین"[2]

مولانا یوسف بنوری علامہ انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں تھے، تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر کراچی منتقل ہوگئے تھے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۰ء کو مولانا اعظمی صاحب نے

---

[1] المآثر مئی تا جون ۲۰۰۰ء ص ۸۷

[2] حیات ص ۲۸۰-۲۸۱

مولانا اعظمی کے پاس ایک خط میں لکھا

"غائبانہ آپ کا ذکر خیر جن تعریفی الفاظ کے ساتھ فرمایا کرتے تھے ہم لوگ سن کر حیران رہ جاتے، وہ (مولانا نوری) آپ کو اپنے وقت کا عظیم محدث فرمایا کرتے تھے"۔[1]

مولانا ابوالوفاء افغانی تحقیق اور نادر کتابیں شائع کرنے والے ادارہ لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کے بانی مولانا ابوالوفاء افغانی مولانا اعظمی سے غایت درجہ مداح تھے، کتاب الزہد والرقائق کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

"وقد اطلعت على كتاب الزهد للإمام ابن المبارك رحمه الله، الذي رتب أصوله وصححها وعلق عليه العلامة الأديب الحبيب مولانا الشيخ حبيب الرحمن الأعظمي الذي ناصر السنة ومد فيوضه فوجدته ماهراً لعلوم حاوياً بها فهماً لرواياته، قل له نظير في علماء زماننا"[2]

(امام ابن مبارک کی کتاب الزہد میں نے دیکھی جس کے اصول کی ترتیب، تصحیح اور تعلیق علامہ ادیب حبیب مولانا شیخ حبیب الرحمن الاعظمی نے کی ہے جو حدیث کی نصرت میں مسلسل لگے رہتے ہیں، جن کا فیضان عام ہے، میں نے انہیں علوم کا ماہر اور ان پر پوری طرح حاوی، اور روایت کا فہم پایا، ہمارے زمانے کے علماء میں ان کی نظیر کم ملے گی۔)

مولانا عبدالشکور فاروقی مولانا فاروقی اور مولانا اعظمی یہ دونوں اہل علم باطل کے لئے شمشیر برہنہ تھے، ان دونوں حضرات نے رد شیعیت، رد غیر مقلدیت وغیرہ

---

[1] المآثر ج ۲ ش ۳ ص ۹

[2] کتاب الزہد والرقائق ص ۶۴

بریلویت میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، دونوں بزرگوں نے یک ساتھ ل ر تحریری وتقریری مناظرے کئے، مجلہ المآثر نے مولانا عظمی کے نام مولانا عبدالشکور صاحب کے مکاتیب شائع کئے ہیں، ان خطوط سے ن حضرات کے خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔

۱۹ر جمادی الاولیٰ ۵۲ھ کے ایک خط میں مولانا عبدالشکور صاحب لکھتے ہیں

"معاف کرنے کے متعلق لکھ کر آپ مجھے شرمندہ کیوں کرتے ہیں، میں ایسا کب ہوسکتا ہوں کہ آپ سے ناراض ہوں اور آپ اس ناراضگی کو کچھ اہمیت دیں۔"[1]

۲۵ر رمضان ۱۳۵۲ھ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"احق دالفریقین کا جواب آپ نے بھیجنے کو لکھا ہے اگر جلد بھیجئے تو بہتر ہے آپ نے اپنے آنے کا ارادہ بھی لکھا ہے، اگر ایسا ہو تو زیادہ مناسب ہے چند ضروری امور میں آپ سے مشورہ بھی کرنا ہے۔"[2]

علامہ سید سلیمان ندوی: علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عظمی میں گہرے روابط تھے، مولانا عظمی سید صاحب کا بہت احترام کرتے تھے، اور سید صاحب مولانا کے علم سے حد درجہ متاثر تھے، علم وتحقیق میں اگر کوئی الجھن پیش آجاتی تو گرہ کشائی کے لئے مولانا عظمی کو یاد فرماتے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر مجلہ معارف کے مطابق

"حضرت سید صاحب ان پر (مولانا عظمی پر) بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے ان کے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں رد وبدل بھی فرماتے۔"[3]

---

[1] المآثر اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۸۴
[2] ایضاً ص ۸۵
[3] معارف اپریل ۱۹۹۲ء، ص ۳۱

سید صاحب پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہاں سے مفتی ظفیر الدین صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں

''ہندوستان کے ان دوستوں میں سے جن سے جیتے جی چھوٹ جانے کا افسوس ہے، ایک مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں، اور دوسرے آپ کے استاد مکرم مولانا حبیب الرحمن (اعظمی) ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے ہندوستان کے مسلمانوں کو مستفید فرمائے۔''[1]

علمی حلقہ میں سید صاحب کے جن حضرات سے گہرے روابط تھے شاہ معین الدین صاحب ندوی 'حیات سلیمان' میں انکا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''علمی دائرے میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوبکر شیث جونپوری، مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا ابوالکلام سے زیادہ تعلقات تھے۔''[2]

پھر آگے چل کر صفحہ ۶۳۸ پر شاہ معین الدین ندوی مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

''مولانا حبیب الرحمن اعظمی اگرچہ سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن حدیث وفقہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اسی لئے سید صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور فقہی مسائل میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔''[3]

مولانا مناظر احسن گیلانی | مولانا اعظمی اور مولانا گیلانی کے درمیان ملاقات کی نوبت تو کبھی نہ آسکی، لیکن دونوں صاحب نظر عالم ایک دوسرے کے فضل وکمال کے

---

[1] مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے ص ۵۵ مفتی محمد ظفیر الدین

[2] حیات سلیمان ص ۶۳۷ شاہ معین الدین ندوی

[3] ایضاً ص ۶۳۸

معترف تھے۔ (حیات ص ۵۴۹) جب مولانا گیلانی نے مولانا اعظمی کی نصرۃ
الحدیث دیکھی تو مولانا کے پاس مندرجہ ذیل خط ارسال فرمایا

''میں نے آپ کی کتاب نصرۃ الحدیث اول سے آخر تک پڑھی، ماشاء
اللہ آپ نے کافی محنت اور مطالعہ فرمایا ہے۔ نئی چیزیں اس سلسلہ میں
آپ نے پیش کی ہیں، خدا آپکو جزائے خیر دے اس موضوع پر
خاکسار نے بھی کچھ لکھا ہے اس لئے آپ کی محنت اور تلاش کی داد
جیسا کہ چاہئے میں ہی دے سکتا ہوں۔ اگر حکم ہو تو آپ کی کتاب پر
مفصل ریویو لکھنا اپنی سعادت خیال کروں گا آپ جیسے دین کے
مخلص خدام کا سرمایہ عزو شرف فی الدنیا والآخرۃ ہے۔''[1]

مولانا عبد الماجد دریابادی | مولانا اعظمی نے احادیث کی تحقیق و تدوین میں جو
جدید طرز و اسلوب اختیار کیا تھا، مولانا عبد الماجد دریابادی اس سے بہت متاثر تھے
تحریر فرماتے ہیں

''علمی تحقیق و تدقیق اب تک مستشرقین ہی کا حصہ سمجھی جاتی رہی ہے۔
مولانا اعظمی سلمہ اللہ نے عین اسی رنگ میں ڈوب کر ہندوستان کا نام
سارے عالم میں بلند کر دیا۔''[2]

کتاب الزہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''کتاب اس قابل ہے کہ یورپ اور امریکہ جائے اور وہاں کے
ماہرین اسلامیات دیکھیں کہ ہندوستان کے ایک قصبہ میں بیٹھ کر ایک
گوشہ نشین نے وہ کام کر دیا کہ جو مستشرقین اپنے لامحدود ذرائع کے

---

[1] حیات ص ۵۴۹

[2] صدق جدید ۶، مارچ ۱۹۶۳ء

بعد ہی انجام دے پاتے ہیں۔"[۱]

مسند حمیدی کی جلد دوم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اس نایاب مسند کا پتہ لگانا بجائے خود ایک کارنامہ تھا چہ جائیکہ اس کی پوری ترتیب و تہذیب، تصحیح و مقابلہ تحشیہ اور متعدد فہرستوں اور شاندار دیباچہ وغیرہ کا اضافہ، یہ سعادت و کرامت ایک ہندوستانی محقق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے حصہ میں آئی۔ جس پر انہیں علمی دنیا کی طرف سے جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔"[۲]

۲؍اگست ۱۹۶۸ء کے صدق جدید میں مولانا دریابادی مولانا اعظمی کی شان میں لکھتے ہیں

"ہندوستان کے خادمان حدیث اور ماہرین علم حدیث کی اگر مختصر ترین فہرست تیار کی جائے تو اس میں چوٹی کا نام مولانا حبیب الرحمٰن (مئو۔ ضلع اعظم گڈھ) کا ہوگا۔"[۳]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مولانا اکبرآبادی مولانا اعظمی کے گرویدہ تھے، علمی و تحقیقی امور میں اکثر و بیشتر آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ۲۸/۸/۵۸ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"صدیق اکبر کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پہونچ جائے گا، آپ براہ شفقت و بزرگانہ توجہ سے اس پر نظر ثانی فرما کر جو چیزیں قابل اصلاح نظر آئیں ان سے مجھ کو مطلع فرمایئے۔ میں نہایت شکر گزار ہوں گا، آپ

---

۱ صدق جدید ۲؍جون ۱۹۶۷ء

۲ صدق جدید ۲؍مارچ ۱۹۶۳ء

۳ صدق جدید ۲؍اگست ۱۹۶۸ء

یقین جانیے ہندوپاک کے علمائے محققین میں آج کل میں صرف ایک تنہا آپ کی ذات کو مانتا ہوں جس سے علمی امور میں رجوع کرنا میں اپنا معنی فرض سمجھتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر صحت وعافیت کے ساتھ قائم رکھے۔“[1]

مولانا اکبر آبادی اپنی کتاب 'صدیق اکبرؓ' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”مولانا نے ازراہ شفقت بزرگانہ اس درخواست کو بڑی خوشی سے قبول فرمایا اور کتاب کا ایک ایک لفظ پڑھ کر غلطیوں سے مطلع فرمایا، میں نے نظرثانی میں مولانا کے خط سے مکمل استفادہ کیا ہے اور اس غیر معمولی توجہ اور زحمت فرمائی کے لیے صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔“[2]

'المطالب العالیہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

”الشیخ الاستاد مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ان محققین علماء میں سے ہیں جو اگرچہ اپنے وطن میں 'غریب شہر' ہیں لیکن عرب ممالک میں ان کے علم وفضل اور شہرت وعظمت کا طوطی بولتا ہے۔“[3]

۲۰/۳/۷۹ء کے ایک مکتوب لکھتے ہیں

”آپ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کیا عجیب وغریب کارنامہ انجام دیا ہے، دنیائے علم وتحقیق آپ دونوں حضرات کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے اور احسان مند ہو کم ہے، آپ نے ادھر چند سالوں میں کیا کچھ کر دکھایا!“[4]

۲۴/دسمبر ۷۹ء کے ایک خط میں رقمطراز ہیں

---

[1] المآثر ج ۱۳ش ۲ص ۸۹-۹۰

[2] صدیق اکبرص ۲۷ مولانا سعید احمد اکبر آبادی

[3] برہان اپریل ۱۹۷۳ءص ۲۷۸

[4] المآثر ج ۱۳ش ۳ص ۸۹

''اگرچہ چھوٹا منھ بڑی بات ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ کا علم، بصیرت، دقت نظر اور وسعت نظر کی داد نہیں دی جا سکتی، اس کا افسوس تھا کہ برصغیر ہندو پاک میں قاہرہ کے ساعاتی، احمد محمد شاکر اور کوثری جیسے محقق علماء نظر نہیں آتے، لیکن الحمد للہ آپ نے نہ صرف تلافی کر دی ہے بلکہ ان حضرات سے بھی بعض چیزوں میں سبقت لے گئے ہیں۔''[1]

علامہ اقبال سہیل اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے، آپ کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے، مشق سخن کے لئے آپ کی ذات ایک مرجع کی حیثیت رکھتی تھی۔ مشاعروں وغیرہ میں مسند صدارت کو زینت بخشتے، ڈاکٹر منور انجم کے لفظوں میں ''آخر مشاہیر ادب نے سہیل کی ادبی صلاحیت اور شاعرانہ عظمت کو تسلیم کیا ہے۔''[2]

۱۹۳۶ء میں اعظم گڑھ میں ایک جلسہ منعقد ہوا، اس جلسہ میں ہندوستان کی مشہور علمی شخصیتیں مدعو تھیں۔ مولانا اعظمی اس جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ اقبال سہیل نے اس موقع پر فارسی میں ایک استقبالیہ نظم کہی تھی۔ سہیل نے مولانا اعظمی کی شان میں جو شعر کہا تھا وہ یہ ہے۔

در ایں بزم آں حبیب ما، ادیب ما، خطیب ما
کہ ذاتش در سمو جناف راحسن حسین آمد[3]

مولانا عامر عثمانی مولانا اعظمی کی کتاب 'رکعات تراویح' پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عامر عثمانی علم میں ان کی وسعت و جامعیت کا بلند آہنگ میں اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''مولانا اعظمی کے رشحات قلم میں فراست کا جو نور، جو گیرائی، جو تبحر

---

[1] حیات ص ۵۵۷، المآثر ج ۱۳ ش ۳ ص ۸۸

[2] اقبال سہیل حیات اور شاعری ص ۲۹۰ — [3] ایضاً ص ۳۱۲

اور جو کامل دسترس پائی جاتی ہے اس سے خاتم المحدثین علامہ نور شاہ صاحب کشمیری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، وہی روشن دراست، وہی استحضار، وہی نگاہ کی جامعیت، وہی تبحر اور وہی شان نقد۔"[1]

عامر عثمانی مزید تحریر فرماتے ہیں:

"کاش مولانا اعظمی قریب ہوتے تو ہم ان سے بہت کچھ سیکھتے، آس پاس اونچی دوکان والے تو بہت ہیں، مگر علم و تفقہ کی سچی دکانیں اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں، جنکا پکوان پھیکا نہ ہو۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ اب زمانہ ہم جیسے نام کے علامہ تو ضرور پیدا کرے گا، شمس العصا، حکیم الاسلام، ارسطوئے دوراں اور مٹی کے بقراط بھی ضرور جنم لیتے ہی رہیں گے، لیکن نور شاہ، شبیر احمد عثمانی، حبیب الرحمن الاعظمی جیسے لوگوں کی مسند نہ جانے کب تک خالی رہے گی۔"[2]

مولانا عتیق الرحمن عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی، کلکتہ سے مولانا اعظمی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"آپ سے ملاقات کے لئے اب سے نہیں کئی سال سے دل چاہتا ہے، آپ کی علمی خدمات ہم سب کے لئے باعث افتخار اور مایہ عزت ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔"[3]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مولانا علی میاں ندوی مولانا اعظمی کے غایت درجہ مداح اور قدر داں تھے، مولانا ندوی مولانا اعظمی کے علم کی گہرائی و گیرائی سے پوری

---

[1] تجلی اکتوبر ۱۹۷۳ء ص ۵۵

[2] ایضاً ص ۵۷

[3] حیات ص ۵۵۸

طرح واقف و باخبر تھے، یہی وجہ تھی کہ مولانا علی میاں صاحب کا ایماء پر
مولانا اعظمی ندوہ میں شیخ الحدیث کے جلیل القدر منصب و منصب پیش کیا، شیخ الحدیث
حلیم عطا صاحب کے انتقال کے بعد مولانا اعظمی نے اس ذمہ داری و منصب کو بھی
اس ذمہ داری کو اپنے معمول سے بھی رہنے دے، اور جب تک ممکن ہوا، لیکن کی مدت تعینات
جب ختم ہوگئی تو وطن واپس چلے گئے۔

مولانا اعظمی کے نام مولانا علی میاں ندوی کے لکھے ہوئے خطوط محفوظ ہیں، جو مجلہ "المآثر" کے صفحات کی زینت بھی بن چکے ہیں۔ ان خطوط کی روشنی میں بلاشبہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ علامہ ندوی خود بھی مولانا سے علمی استفادہ کرنا چاہتے تھے، بہت سے خطوط میں اس طرح کے مضامین ملتے ہیں، طوالت کے اندیشہ سے ہم ان خطوط کو نقل کرنے سے قاصر ہیں، البتہ اس موقع پر قارئین کی لئے ۱۲ رجب ۱۳۸۱ھ کے ایک مکتوب کا چھوٹا سا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے

"میں الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا کہ آپ کے دارالعلوم میں تشریف رکھنے سے مجھے کتنی مسرت اور تقویت تھی، اس وقت کے علماء میں میں نہیں سمجھتا کہ مجھے کسی سے اتنی مناسبت اور عقیدت ہے جتنی آپ سے، خصوصیت کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد مجھے اس جامعیت اور ذوق و ثقافت کا کوئی دوسرا عالم نظر نہیں آتا، یوں یک فنی عالم اور اپنے اپنے فن کے متبحر اور بھی ہوں گے، مگر میرے ذوق کی تشنگی اور جگہ نہیں بجھتی۔"[1]

مولانا اعظمی کے انتقال کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی امت کا عظیم علمی خسارہ مانتے ہوئے اپنے تعزیتی نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں

۱؎ المآثر اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء ص ۸۰-۸۱

"حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی وفات سے علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث کے سلسلہ میں جو عظیم علمی خسارہ ہوا ہے اور جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا احساس بہت سے لوگوں سے زیادہ اس عاجز کو ہے، جس کی برصغیر ہندوپاک ہی نہیں بلکہ ممالک عربیہ اور مرکز اسلام پر بھی نظر ہے، اور وہاں کے علماء، اساتذہ، مصنفین و محققین سے بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقفیت ہے، علم حدیث خاص طور پر عالمی علمی پیمانہ پر جس انحطاط و تنزل کا شکار ہے، اور اس فن شریف کی واقفیت میں جو سطحیت اور رسمیت پیدا ہوگئی ہے، اور خاص طور پر حدیث و روایات صحیحہ، اور فقہ حنفی کے درمیان تطبیق اور اس علمی حقیقت کے ثابت کرنے میں کہ مذہب حنفی حدیث کے خلاف نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور انکے تلامذہ اور خلف نے کبھی محض قیاس و ذہانت پر اعتماد نہیں کرتے تھے، ان کا ماخذ استنباط احکام میں آیات و احادیث ہی ہوتی تھیں، اس موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت مولانا کے ارتحال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اور بھی قابل افسوس و تشویشناک ہے، نہ صرف علمی حلقہ میں ایک عظیم خلا پیدا ہوا ہے، بلکہ ملت کی صف قیادت میں بھی ایک بڑی جگہ خالی ہوگئی ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر اسباب بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔"[۱]

مولانا محمد منظور نعمانی مولانا اعظمی کے شاگرد تھے، جسکا تذکرہ خود مولانا نعمانی نے کئی جگہوں پر کیا ہے، ۱۹/رجب ۱۳۵۸ھ کو بریلی سے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "گزشتہ ہفتہ میں دہلی گیا تھا، وہاں مولوی عتیق الرحمن صاحب ناظم ندوۃ

---

[۱] محدث اعظمی نمبر ص ۲۰، تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ مارچ ۱۹۹۲، اپریل ۱۹۹۲ء ص ۷، کاروان زندگی حصہ پنجم ص ۶۲-۶۱

المصنفین' اور مولوی سعید احمد اکبر آبادی ایم-اے وغیرہ سے کچھ مختصر سا ذکر آگیا، اس سلسلہ میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر مولانا وقت نکال کر ترمذی پر ایک مبسوط حاشیہ (بطرز شرح مسلم نووی) تیار فرمائیں جس میں وہ قرض بھی ادا ہوجائے جو 'تحفۃ الاحوذی' کی اشاعت کے بعد حنفیوں پر عائد ہوگیا ہے تو 'ندوۃ المصنفین' تحشیہ کا معاوضہ ادا کرکے اس کو خاص اہتمام سے چھپوا سکتا ہے، اور اس بارہ میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم مولانا کی مرضی دریافت کرکے لکھنا، میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر اس کے لئے وقت نکل سکے تو علم اور دین کی بڑی خدمت ہوگی، اور وقت کی ایک بڑی ضرورت انشاء اللہ پوری ہوجائے گی، جس کو پورا کرنے والے شاید آئندہ پیدا بھی نہ ہوں؟"[۱]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی ثم فرنساوی | ڈاکٹر محمد حمید اللہ[۲] اور مولانا اعظمی

۱ حیات ص ۵۶۰

۲ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے، انہیں اردو، عربی، فارسی، ترکی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ زبانوں پر قدرت حاصل تھی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے ایم-اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں، جرمنی میں بون یونیورسٹی سے بین الاقوامی قانون پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، جو Mus im Conduct Of State کے نام سے شائع ہوا، فرانس کی سوربون یونیورسٹی میں عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈی-لٹ کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹر حمید اللہ نے اس بات کی تردید کی کہ امریکی آئین دنیا کا پہلا آئین ہے، اس کے برعکس انہوں نے 'میثاق مدینہ' کو دنیا کا پہلا تحریری آئین قرار دیا۔ انہیں فیصل ایوارڈ پانے کا بھی اعزاز حاصل تھا، ان کی زندگی کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ پوری زندگی میں صرف ایک بار کلاس میں تاخیر سے پہنچے، اس دن ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، والدہ کی تدفین کے بعد پھر وہ کلاس میں چلے گئے۔ (تلخیص ص ۱۲۷-۱۲۹ مجلہ اقبالیات جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء، اقبال اکیڈمی پاکستان۔)

مخطوطات کے ایسے دو غواص گزرے ہیں، جن کا امت اسلامیہ پر عظیم احسان ہے،
جنہوں نے اپنی تحقیقات سے اسلامیات میں دراندازی کرنے والے مستشرقین اور
مغرب کے محققین کے قدم اکھاڑ دیئے۔ ان دونوں باکمال بزرگوں نے امت سے وہ
قرضے اتار دیئے جو برسہا برس سے کئی گردنوں پر لدے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے آج
سے رہتی دنیا تک کے محققین کی گردنیں ان دو محققین کے سامنے جھکی رہیں گی۔

مولانا اعظمی اور ڈاکٹر حمید اللہ کے آپس میں نیازمندانہ تعلقات تھے، یہ
دونوں حضرات ایک دوسرے کے علم کے معترف اور مداح تھے۔ آپس میں ہمیشہ تحقیقی
مباحث میں ایک دوسرے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش کرتے، اگر کسی کو کوئی نادر
مخطوطہ ملتا تو دوسرے کو مطلع کرتا یا کسی ایک کو کسی مخطوطہ کی تلاش ہوتی تو دوسرے سے
رابطہ کرتا۔ خوش قسمتی سے مولانا اعظمی کے نام ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے کچھ خطوط محفوظ
رہ گئے ہیں، جن سے ہر دو حضرات کے خوشگوار تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

پیرس سے ۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ کے ایک خط میں ڈاکٹر صاحب تحریر
فرماتے ہیں

"نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا، آپ میرے بزرگ ہیں، اس لئے التجا ہے
کہ وہ اسلوب تحریر اختیار نہ فرمائیں جو مجھے شرمندہ اور محجوب کرے
مصنف عبدالرزاق اور مسند حمیدی کے متعلق اطلاع سے مسرت ہوئی،
الحمد للہ علمی کام کرنے والے ابھی وہاں موجود ہیں، بارک اللہ فی
مساعیکم آں محترم کو آخری عریضہ لکھنے کے بعد معارف کا وہ پرچہ ملا،
جس میں کتاب الذخائر والتحف کے متعلق آں محترم کا مضمون ہے، اس
سے میں نے بہت استفادہ کیا، سائل اور مستفہم کی حیثیت سے دو چیزیں
عرض ہیں

۱- ص ۱۴۱ کی سطر میں ہے 'قاضی صاحب کی یہ جرأت باطل تھی' سنہ ۱
۴۴۴ھ میں ارسال شدہ ہدیہ کو کوئی شخص ایک سو سال بعد ... ر
"ثنا حدت حمیدا ...س" کہہ سکتا ہے؟!

ب- ص ۱۴۵ کیا قلیتہ کا کامل نسب حضرت زبیر تک کہیں ملتا ہے؟ (۱)

جب مولانا اعظمی مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے سلسلے میں بیروت میں قیام پذیر تھے، تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے پیرس سے ۸ رمضان مبارک ۱۳۹۰ھ کو مولانا اعظمی کے نام ایک خط لکھا، ڈاکٹر صاحب نے اس مکتوب میں جس طرح مولانا اعظمی کی علمی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کی ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے، فرماتے ہیں

"مولوی ابراہیم میاں کے خط سے معلوم ہوا کہ آں محترم مصنف عبدالرزاق کی طباعت کے لئے بیروت تشریف لا چکے ہیں۔ 'شاہ ولی اللہ ثانی' کی یہ خدمت حدیث عنداللہ ماجور، عندالناس مشکور ہوگی۔ اللہ تعالیٰ بہت دنوں آپ کا سایہ ہم سب پر سلامت رکھے اور آپ کو صحت وعافیت سے خدمت علم میں مشغول۔"(۲)

۲۲ رمضان ۱۳۹۰ھ کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں

"عنایت نامہ باعث سرفرازی ہوا، ان مشکلات کے باوجود آں محترم خدمت حدیث شریف کئے جا رہے ہیں، اسی تناسب سے اجر بھی بڑھتا جا رہا ہے، کاش میں ملازمت کے پھندے میں نہ ہوتا، میں خوشی سے بیروت آ جاتا اور ممکنہ خدمت کی سعادت حاصل کرتا، بہرحال مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔"(۳)

۱- المآثر ج ۱۲ ش ۲ ص ۸۳-۸۴
۲- ایضاً ص ۸۶
۳- ایضاً

قاضی اطہر مبارکپوری فرماتے ہیں "نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فوعاها ثم بلغها الخ یعنی اللہ تعالی سے شخص کو تروتازہ اور سرسبز وشاداب رکھے جو میری بات سن کر دوسرے کو پہونچا دے، اس نبوی دعا کا ظہور مولانا مرحوم کی زندگی میں یوں ہوا کہ مادی اور جسمانی عوارض کے باوجود علم حدیث کی خدمت سے بے پناہ قوت وہمت عطا ہوئی اور اس حال میں پورے نشاط وانبساط کے ساتھ مولانا نے وہ دینی وعلمی کارنامے انجام دیے جو جوانی اور صحت کے زمانہ میں لے جاتے ہیں، یہ بات بھی مولانا کی زندگی کے امتیازات میں ہے کہ بڑھاپے میں انہوں نے جوانی سے زیادہ کام کیا ہے۔"[۱]

قاضی اطہر مبارکپوری ایک جگہ مزید تحریر فرماتے ہیں

"واقعہ یہ ہے کہ مولانا ہندوستان میں علم حدیث کے آخری سالار قافلہ تھے۔"[۲]

عالی جناب سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں ۱۵/اپریل ۱۹۸۷ء کو کل ہند سیمینار کا خطبۂ افتتاحیہ دیتے ہوئے کہا کہ فن حدیث میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ ولی اللہ دہلوی نواب صدیق حسن خاں، حضرت عبداللہ شاہ نقشبندی اور ہمارے زمانے میں مولانا حبیب الرحمن اعظمی کی خدمات کسی طرح علمائے عرب سے کم نہیں ہیں۔[۳]

پروفیسر عبدالرحمن مومن، بمبئی یونیورسٹی تحریر فرماتے ہیں "حضرت والا کے علم وفضل اور معرفت وبصیرت کے سرچشمہ سے بہت کچھ حاصل کیا، ان کی سادگی،

---

[۱] محدث اعظمی نمبر ص ۳۷ - ۳۸

[۲] ایضاً ص ۳۷

[۳] معارف جون ۱۹۸۷ء، ص ۴۳۳

(محدث الہند فضیلت مآب شیخ حبیب الرحمن اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اخلاق وآداب، علوم وفنون کے انواع واقسام، دین وسیاست، علم وعمل، وعظ وارشاد وغیرہ میں جامعیت وہمہ گیری کی ایک نادر اور انوکھی مثال تھے۔ انہیں علوم حدیث، فقہ حدیث، متن کی تصحیح ودرستگی، اسناد اور اسماء رجال کے علم اور حدیث کے مخطوطوں کی تحقیق وتعلیق اور تصحیح میں سبقت وفوقیت حاصل تھی۔)

شمس الرحمن فاروقی اردو زبان کے رمز آشنا، ماہر فن اور نقاد ادب ہیں، شیخ احمد شاکر کی شرح مسند پر مولانا اعظمی کے استدراکات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

''حضرت شیخ احمد محمد شاکر کی مرتب ومدون کردہ مسند احمد کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ محدث کبیر علامہ حبیب الرحمن اعظمی نے اس پر کثرت سے استدراکات وتعلیقات لکھے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ علامہ احمد محمد شاکر نے محدث کبیر حضرت اعظمی کے بیشتر اقوال کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ من وعن اپنی کتاب کی آخری جلد میں درج کیا اور حضرت محدث کبیر کی دقت نظر، شغف علمی، تبحر وتفحص اور حافظے کی دل کھول کر داد دی اور متشکر ہوئے، بیشک اہل علم کا وہی رویہ ہوتا ہے اور ہونا چاہئے جو شیخ احمد محمد شاکر اور حضرت محدث کبیر کا تھا۔''[1]

☆ ☆ ☆

[1] مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار ص ۲۲-۲۳ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

کتابیات

کتابیات

(الف)			
۱-	احیاء علوم الدین	امام غزالی	دار التقوی للتراث، قاہرہ ۲۰۰۰ء طبع اول
۲-	الاعلام	خیر الدین زرکلی	دار العلم للملایین، بیروت ایڈیشن ۱۹۷۹ء، اشاعت ۱۹۹۰ء
۳-	اختصار الترغیب والترہیب	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۹۶۰ء
۴-	ارشاد الساری	شہاب الدین قسطلانی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۶ء طبع اول
۵-	الالبانی شذوذہ واخطاؤہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دار العروبہ، کویت ۱۹۸۳ء
۶-	الامام الربانی الزاہد عبد اللہ بن المبارک	ڈاکٹر عبد الحلیم محمود	دار التراث العربی، قاہرہ
۷-	ابجد العلوم	نواب صدیق حسن خاں	مطبع صدیقی، بھوپال ۱۲۹۶ھ
۸-	الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان	علی بن بلبان الفارسی، تحقیق شعیب الارنؤوط	مؤسسۃ الرسالہ ۱۹۹۷ء طبع سوم
۹-	اصول التخریج ودراسۃ الاسانید	ڈاکٹر محمود طحان	دار القرآن الکریم، بیروت ۱۹۸ء طبع سوم
۱۰-	اتحاف النبلاء	نواب صدیق حسن خاں	مطبع نظامی، کانپور
۱۱-	ابو الفضل	ابو الفضل علامی	نول کشور پریس
۱۲-	اخبار الاخیار	شیخ عبد الحق دہلوی	مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۰۹ھ

ناشر	مصنف	کتاب	نمبر
		(ب)	
دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول	ابن کثیر	البدایہ والنہایہ	۲۷-
مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظہ مصر قاہرہ ۱۳۴۸ھ طبع اول	قاضی محمد بن علی شوکانی	البدر الطالع	۲۸-
	شاہ عبد العزیز	بستان المحدثین	۲۹-
مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۲۰۰۲ء طبع اول	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی، مرتبہ مسعود احمد الاعظمی	بیمہ اور اس کا شرعی حکم	۳۰-
		(پ)	
مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۲۰۰۳ء طبع اول	ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی	پیکر مہر ووفا	۳۱-
		(ت)	
دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۴ء طبع اول	ابن حجر عسقلانی تحقیق مصطفی عبد القادر عطا	تہذیب التہذیب	۳۲-
مجلس دائرۃ المعارف نظامیہ حیدرآباد طبع اول	ابن حجر عسقلانی	تہذیب التہذیب	۳۳-
دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول	خطیب بغدادی	تاریخ بغداد	۳۴-
دار الکتاب العربی، بیروت ۱۹۹۹ء	جلال الدین سیوطی	تدریب الراوی	۳۵-
معہد الانور دیوبند طبع چہارم	مولانا یوسف بنوری	تحفۃ العنبر فی حیاۃ امام العصر الشیخ انور	۳۶-
المکتبۃ العربیہ، بغداد ۱۹۳۴ء	محی الدین عبد القادر عیدروسی	تاریخ النور السافر	۳۷-

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۳۸-	التاریخ الکبیر	امام بخاری	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۵۹ء طبع اول
۳۹-	تہذیب تاریخ دمشق الکبیر	ابن عساکر، تہذیب و ترتیب شیخ عبد القادر بدران	دار المسیرۃ بیروت ۱۹۷۹ء طبع دوم
۴۰-	تلخیص خواتم جامع الاصول	محدث محمد طاہر پٹنی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن اعظمی	علمی پریس، مالیگاؤں
۴۱-	تذکرۃ الحفاظ	شمس الدین ذہبی	مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ۱۳۳۳ھ طبع دوم
۴۲-	تاریخ الادب العربی	احمد حسن زیات	چوبیسواں ایڈیشن
۴۳-	تحفۃ الاسلام	میر رمضان یوسف	
۴۴-	تکمیل الاذہان	شاہ رفیع الدین	اشرف پریس لاہور ۱۳۸۳ھ
۴۵-	تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	ترقی اردو بورڈ نئی دہلی ۱۹ء طبع اول
۴۶-	تاریخ دیوبند	سید محبوب رضوی	علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء طبع دوم
۴۷	تذکرہ مولانا عبد اللطیف نعمانی	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	مفتاح العلوم مئو ۱۹۷۳ء
۴۸-	تذکرہ علماء اعظم گڈھ	مولانا حبیب الرحمن قاسمی	جامعہ اسلامیہ بنارس ۱۹۷۶ء
۴۹-	تاریخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل	مولانا فضل الرحمن اعظمی	دفتر اہتمام جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات ایڈیشن ۱۹۹۴ء
۵۰-	تذکرۂ کاہے	مولانا نظام الدین قاسمی	
۵۱-	تاریخ دار العلوم دیوبند	سید محبوب رضوی	دار العلوم دیوبند ۱۹۷۹ء طبع اول
۵۲-	تذکرہ مصلح الامت	مولانا محمد قمر الزماں	دائرۃ المعارف الٰہ آباد ۱۹۸۴ء بار اول
۵۳-	تاریخ ندوۃ العلماء	مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی	دفتر نظامت ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۱۹۸۳ء بار اول

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
٥٤-	التنقید المسدید علی التفسیر الجدید	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	انجم ۱۳۳۹ھ
٥٥-	تعارف مخطوطات کتب خانہ دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد ظفیر الدین	ویم فائن آرٹ پرنٹنگ پریس دیوبند ۱۹۷۰ء بار اول
٥٦-	تحقیقی مقالات	ظفر احمد صدیقی	خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۲۰۰۳ء طبع اول
٥٧-	تعدیل رجال بخاری	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۲۰۰۲ء طبع اول
٥٨-	تنبیہ الکاذبین	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	انجم ۱۳۵۲ھ
٥٩-	تحقیق اہل حدیث	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۱۹۹۹ء طبع دوم
٦٠-	تاریخ دعوت وعزیمت	مولانا ابوالحسن علی ندوی	مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۵۷ء
	(ج)		
٦١-	الجرح والتعدیل	امام رازی	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۵۳ء طبع اول
٦٢-	جامع الاصول	ابن اثیر جزری	ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد المملکۃ العربیۃ السعودیۃ ۱۹۵۰ء طبع اول
	(ح)		
٦٣-	الحاوی فی سیرۃ الامام ابی جعفر الطحاویؒ	شیخ محمد زاہد الکوثری	مطبعۃ الانوار قاہرہ ۱۳۶۸ھ
٦٤-	الحاوی لرجال الطحاوی	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مخطوطہ
٦٥-	حجۃ اللہ البالغہ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	داراحیاء العلوم، بیروت ۱۹۹۲ء طبع دوم

۷۸-	دستکار اہل شرف	مولانا حبیب رحمن اعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۲۰۰۱ء طبع دوم
۷۹-	دفع اباطیل	شاہ رفیع الدین دہلوی	نفیس پرنٹرز، لاہور ۱۹۷۶ء
		(ر)	
۸۰-	رسالۃ اوائل	شیخ محمد سعید بن سنبل مکی، تصحیح وتنقیح مولانا حبیب الرحمن اعظمی	مکتبہ اعظمی مئو اعظم گڈھ
۸۱-	رسالۃ المستطرفۃ	محمد بن جعفر الکتانی	بیروت ۱۳۳۲ھ طبع اول
۸۲-	الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل	مولانا عبدالحی لکھنوی، تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ	دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت ۱۹۸۷ء طبع سوم
۸۳-	رکعات تراویح	مولانا حبیب الرحمن اعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۱۹۸۹ء طبع سوم
۸۴-	رکعات تراویح ذیل	مولانا حبیب رحمن اعظمی	مدرسہ مفتاح العلوم، مئو ۱۹۶۰ء طبع ثانی
۸۵-	رہبر حجاج	مولانا حبیب الرحمن اعظمی	مکتبہ اعظمی، مئو ۱۹۹۹ء طبع پنجم
۸۶-	رحمۃ القلب والحسن با حادیث ترک رفع الیدین	مولانا احمد اللہ قاسمی	
		(ز)	
۸۷-	زندگی کا علمی سفر	مفتی ظفیر الدین مفتاحی	کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند
		(س)	
۸۸-	سیر اعلام النبلاء	شمس الدین ذہبی	مؤسسۃ الرسالہ، بیروت ۱۹۹۸ء گیارہواں ایڈیشن
۸۹-	سنن ابن ماجہ	ابن ماجہ	ڈسرد عالم ایند کمپنی، دیوبند
۹۰-	سنن ابی داؤد	ابوداؤد سجستانی	مطبع مجتبائی، دہلی

نمبر	کتاب	مصنف	مطبع
۹۱-	سیرۃ النبی	علامہ شبلی نعمانی وعلامہ سید سلیمان ندوی	مکتبہ مدنیہ، اردو بازار، لاہور ۱۴۰۸ھ
۹۲-	سوانح قاسمی	مولانا مناظر احسن گیلانی	مختار پرنٹنگ پریس، دیوبند
	(ش)		
۹۳-	شذرات الذہب	ابن عماد حنبلی	دار احیاء التراث العربی، بیروت جدید ایڈیشن
۹۴-	شارح حقیقی	مولانا حبیب الرحمن اعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ مئو ۲۰۰۱ء طبع دوم
	(ص)		
۹۵	صحیح الترغیب والترہیب	شیخ البانی	مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، ریاض ۲۰۰۰ء طبع اول
۹۶-	صفۃ الصفوۃ	ابن جوزی	دار المعرفۃ، بیروت ۱۹۷۹ء طبع دوم
۹۷-	صدیق اکبر	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۱ء طبع دوم
	(ض)		
۹۸-	الضوء اللامع	شمس الدین سخاوی	مکتبۃ القدسی، قاہرہ ۱۳۵۴ھ
	(ط)		
۹۹-	طبقات الحفاظ	جلال الدین سیوطی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۴ء طبع دوم
۱۰۰-	طبقات الشافعیۃ الکبریٰ	ابن سبکی	دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۹ء طبع اول

(ع)

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۰۱-	عقیدۃ الاسلام مع حاشیہ تحیۃ الاسلام	علامہ انور شاہ کشمیری	مجلس علمی ڈابھیل ہندوستان ۱۳۵۳ھ طبع اول
۱۰۲-	العبر فی خبر من غبر	حافظ ذہبی، تحقیق فؤاد سید	التراث العربی، کویت ۱۹۶۰ء
۱۰۳-	عمدۃ القاری	بدر الدین عینی	دار الفکر بیروت ۲۰۰۲ء
۱۰۴-	علم رجال الحدیث	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	مکتبۃ الفردوس، لکھنؤ ۱۹۸۹ء
۱۰۵-	عجالۂ نافعہ	شاہ عبد العزیز	مطبع مجتبائی، دہلی
۱۰۶-	علماء ہند کا شاندار ماضی	مولانا سید محمد میاں	ایم برادرس کتابستان دہلی ۱۹۸۵ء
۱۰۷-	علماء حق اور انکے مجاہدانہ کارنامے	مولانا سید محمد میاں	الجمعیۃ بکڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی
۱۰۸-	علم المعیشت	پروفیسر ایس برنی	مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۷ء بار سوم
۱۰۹-	عظمت صحابہ	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ
۱۱۰-	عثمان ذوالنورین	مولانا سعید احمد اکبرآبادی	ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۸۳ء طبع اول

(ف)

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۱۱	فتح الباری	ابن حجر عسقلانی	ادارات البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ
۱۱۲-	فتح المغیث	شمس الدین سخاوی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مکتبۃ الاعظمی مئو اعظم گڑھ
۱۱۳-	الفہرست	ابن ندیم، تحقیق ڈاکٹر یوسف علی طویل	دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۶ء طبع اول

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۱۴-	فتاوی عالمگیری	شیخ نظام الدین	مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ، پاکستان ۱۹۸۲ء طبع دوم
۱۱۵-	فقہ اہل العراق وحدیثہم	شیخ محمد زاہد الکوثری	تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، بیروت ۱۹۷۰ء طبع اول
۱۱۶-	الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ	ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی، تصحیح وتعلیق سید محمد بدرالدین ابوفراس النعسانی	مطبعۃ السعادۃ بجوار محافظۃ مصر ۱۳۲۴ھ طبع اول
۱۱۷-	فہرست تالیفات	مولانا محمد زکریا کاندھلوی، سید محمد شاہد سہارنپوری	مکتبہ یادگار شیخ محلہ مفتی سہارنپور ۱۹۹۷ء بار اول
	(ق)		
۱۱۸-	قواعد فی علوم الحدیث	مولانا ظفر احمد تھانوی، تحقیق شیخ ابوغدہ	مکتب المطبوعات الاسلامیۃ حلب ۱۹۸۴ء طبع پنجم
	(ک)		
۱۱۹-	کتاب الثقات	ابن شاہین، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مخطوطہ
۱۲۰-	الکامل	ابن عدی جرجانی	دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
۱۲۱-	کتاب الانساب	سمعانی	داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۹ء طبع اول
۱۲۲-	کتاب الزہد والرقائق	عبداللہ بن المبارک، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس احیاء المعارف، مالیگاؤں ۱۹۶۶ء
۱۲۳-	کتاب السنن	سعید بن منصور، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۶۷ء

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
١٢٤	كشف الاستار عن زوائد البزار	نور الدین ہیثمی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مؤسسة الرسالہ دمشق ١٩٧٩ء
١٢٥-	کتب خانہ	رضا علی عابدی	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ١٩٩٣ء بار اول
١٢٦-	کاروان زندگی	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	مکتبہ اسلام محمد علی لین گوئن روڈ لکھنؤ ١٩٩٣ء بار اول
	(ل)		
١٢٧-	لامع الدراری	مولانا محمد زکریا کاندھلوی	الجمعیة پریس، دہلی ١٣٧٩ھ
١٢٨	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی	مجلس دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد ١٣٣٠ھ طبع اول
١٢٩-	لسان المیزان	ابن حجر عسقلانی، تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ	دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت
١٣٠	اللباب فی تہذیب الانساب	ابن اثیر	مکتبۃ القدسی، قاہرہ ١٣٥٦ھ
	(م)		
١٣١-	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد	ہیثمی	دارالکتب العلمیہ، بیروت ٢٠٠١ طبع اول
١٣٢-	مسند حمیدی	ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن اعظمی	مجلس علمی ڈابھیل ١٩٨٨ء طبع دوم
١٣٣-	مسند امام احمد بن حنبل	احمد بن حنبل، شرح احمد محمد شاکر	دارالمعارف، مصر ١٩٥٥ء طبع چہارم
١٣٤-	مسند امام احمد بن حنبل	احمد بن حنبل، تحقیق شعیب ارنؤوط، عادل مرشد	مؤسسة الرسالة ١٩٩٩ طبع دوم

۱۳۵-	مجمع بحار الانوار	محدث محمد طاہر پٹنی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد
۱۳۶-	مسند ابوداؤد طیالسی	ابوداؤد طیالسی، تحقیق ڈاکٹر محمد بن عبدالمحسن ترکی	مرکز البحوث والدراسات العربیۃ والاسلامیۃ دار ہجر ۱۹۹۹ء طبع اول
۱۳۷-	مصنف عبدالرزاق	عبدالرزاق بن ہمام، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۷۲ء
۱۳۸-	مصنف ابن ابی شیبہ	ابوبکر بن ابی شیبہ، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	المکتبۃ الامدادیہ، مکہ مکرمہ ۱۹۸۳ء
۱۳۹-	منیۃ الالمعی	علامہ قاسم بن قطلوبغا، تحقیق محمد زاہد الکوثری	مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۵۰ء
۱۴۰-	مقدمہ ابن الصلاح	ابن صلاح	مؤسسۃ الکتب الثقافیہ، بیروت
۱۴۱-	المطالب العالیہ	حافظ ابن حجر عسقلانی، تحقیق مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	وزارۃ الاوقاف، کویت ۱۹۷۳ء
۱۴۲-	ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	مولانا ابوالحسن علی ندوی	المجمع الاسلامی العلمی لکھنؤ ۱۹۹۴ء طبع اول
۱۴۳-	المسلمون فی الہند	مولانا ابوالحسن علی ندوی	المجمع الاسلامی العلمی ندوہ لکھنؤ ۱۹۹۸ء طبع چہارم
۱۴۴-	مآثر الکرام	مولانا آزاد بلگرامی	مطبع مفید عام، آگرہ ۱۹۱۰ء
۱۴۵-	مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے	مولانا اسیر ادروی	شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند ۱۹۹۵ء طبع اول
۱۴۶-	موج کوثر	شیخ محمد اکرم	تاج کمپنی، دہلی ۱۹۹۱ء

۱۴۷-	مولانا محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۷ء طبع اول
۱۴۸-	مسلک علماء دیو بند	مولانا محمد طیب	دارالکتاب دیو بند ۱۹۸۹ء
۱۴۹-	مآثر و معارف	قاضی اطہر مبارکپوری	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۱ء
۱۵۰-	مشائخ احمد آباد	مولانا محمد یوسف ابن سلیمان متالا	مکتبہ محمودیہ، میرٹھ ۱۹۹۳ء
۱۵۱-	معلم الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعود اور انکی فقہ	ڈاکٹر حنیف رضی	ندوۃ المصنفین، دہلی
۱۵۲-	مقالات ابوالمآثر جلد اول	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مرتبہ: ڈاکٹر مسعود احمد	مرکز تحقیقات وخدمات علمیہ سنہ ۲۰۰۱ء طبع اول
۱۵۳-	مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے	مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی	قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز دہلی ۱۹۹۷ء
۱۵۴-	ماہر القادری کے تبصرے	مولانا ماہر القادری، مرتبہ: طالب ہاشمی	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۰۰۳ء
۱۵۵-	مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار	ظفر احمد صدیقی	بھارت آفسیٹ پریس، لال کنواں دہلی ۲۰۰۱ء بار اول

(ن)

۱۵۶-	نصب الرایہ	جمال الدین زیلعی	مجلس علمی ڈابھیل ۱۳۹۳ھ طبع دوم
۱۵۷-	النکت الطریفہ	شیخ محمد زاہد الکوثری	ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی پاکستان ۱۹۹۵ء
۱۵۸-	نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر	مولانا عبدالحی الحسنی	دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد ۱۹۷۰ء طبع اول
۱۵۹-	نقش حیات	مولانا سید حسین احمد مدنی	الجمعیۃ پریس، دہلی

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر
۱۶۰-	نصرة الحدیث	مولانا حبیب الرحمن الاعظمی	دار المآثر الاسلامیہ، مئو ۱۹۹۳ء طبع سوم
۱۶۱-	نہایات الارب فی غایات النسب	مولانا محمد شفیع	دارالاشاعت، دیوبند ۱۳۵۱ھ
	(و)		
۱۶۲-	وفیات الاعیان	ابن خلکان	داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۹۷ء طبع اول
	(ہ)		
۱۶۳-	ہماری آزادی	ابوالکلام آزاد، مترجم: محمد مجیب	اورینٹ لونگ مینس پرائیوٹ لمیٹیڈ ۱۹۶۱ء
۱۶۴-	ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں	ڈاکٹر عابد حسین	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۶۵ء
۱۶۵-	ہندو پاک میں اسلامی کلچر	پروفیسر عزیز احمد، مترجم: ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۹۱ء
	(ی)		
۱۶۶-	الیانع الجنی	محسن ترہتی	جید پریس۔ دہلی ۱۳۴۹ھ
۱۶۷-	یاد رفتگاں	ماہر القادری، مرتبہ: طالب الہاشمی	مکتبہ نشان راہ۔ نئی دہلی ۱۹۸۵ء بار اول

انگریزی اور ہندی کتب

1- A History Of India Volume1 Percival Spear, Penguin books, England,1986

2- The History of the Indian National Congress-Volume1 (1885 1935) P16 Dr. Pattabhi Sita Ramayya

3- Nationalsm on the Indian Subcontinent. Jim Masselos. Thomas Nelson (Australia) Ltd. 1972.
4- भारतीय स्वतन्त्रता आन्दोलन का इतिहास, ताराचन्द, अनुवादक: मन्मथ नाथगुप्त, 1982

رسائل ومجلّات

۱-ارشاد (پندرہ روزہ) امرتسر
۲-اقبالیات (سہ ماہی) پاکستان
۳-برہان (ماہنامہ) دہلی
۴-البعث الاسلامی (ماہنامہ) لکھنؤ
۵-البلاغ (ماہنامہ) بمبئی
۶-ترجمان دارالعلوم (ماہنامہ) نئی دہلی
۷-ترجمان الاسلام (سہ ماہی) بنارس
۸-تجلی (ماہنامہ) دیوبند
۹-تعمیر حیات (پندرہ روزہ) لکھنؤ
۱۰-ثقافۃ الہند (ماہنامہ) دہلی
۱۱-الحج (ماہنامہ) مکہ مکرمہ
۱۲-الداعی (ماہنامہ) لکھنؤ
۱۳-الداعی (ماہنامہ) دیوبند
۱۴-دارالعلوم (ماہنامہ) دیوبند

۱۵-الرشاد	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۱۶-ریاض الجنۃ	(ماہنامہ)	جونپور
۱۷-صوت الاسلام	(ماہنامہ)	غازیپور
۱۸-صدق جدید	(پندرہ روزہ)	لکھنؤ
۱۹-ضیاء الاسلام	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۲۰-العدل	(ہفت روزہ)	گوجرانوالہ
۲۱-الفرقان	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۲۲-فکرونظر	(سہ ماہی)	علی گڑھ
۲۳-الفقیہ	(ہفت روزہ)	امرتسر
۲۴-القاسم	(پندرہ روزہ)	امرتسر
۲۵-قاسم العلوم	(ماہنامہ)	دیوبند
۲۶-المآثر	(سہ ماہی)	مئو
۲۷-محدث	(ماہنامہ)	بنارس
۲۸-المسلمون	(ماہنامہ)	جنیوا
۲۹-مجلۃ المجمع العلمی العربی	(سہ ماہی)	دمشق
۳۰-معارف	(ماہنامہ)	اعظم گڈھ
۳۱-نیا دور	(ماہنامہ)	لکھنؤ
۳۲-النجم	(ماہنامہ)	لکھنؤ

☆......☆......☆